ناول

اُجڑے نگر کا چراغ

سبط احمد قمر

سنہ اشاعت : ۲۰۰۶ء

تعداد : چھ سو

قیمت : چار سو روپے

معاونین : ۱۔ (ڈاکٹر) زینت رضوی۔شکاگو۔امریکہ

۲۔ ارشد علی۔ٹیکنکل اسسٹنٹ، پولی ٹیکنیک
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۳۔ صبا رضوی، بی.ایس.سی.
رضوی اپارٹمنٹ (جی۔۲) میڈیکل روڈ، علی گڑھ

کمپوزنگ : مشکوٰۃ کمپیوٹرز، نزد سلیمان ہال، اے.ایم.یو، علی گڑھ

مطبع : کریمی پرنٹنگ پریس، علی گڑھ

یہ کتاب فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی، اتر پردیش کے مالی تعاون سے شائع ہوئی

ناول............

روشن ہے اس طرح دل مضطر میں داغ ایک
اُجڑے نگر میں جیسے جلے ہے چراغ ایک
(میر تقی میرؔ)

اُجڑے نگر کا چراغ

سبط احمد قمر

یہ کہانی

اُس اُجڑے نگر کی ہے جو کبھی ایک ذی علم، مہذّب اور بارونق بستی تھی اودھ کی گنگا جمنی مجلسی تہذیب اور معاشرتی آداب میں رچا بسا یہ قصبہ ثقافت اسلامی کی سنجیدہ ورثہ دار اور اپنے اسلاف سے ملے ہوئے بلند پایہ اخلاق کا ایک وقیع و عظیم مرکز تھا۔ ساداتِ عظام و مشائخ کرام کے بزرگ عالموں سے آباد و بھرا پُرا یہ تاریخی قصبہ اپنے پاک باطن مکینوں کی طرح پاک بنیاد تھا۔ جس کی سرزمین پر نحوست کا گذر نہ تھا اور جہاں پر سایۂ بُوم ظلِّ ہما کی مانند عنقا تھا۔ افلاک کے نیچے ہر طرح کی برائیوں سے پاک اس خطّے کا حال اب جورِ آسماں سے خستہ و خراب ہو چکا ہے۔ اس کا شیرازہ خوابِ پریشاں کی تصویروں کے مانند منتشر ہو گیا ہے۔ جو کبھی "جائے عیش" تھا اور دنیا والے جس کی رفعت و سرفرازی پر رشک کرتے تھے زمانے نے اس کی علمی سربلندی اور شان و شوکت کو حرفِ غلط کی طرح مٹا کر اُسے ایک عبرت ناک پستی میں ڈھکیل دیا ہے۔ قضا و قدر نے اس کی رفیع عمارتوں کو ڈھا کر اس کے بام و در پر تباہی و بربادی کی عملداری مسلّط کر دی ہے اور اب اس اونگھتی ہوئی سنسان نگری میں

چہکتے تھے جہاں پہلے عنادل — وہاں افسوس الّو بولتا ہے

صورتِ حال یہ ہے کہ اس اشرف البلاد میں حصولِ منصب و جاگیر سے قوی پشت ہونے والے جاہ پرستوں کی اولاد آج سونے چاندی کے چمچوں سے کھانے کھیلنے کے بجائے جس قلیل البضاعتی کے ساتھ زندگی کے دن کاٹ رہی ہے اُسے دیکھ کر یہی کہنا پڑتا ہے کہ

اس شہر میں زندگی بشر کی — بیمار کی رات ہو گئی ہے

اب اس کا فیصلہ آپ کو کرنا ہے کہ یہ اجڑا نگر کیا ہے۔ کہاں ہے اور کون ہے اس اجڑے نگر کا چراغ۔ میر فدا حسین، ہادی، کرامت علی، مِٹّی میاں یا پھر یہ بوڑھا قلم کار جس نے اپنی طویل زندگی کے ہر شعبہ پر اثر انداز ہونے والے اور معائب و محاسن سے بھرے ان سب ہی واقعات و حوادث کو اکٹھا کر کے ایک فرضی کہانی ترتیب دی ہے۔

اُجڑا نگر..................

یہ کیسا ہو کا ہے عالم عجیب بستی ہے
ہر ایک سمت یہاں خامشی برستی ہے
یہیں پہ سوتے ہیں کچھ ایسے شاہزادے بھی
کہ جگمگاتے تھے فانوس جن کے محلوں میں
ترس رہے ہیں مگر آج روشنی کے لئے
وہ جن کو نیند نہ آتی تھی نرم بستر پر
وہ سو رہے ہیں یہاں آج فرشِ خاکی پر
جو زندگی میں پہنتے تھے اطلس و کمخواب
اب ان کی قبروں کے ملبوس ہیں خس و خاشاک
کہیں پہ بغض، شر و کینہ و فساد کہیں
کہیں پہ فتنہ، تصادم کہیں، عناد کہیں
شکستہ بام و در و سقف منہدم دیوار
بجھی بجھی سی فضائیں لٹی لٹی سرکار
زوال کیوں ہے اِسے، کیوں نہیں پنپتا ہے
یہ شہر اب بھی تو سب بستیوں سے اونچا ہے
مرے ندیم ہے لازم کہ ان مکینوں پر
اب اور ہم کوئی تنقید و تبصرہ نہ کریں
چلو اس اجڑے نگر سے کوئی سبق سیکھیں

★

محترم جناب طالبؔ محمود (علیگ) کی نظم ''شہرِ خموشاں'' سے اقتباس۔ ترمیم و اضافہ کے لئے موصوف سے معذرت و اجازت کے بعد۔

اُتّر ریلوے کے رائے بریلی سے پریاگ جانے والی ریلوے لائین جسے عام طور پر لوگ ''اونچاہار'' لائین کہتے ہیں اس کے درمیان گنڈا ہر نام گنج اسٹیشن پڑتا ہے جہاں سے صرف سات کلو میٹر کی دوری پر بھدرؔی نام کا ایک چھوٹا سا اسٹیشن آتا ہے جو چھوٹا ہونے کے باوجود اس لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ یہاں پر ہر سال کارتکی پورن ماشی کے موقع پر ایک بہت بڑا میلہ لگتا ہے۔ نومبر ۱۹۸۵ء کی تیرہ تاریخ کو بھدری کا میلہ اپنے شباب پر تھا۔ بانس اور کپڑے سے بنائے گئے چھوٹے چھوٹے خیموں ڈیروں کے اندر سجی ہوئی دوکانیں، مٹھائیوں اور کھانے پینے والی چیزوں کے اسٹال، کارنیوال، جھولے، چوروک، سرکٹے، کٹھ پتلیوں کے ناچ، موت کا کنواں، اور میدانی بائیسکوپ سے دیر رات تک میلے میں بڑی چہل پہل اور رونق تھی۔ اُس رات میں بریلی سے الٰہ آباد جانے والی پسینجر ٹرین اپنے مقررہ وقت سے دو گھنٹہ لیٹ تقریباً ایک بجے رات میں بھدری کے آؤٹر سگنل میں داخل ہوتے ہی میلہ کے بیچوں بیچ پہونچ کر آپ سے آپ رک گئی۔

ٹرین کے ایک ڈبّے سے تین مسافر اُترے۔ ایک مرد، ایک جوان عورت اور ایک برقع پوش معمّر خاتون اور چپ چاپ آہستہ آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے اس مزار کی طرف بڑھے جہاں عقیدت مندوں کی زبردست بھیڑ جمع تھی۔ محفل سماع برپا تھی۔ قوالیاں ہو رہی تھیں۔ دلّی سے آئے ہوئے قوّال شیخ احمد جام کا قصیدہ جھوم جھوم کر پڑھ رہے تھے۔

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را — ہر زماں از غیب جانِ دیگر است

پسینجر ٹرین پانچ منٹ کو میلہ کی بھیڑ بھاڑ میں رکنے کے بعد تیز سیٹی دیتی ہوئی آہستہ آہستہ میلے سے نکل گئی۔ پچھلے پندرہ برسوں سے یہ معمول ہے کہ صرف یہی ایک ٹرین پورن ماشی کے اس میلے میں پہونچ کر آپ سے آپ رک جاتی ہے

پہلی بار یہ ٹرین اب سے پندرہ سال پہلے نومبر ۱۹۷۰ء کی پورن ماشی پر جس وقت بھدرتی اسٹیشن کے آؤٹر سگنل سے آگے بڑھی تو عین میلہ کے بیچوں بیچ پہونچ کر ایک بھیانک ایکسیڈنٹ کے بعد رک گئی تھی۔ اتنی رات ہونے کے بعد کسی نوٹنکی یا چلتے پھرتے سینما کو دیکھنے کے لئے ریلوے لائین کے دونوں طرف اتنا مجمع تھا کہ لوگ آنے والے کسی ناگہانی حادثے سے بے خبر دور تک ریلوے لائین پر بیٹھے تماشہ دیکھ رہے تھے کہ اچانک بغیر ہیڈ لائیٹ والی اندھی ریل گاڑی چوروں کی طرح چپ چاپ ان کے سروں پر آپہونچی اور رات کے اندھیرے میں ایک قیامت آ گئی۔ چاروں طرف ہاہاکار مچ گئی۔ افراتفری اور بھگڈر میں لوگ ایک دوسرے کو روندتے کچلتے چلے گئے۔ جب تک ٹرین رکتی رکتی نہ جانے کتنے ریل سے کٹ کر مر گئے اور کتنے گھائل ہو کر ریل پر تڑپنے لگے۔ ریل سے کٹ کر مرنے والوں میں چوبیس پچیس سال کی ایک جوان اور قبول صورت عورت بھی تھی جو میلے میں گرم گرم پکوڑیاں، سموسے اور آلو کے ٹکّے بنا کر بیچتی تھی۔ وہ اپنی چھ سات سال کی لڑکی کو ایک چھوٹے سے تمبو میں سوتا چھوڑ کر چل بسی تھی۔ یہ عورت کون تھی اس کا کیا نام تھا اور وہ کہاں کی رہنے والی تھی یہ بات میلے میں شاید ہی کسی کو معلوم رہی ہو حتی کہ یہ بات شاہ کرامت علی کو بھی نہیں معلوم تھی جو ایسے میلوں ٹھیلوں میں اپنے پرکھوں کی متروکہ مکّہ مدینہ والی پرانی مگر بے حد متبرّک سیاہ ریشمی عبا اور سبز عمامے کے ساتھ بڑے بڑے کنٹھے، موتیوں اور مُونگے کی مالائیں اور تقریباً ہر انگلی میں عقیق فیروزے اور حدید کی موٹی بھدّی انگوٹھیاں ڈالے ایک ہاتھ میں موٹی کمر خمیدہ پہاڑی جریب اور دسرے ہاتھ میں پیتل کی لوبان دانی لئے ہر طرف ''رحمت'' بکھیرتا اور پیسے بٹورتا تھا۔ کرامت علی ضلع رائے بریلی کے قصبہ جائس کا رہنے والا پینتالیس پچاس کے پیٹے میں ایک اچھے ہاتھ پیر والا خاندانی درویش تھا جو جائس میں تکیہ حضرت شاہ قطب شہید کی مجاوری اور تکیہ داری کے ساتھ میلوں میں جا جا کر پیسے کماتا تھا۔ وہ ریل سے کٹنے والی اس عورت کے بارے میں اتنا ہی جانتا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو لے کر دو تین دن پہلے میلے میں آئی تھی اور اُس نے مہوہ کے اس درخت کے پاس ایک چھوٹا سا تمبو کرائے پر لے کر اپنی دوکان لگائی تھ جہاں پر کرامت علی ٹھہرا تھا۔ رحم دل کرامت علی

نے آج ہی صبح اس کی بیٹی کو اپنے پیسوں سے جلیبیاں رام دانہ کی لیّہ اور دال موٹ وغیرہ خرید دیا تھا لیکن عورت سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ وہ کہاں سے آئی ہے۔ اس کا گھر کہاں ہے۔ اس کا گھر والا کہاں ہے۔

دو ہی روز پہلے میلے میں شاہ کرامت علی کی ملاقات مکّٹ نامی ایک جوان آدی باسی سے ہوئی تھی جو اچھے تن و توش کا مگر حد درجہ کریہہ شکل و صورت کا تھا اور چوری، ہتھ پھیری اور جیب تراشی کی غرض سے ایسے میلوں میں پہونچ جاتا تھا اور اپنے ہاتھ کی صفائی و چالاکی سے کافی رقم کما لیتا تھا۔ کرامت علی اپنی لوبان دانی سے چاروں طرف عود و عنبر کا دھواں بکھیرتا ''حق حق'' کہتا جا رہا تھا کہ بھیڑ میں کسی غافل تماش بیں کا پرس اُڑا کر مکٹ نے اُسے کرامت علی کی جھولی میں اس پھرتی و صفائی کے ساتھ ڈالا کہ اس غریب کو اس بات کی خبر بھی نہ ہوئی تھوڑی دور جانے کے بعد مکٹ نے کرامت علی کو پکارا۔

''اومیاں جی۔ میں نے کہا بابا صاحب...... ذرا سنو تو بھیّا''

کرامت علی آواز سن کر کھڑا ہو گیا ''مجھ سے کچھ کہا ہے؟''

''ہاں ہاں آپے سے کہا۔ بات اِی ہے کہ آپ کے جھولی ما ہمار کبوتر گھسا ہے''

کرامت علی نے کوئی جواب نہیں دیا مگر رک کر اس کی طرف اس طرح دیکھنے لگا جیسے اس نے اس کے ساتھ دل لگی کی ہو۔ مکٹ گندے گندے دانت نکالے ہنس رہا تھا۔

''ہی ہی ہی ہی۔ اچھا چاچا یہ لیو ایک روپیّہ اور لاؤ ہمار کبوتر''

ساتھ ہی اس نے کرامت علی کی جھولی میں جھٹ اپنا ہاتھ ڈال کر چوری والا پرس نکالا اور اپنی ٹیٹ میں چھپا لیا۔ کرامت چپ چاپ کھڑا اس کی صورت دیکھتا رہا اور جب پرس اس نے چھپا لیا تو کرامت بڑی ملائمیت سے بولا۔

''نا نا نا نا۔ یہ بہت برا کام ہے بیٹا۔ بہت بڑا پاپ ہے۔ یہ نہ کیا کرو''

''ارے واہ مولبی صاحب'' ''مکٹ بولا'' اور تم کون پُن کے کام کرَت ہَو۔ ادھر اُدھر مانگت پھرت ہو تو کا اِی اچھا کام ہے۔ اچھا کتنا پائے جات ہو دن بھر ماتاؤ تو جرا۔ یہی چار پانچ روپیّہ نا۔ اور ہم کہت ہے کہ ہمرے ساتھ آئے جاؤ پھر دیکھو مجا۔''

کرامت علی کچھ کہنے کے بجائے صرف اس کی صورت دیکھتا رہا

''اب ہمار منہہ کا دیکھت ہو گھونگھا بسنت۔ دیکھو تم ہمار مدد کئے ہو تو ہم بھی تمہار سیوا جَر ور کرب بس ایک مہینہ بعد مکر کی شنکرانتی ہے تم آپن اَبکّ تبکّ لے کے پراگ راج ماتر وینی تٹ پر چلے آ ئیو ایسی چکا چک کمائی کراؤب کہ جیون بھر یاد رہی مُولبی بابا۔''

میلے کی بھیڑ بھاڑ میں گم ہونے سے پہلے مکٹ اتنا اور کہہ گیا

''ہاں اِتّا کھیال رکھیو میاں جی کہ اِی مولبیائی والی بیس بھوشا اُتار کے آئیو۔ کا سمجھیو؟۔

ہم کہا سنکھطا نند بابا بن کے آئیو ما گھ میلہ ماں۔ اچھا؟“

”ارے تو اپنا نام تو بتا تا جا“ کرامت نے اُسے روک کر پوچھا

”ہمار ناؤں ہے مکٹ“

”مکٹ بہاری؟“

”بہاری وہاری نہیں۔ تحصیل کراری جلع الہ آباد اپنا دیس ہے“

میلے میں کرامت علی کے ساتھ اس کی سالی زرّیں کا بیٹا قدیر بھی آ کر ٹھہرا تھا۔ بیس بائیس سال کا جوان تندرست اور اچھے ہاتھ پیر کا قدیر کان پور ضلع کے مدنی پور گاؤں کا رہنے والا تھا اور بھدری کے میلے میں کھیتی کے لئے اچھے بیلوں کی جوڑی خریدنے آیا تھا۔ اس پکوڑی والی عورت سے قدیر کی جان پہچان بڑے دلچسپ طور سے ہوئی۔ دوپہر کے وقت جب قدیر پیڑ کے نیچے آرام کر رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ ایک غنڈہ اس عورت کو چاقو دکھا کر دھمکا رہا ہے ”جلدی بتاؤ کہاں چھپایا ہے“

وہ دوڑ کر قدیر کی طرف بھاگی۔ یہ دیکھتے ہی قدیر اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس بدمعاش کو للکار کر اس کے سامنے آ گیا۔ ”ابے اولومڑ- خبر دار جو آگے قدم بڑھایا“ قدیر نے ڈپٹ کر کہا تو وہ عورت دوڑ کر آئی اور قدیر کے پیچھے کھڑی ہو گئی جیسے اس کی پناہ میں آ گئی ہو۔

”کیوں ناحق اپنی موت بلا رہا ہے بیوقوف- ہٹ جا بیچ سے“ بدمعاش آنکھیں دکھا کر دھیرے سے بولا اور اپنا لمبا رامپوری چاقو لے کر قدیر کی طرف بڑھا ”ہٹتا ہے سامنے سے کہ گھسیڑ دوں پیٹ میں۔“

”اور تو اپنی خیریت چاہتا ہے تو چلا جا یہاں سے“ قدیر نے کہا

بدمعاش نے ایک جست لگائی اور سیدھا قدیر کے اوپر آ گیا جو اس اچانک حملہ کے لئے بالکل تیار نہیں تھا۔ بدمعاش کے دونوں پیر قدیر کے سینے پر لگے تو وہ چکرا کر زمین پر گر پڑا اور بدمعاش چاقو لے کر اس کے سینے پر گرنے ہی والا تھا کہ قدیر نے لپک کر ایک ہاتھ سے اس کے چاقو والے ہاتھ کو تھاما اور دوسرے ہاتھ سے ایک کرارا مُکّہ اس کی ناک پر رسید کیا مگر اتنے عرصہ میں چاقو کا وار اس کی کلائی پر لگ چکا تھا۔ خون بہتا دیکھ کر قدیر کو جوش آ گیا۔ اس نے تابڑ توڑ چار پانچ گھونسے بدمعاش کے نا کڑے پر اور جمائے۔ عورت نے بھی شور و غل مچایا تو بہت سے لوگ اکٹھا ہو گئے۔ بدمعاش بھاگنے لگا تو لوگوں نے اسے پکڑ لیا اور میلے میں گھومتے ہوئے پولیس کے سپاہیوں کے حوالے کر دیا۔

عورت قدیر کو اپنے تمبو میں لے آئی اور اس کی زخمی کلائی پر پٹّی باندھنے لگی۔ اس وقت قدیر نے اس کے چہرے کو قریب سے دیکھا۔ گندمی رنگت مگر بے حد دلکش ناک نقشے اور بڑی بڑی آنکھوں والی۔

”میری وجہ سے آپ کو یہ تکلیف اٹھانی پڑی۔ میں کس طرح آپ کا شکریہ ادا کروں“

”شکریہ کی کیا ضرورت ہے“ قدیر نے جواب دیا ”یہ تو انسانی فرض تھا“

”مگر وہ آپ کی جان بھی لے سکتا تھا“

”مرد تو اپنی جان ہتھیلی پر لئے رہتے ہیں“ قدیر نے کہا ”لیکن اجازت ہو تو ایک بات پوچھوں“

”پوچھئے“

”وہ بدمعاش آپ کو چاقو دکھا کر کیوں ڈروا رہا تھا- کیا کہہ رہا تھا آپ سے؟“

”کچھ نہیں- چھوڑیئے“ وہ پٹی باندھتے ہوئے مسکرائی ”بہت درد تو نہیں ہے؟“

”بس آپ یوں ہی مسکراتی رہئے- درد خود بخود ختم ہو جائے گا“

”اچھا؟“ اس نے شریر آنکھوں سے دیکھا ”آپ نے ابھی تک اپنا نام نہیں بتایا“

”آپ نے بھی تو نہیں بتایا“

”آپ نے پوچھا کب“ پھر ہنس کر بولی ”میرا نام شہزادی ہے“

”اوہو- شہزادی صاحبہ اس خاکسار کو قدیر کہتے ہیں“

”شادی ہو گئی؟“

”اونہک“

”اچھا!“ وہ خوش ہو کر مسکرائی

”اور آپ کے گھر والے- میرا مطلب ہے آپ کے ہزبینڈ“

”وہ اب نہیں رہے“ وہ سنجیدہ ہو کر بولی ”چھ مہینے ہوئے ایکسیڈنٹ میں ختم ہو گئے“

”چچ، چچ- کیسے؟“ اس نے پوچھا

”اب کیسے کیا- بس موت آنی تھی- بمبئی میں ٹیکسی چلاتے تھے ایک ٹرک سے ٹکّر ہو گئی اسی میں مارے گئے“

”مجھے بہت افسوس ہے“ وہ بولا ”یہی ایک لڑکی ہے آپ کی؟“

”جی ہاں“

”اس کا نام کیا ہے؟“

”اس کا نام روشن ہے“ وہ بولی

”مگر اُس بدمعاش کے بارے میں شاید آپ کچھ بتانا نہیں چاہتیں“

شہزادی تھوڑی دیر خاموش رہ کر بولی

”میرا دیور بہت بُرا آدمی ہے۔ اپنے بھائی کے مرنے کے بعد سے اس نے ہم دونوں پر بہت ظلم کئے اسی نے اس بدمعاش کو بھیجا تھا“

”مگر ستانے اور ظلم کرنے کی کوئی وجہ ہو گی نا“ قدیر نے کہا

''آپ بھی تو مجھے اتنی دیر سے ستا رہے ہیں۔اس کی کیا وجہ ہے؟'' وہ ہنسی

''اچھا اچھا۔سمجھ گیا''

رات میں جلدی دوکان بڑھا کر شہزادی قدیر کی تیمارداری کو چلی گئی۔اپنی بیٹی کو اس نے پہلے ہی کرامت علی کے ساتھ میلہ گھومنے کو بھیج دیا تھا۔قدیر نے کہا ''جب میں نے اس بدمعاش کی ٹھکائی کی تو لوگوں نے ہم دونوں کو میاں بیوی سمجھا تھا''

''آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ لوگوں نے ایسا سمجھا؟'' شہزادی نے پوچھا

''وہ ایسے کہ اپنی ہی عورت کی خاطر کوئی ایسی بے جگری سے لڑتا ہے۔اور میں نے بھی شاید یہی سوچ کر اس بدمعاش کو للکارا تھا''

شہزادی نے قدیر کا زخمی ہاتھ سہلاتے ہوئے بڑے پیار سے پوچھا ''سچ مچ ایسا ہی سوچا تھا؟''

''ہاں'' قدیر نے کہا

''تو اب کیا خیال ہے؟''

''کس بات کا؟''

''اُفّوہ۔شادی کا۔'' وہ شرما گئی

قدیر نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھ میں لے کر پوچھا ''تم راضی ہو؟''

''ہوں'' وہ بولی

''میں تمہیں اپنے گاؤں لے چلوں گا۔وہاں میری ماں ہے ایک چھوٹی بہن ہے۔چلو گی تم؟''

''ہاں چلوں گی'' شہزادی نے جھک کر قدیر کی پیشانی چوم لی پھر ایک لمحہ کے لئے اُٹھ کر اندھیرے میں پیڑ کے پیچھے گئی اور واپس لوٹی تو ہاتھ میں سونے کا ایک بسکٹ لئے تھی ''یہ آپ رکھ لیجئے'' اس نے وہ بسکٹ قدیر کو دیتے ہوئے کہا ''میری نشانی کے طور پر'' قدیر نے سونے کا بسکٹ دیکھا تو آنکھیں کھل گئیں دو تولہ سونے کا بسکٹ شہزادی نے محض اس کی باتوں پر اعتبار کر کے دے دیا تھا

''یہ سونے کا ہے؟'' قدیر نے پوچھا

''ہاں'' وہ بولی جب ہماری شادی ہو جائے گی تو میں تمہیں اور دوں گی'' ''مگر۔یہ۔یہ بسکٹ تم نے کہاں سے....''

''بس زیادہ پوچھ گچھ نہ کیجئے'' وہ بولی ''یہ سمجھ لیجئے میرے مرحوم مجھے دے گئے ہیں''

''پھر یہ تم مجھے کیوں دے رہی ہو؟''

''بس دے دیا'' وہ پھر مسکرائی ''اور بھی دوں گی۔یہ دیکھو ایک بسکٹ کا میں نے چمپا کلی بنوایا ہے۔یہ پہنے ہوں۔اچھی ہے نا؟''

''ہاں'' اس نے صرف اتنا ہی کہا اور سوچنے لگا۔یہ سونے کا بسکٹ وہ مجھے کیوں دے رہی ہے۔شاید اسی بسکٹ کے لئے وہ بدمعاش اس کے پیچھے لگا تھا۔

''جتنی خوبصورت تم ہو اتنا ہی حسین تمہارا تحفہ بھی ہے۔''

شہزادی صرف مسکرا دی

''میری ایک بات مانو گی شہزادی؟'' قدیر نے پوچھا

''کہئے'' وہ بولی

''اگر تم برا نہ مانو تو چلو ہم دونوں ایک ساتھ فوٹو کھنچائیں۔وہ دیکھو سامنے فوٹو گرافر ہے''

شہزادی تیار ہو گئی تو دونوں فوٹو گرافر کی دوکان پر پہونچے۔خوبصورت بنگلے کے بیک گراؤنڈ کا پردہ لگا کر تیز فوکس لائیٹ میں فوٹو گرافر نے اپنا کیمرہ فٹ کیا

''ارے اس طرح چپک کر بیٹھو شری مان۔میاں بی وی کی طرح۔ہاں۔ایسے۔تھینک یو۔''

پندرہ روپے میں تین فوٹو کاپیاں اُس نے دیں۔ایک فوٹو شہزادی نے اپنے پاس رکھ لی اور دو کاپیاں قدیر نے لے لیں۔

رات میں دس بجے کے قریب کرامت علی روشن کو میلہ گھما کر لوٹا تو اس وقت قدیر شہزادی کی دوکان پر بیٹھا تھا۔کرامت نے شہزادی سے کہا

''یہ لو بیٹی۔آج تو تمہاری مُنّی میرے ساتھ خوب میلہ گھومی۔سرکس دیکھا۔جھولے میں بیٹھی۔مٹھائی خریدی۔لو دیکھو تمہارے لئے بھی لائی ہے۔''

روشن نے رومال میں باندھی ہوئی مٹھائی نکالی۔شکر پارے اور جلیبیاں۔شہزادی اور قدیر نے بھی تھوڑی تھوڑی کھائی۔

''مجھے تمہاری مُنّی بہت اچھی لگتی ہے بٹیا'' کرامت نے کہا

''اچھا!'' شہزادی نے ہنس کر کہا ''کیوں روشن تو بابا کے ساتھ جائے گی؟''

روشن نے اثبات میں سر ہلایا

قدیر کو دیر رات تک نیند نہیں آئی۔آنکھیں بند کئے کروٹوں پر کروٹیں لیتا رہا۔کرامت علی نے اس کی بے چینی محسوس کر کے پوچھا

''قدیر۔نیند نہیں آرہی کیا؟''

''ہاں خالو''

''کسی کی یاد آرہی ہے؟''

''ایں!'' قدیر اُٹھ کر بیٹھ گیا ''ہاں ہاں۔یاد آرہی ہے۔''

''کون ہے وہ؟'' کرامت نے پوچھا

''خالو-'' قدیر نے بڑی معصومیت سے کہا ''وہ-شہزادی ہے نا؟''

''ہاں ہاں'' کرامت اس کے دل کی بات سمجھ گیا ''اس کا خیال ستا رہا ہے؟''

''ارے نہیں خالو'' وہ پھر لیٹ گیا ''تم نہیں سمجھو گے''

''ارے میں سمجھ گیا بیٹا'' کرامت ہنسا ''اگر اس پر تیرا دل آ گیا ہے تو ایک تعویز مجھ سے لے لے۔ کیا سمجھے؟ ایں جانب یعنی کرامت علی شاہ کی تسخیر محبوب والی تعویز بڑی طلسماتی ہے بیٹے۔ سچ کہتا ہوں وہ کل ہی تیرے بس میں ہو جائے گی۔''

''ارے بس میں تو ہے خالو''

''پھر؟-پھر یہ بے چینی اور تڑپن کیوں ہے'' پھر وہ بڑی راز داری سے قدیر کے کان میں بولا

''اگر تو کہے تو میں ابھی اسی وقت تیرا نکاح اس کے ساتھ پڑھ دوں۔''

قدیر منہ کھولے بیوقوفوں کی طرح کرامت کی طرف دیکھتا رہا-کرامت ایک ٹھنڈی سانس بھر کے بولا

''ہم نے بھی عشق کیا تھا بیٹے-کبھی ہم بھی کسی کی محبت میں گرفتار تھے-مگر ہمارا عشق تو خزاں کے مارے پتّے اور سوکھی ندی کی طرح رہا-ہائے کیا عشق تھا ہمارا-کیسے سہانے دن تھے۔مگر ہم تو مارے گئے عشق خانہ خراب میں۔''

''ارے تم ہماری بات کرو خالو'' قدیر پھر اُٹھ بیٹھا ''یہ بتاؤ کیا تم نکاح بھی پڑھ لیتے ہو؟''

''پڑھ لیتے ہو!'' اس نے برا مانا ''جانے کتنی شادیاں کرا چکا ہے یہ پیر و مرشد-تم نے بابا فرید احمد صوفی رحمۃ اللہ کا نام سنا ہے-نہ سنا ہوگا-یہ ناچیز انھیں کا شاگرد ہے۔''

''اچھا تو پھر بولو برکّت'' قدیر بولا ''اے خالو-بس جلدی سے ہم دونوں کا نکاح پڑھ دو۔''

''اور بیٹا تمہاری امّاں سے سوال جواب کون کرے گا-نہ بھائی نہ-وہ ہم سے ناراض ہوگی۔''

''اے خالو-تم بہت بُرے ہو میں نہیں بولتا تم سے'' قدیر ناراض ہوا

''دیکھو قدیر'' کرامت بولا ''اس قدر جلد بازی ٹھیک نہیں۔ چلو سو جاؤ''

''میرے اچھے خالو'' قدیر نے خوشامد کی ''لاؤ میں تمہارے پیر دبا دوں۔ خالو اگر تم نکاح نہیں پڑھتے تو میں جاتا ہوں اس کے پاس۔ ہاں پھر تم پر گناہ پڑے گا۔''

''اچھا اچھا پڑھ دوں گا نکاح'' کرامت بولا ''مگر پہلے اس سے بھی تو پوچھ لوں۔''

''خالو وہ پوری طرح راضی ہے۔ٹھہرو میں ابھی دکھاتا ہوں''

اتنا کہہ کر اس نے شہزادی کے ساتھ کھنچائی ہوئی تصویر خالو کو دکھائی

''لو دیکھ لو-اور اب یقین آ گیا ہو تو جلدی سے پڑھو نکاح۔''

فوٹو دیکھ کر کرامت علی نے اثبات میں سر ہلایا پھر مسکراتا ہوا قدیر سے بولا

''اللہ اللہ یہ بے صبری-اچھا بیٹا-چل تیرے ہی پیار کو پھل لگ جائیں۔ میں ابھی وضو بنا کے آتا ہوں تو پڑھ دوں گا تیرا نکاح۔'' کرامت علی وضو بنانے چلا گیا۔

اُدھر شہزادی کو بھی نیند نہیں آ رہی تھی۔ بارہ بجے کے بعد جب روشن سو گئی تو وہ اپنے خیمے سے نکل کر اکیلی ریل کی پٹری کی طرف چلی گئی جہاں بہت سے لوگ سنیما دیکھ رہے تھے۔ اُسی وقت بریلی پسینجر گاڑی بلا ہیڈ لائیٹ کے دبے پاؤں وہاں آ پہونچی اور ریل کی پٹری پر بیٹھے ہوئے غافل تماش بینوں کو کچل ڈالا۔ کرامت علی نکاح پڑھنے کے بعد قدیر کے سر پر پیار کا ہاتھ پھیر کر دعائیں دے رہا تھا کہ ریل گاڑی کے حادثے میں چیخ و پکار کی آواز سن کر گھبرا گیا

''یہ شور و غل کیسا ہے قدیر؟''

''پتہ نہیں خالو-چلو چل کر دیکھیں۔''

باہر نکل کر دونوں نے شہزادی کے تمبو پر نظر ڈالی تو وہاں صرف اس کی بیٹی روشن لیٹی سو رہی تھی شہزادی وہاں نہیں تھی۔ جب دونوں جائے حادثہ پر پہونچے تو انھیں بڑی دیر بعد نیم تاریکی میں شہزادی کی پابریدہ لاش دکھائی دی۔قدیر چیخ اٹھا

''خالو-یہ تو شہزادی ہے۔''

کرامت علی لپک کر لاش کے پاس پہونچا ''ہائے ہائے بے چاری۔ارے یہ کیسا غضب ہو گیا قدیر۔''

وہ لاش کے پاس بیٹھ گیا ''بیٹا قدیر دیکھ تو سہی کچھ جان ہے اس میں-ہائے میرے اللہ۔''

قدیر نے نبض پر انگلیاں رکھیں مگر فوراً ہٹا لیں۔ کرامت علی نے رونا شروع کر دیا مگر اصل میں اس کی نظر شہزادی کے گلے میں پڑی ہوئی سونے کے چمپا کلی پر تھی۔قدیر نے اُسے ہار اُتارتے دیکھ لیا۔

''یہ کیا کرتے ہو خالو؟''

کرامت علی چپکے سے بولا ''خاموش-یہ اب تیری ملکیت ہے۔تو اس کا خاوند ہے-اگر ابھی اندھیرے میں تو نے یہ کام نہ کیا تو میں تجھے بالکل گدھا سمجھوں گا۔'' پھر وہ اونچی آواز میں رونے لگا۔

''ہائے دیّا رے دیّا-ارے میری دلاری بٹی۔تو کیوں مر گئی''

پھر وہ قدیر سے مخاطب ہو کر دھیرے سے بولا ''تو بھی روز و رز ور سے''

کرامت علی کے نالہ و فریاد سے قدیر کا دل بھی پسیج گیا اور اس کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے

''رو لے بیٹا رو لے-تیری گھر والی ساتھ چھوڑ گئی''

اتنا کہہ کر کرامت علی جانے لگا اُسے جاتا دیکھ کر قدیر نے کہا

''کہاں جارہے ہو خالو؟''

''میں اس کی بیٹی کو اپنے ساتھ لے جارہا ہوں مگر تم یہیں اس کی لاش کے پاس بیٹھے رہنا۔ ہٹنا نہیں''

''کیوں؟۔ میں کیوں بیٹھا رہوں؟'' قدیر نے پوچھا

''کیوں کہ یہ تمہاری بیوی اور تم اس کے شوہر ہو اور یہ تمہارا فرض ہے۔''

''واہ خالو''

''تمہارے بھلے کی بات کہہ رہا ہوں قدیر۔ اس میں تمہارا فائدہ ہے''

''اچھا۔ تو پھر اس کی چمپا کلی بھی مجھے دو اور روشن کو بھی اپنے ساتھ نہ لے جانا۔''

''تم روشن کو اپنے ساتھ لے جا کر کیا کرو گے'' کرامت بولا ''ارے بیوقوف ابھی تو تمہاری شادی بھی نہیں ہوئی، تمہیں تو بہت سی بیٹیاں مل جائیں گی۔''

''مگر تم اسے لے جا کر کیا کرو گے۔ بھیک منگواؤ گے اس سے؟'' قدیر نے پوچھا

''میرے کوئی اولاد نہیں ہے قدیر۔ میں اس کی پرورش کروں گا۔'' اُس نے بڑی لجاجت سے کہا

''اچھا ٹھیک ہے'' قدیر نے کہا ''روشن کو لے جاؤ مگر چمپا کلی تمہیں نہیں لے جانے دوں گا۔ یہ شہزادی کی نشانی ہے میرے پاس رہے گی۔''

''اچھا اچھا۔ تمہاری ہی ضد سہی'' کرامت نے چمپا کلی اس کی طرف پھینک دی ''لے جاؤ مجھے اس کی بیٹی چاہئے وہ میں لے جاؤں گا۔ اور دیکھو قدیر تمہارے فائدے کی ایک بات بتاتا ہوں۔ تم اس لاش کے پاس سے مت ہٹنا۔ اس کا کوئی والی و وارث نہیں ہے بالکل اکیلی ہے۔ جب سرکار ریل سے مرنے والوں کے رشتہ داروں کو معاوضہ دے گی تو تمہیں بھی ایک لاکھ مل جائیں گے۔ اس وقت تم اس کے شوہر ہونے کی وجہ سے اصل وارث ہو۔''

''مگر خالو'' قدیر کو تذبذب تھا ''کیا سچ مچ میں اس کا شوہر ہوں''

''اُفّوہ۔ کیا میں نے تمہارے سامنے نکاح نہیں پڑھا۔ تمہارے دل میں یہ شک کیوں آیا۔ خیر تم میری بات کو گرہ میں باندھ لو کہ اس عورت کی لاش تم سے چھٹنے نہ پائے جب تک کہ سرکاری کاغذوں میں خوب اچھی طرح لکھا پڑھی نہ ہو جائے۔''

''اس بات سے میرا دل دھڑک رہا ہے خالو''

''کیوں؟''

''نکاح پڑھ دینے سے کیا وہ میری بیوی ہو گئی؟''

''اور کیا'' کرامت نے ڈانٹ کر کہا ''لگتا ہے تم سب گڑبڑ کر دو گے اور ایک لاکھ پر پانی پھر جائے گا''

''ایک لاکھ؟'' قدیر نے کہا اور پھر چپ چاپ شہزادی کی لاش کے پاس بیٹھ گیا وہ اب سچ مچ آنسوؤں کے ساتھ رونے لگا جیسے اپنی بیوی کے مرنے پر کوئی روتا ہے۔ دھیرے دھیرے بھیڑ اکٹھا ہونے لگی اور جو بھی دیکھتا وہ قدیر کو تسلیاں دیتا تھا۔

ادھر کرامت علی نے روشن کو جگا کر کہا ''اُٹھ بیٹی اُٹھ۔ چل میرے ساتھ''

روشن اُٹھ کر آنکھیں ملنے لگی ''کہاں چلوں۔ امّاں کہاں ہیں؟''

کرامت نے سوچا اُسے کیا جواب دے۔ ایک ننّھی سی جان کو ماں کے مرنے کی خبر سنانا اُسے بہت مکروہ لگا۔ وہ خود اتنا کٹھور دل کا نہیں تھا مگر اس وقت تو اسے کچھ نہ کچھ بتا کر اپنے ساتھ لے جانا تھا۔ ''وہ ایسا ہے بیٹی کہ تیری ماں تو نہ جانے کہاں چلی گئی مگر مجھ کو یہ کہہ کر گئی ہے کہ روشن کو اپنے ساتھ لے جانا۔ اور تجھ سے پوچھ بھی تو لیا تھا میں نے۔ آؤ آؤ تم چلو میرے ساتھ''

روشن اُٹھ کر کرامت کے ساتھ ہو لی اور وہ اپنے مختصر سامان کے ساتھ چپکے سے اُسی دُرگھٹنا والی ریل گاڑی کے ایک اندھیرے ڈبّے میں جا کر بیٹھ گیا۔ گاڑی دو گھنٹے بعد آگے چلی۔

صبح ہوتے ہوتے جائے حادثہ پر ایک جم غفیر جمع ہو گیا۔ میلہ کا سارا مجمع اسی جگہ اکٹھا ہو گیا تھا۔ پولیس بھی آئی۔ آس پاس کے اسپتالوں کا عملہ بھی۔ ایمبولینس، ریلیف گاڑی، ریلوے کے اعلیٰ حکام، فوٹوگرافر اور کاغذی خانہ پری کرنے والے اہلکاران سب آ گئے۔ لکھا پڑھی شروع ہوئی۔ زخمیوں کو اسپتالوں میں بھیجا گیا۔ مرنے والوں کا فوٹو لیا گیا۔ مرنے والوں میں جن جن کے رشتے دار وہاں موجود تھے اُنھیں کریا کرم اور کفن دفن کے لئے سرکار نے پانچ پانچ سو روپے فوراً دیئے۔ قدیر کو بھی پانچ سو کی رقم ملی۔ ایک مقامی رفاہ عام انجمن بھی غریب پردیسیوں کی مدد کو آ گئی جس نے اپنے پاس سے خرچ کر کے قدیر کی بیوی کو سپرد خاک کر دیا۔ ریلوے کے افسروں نے اعلان کیا کہ مرنے والوں کے قریبی رشتہ داروں کو گورنمنٹ سے جو معاوضہ کی رقم منظور ہو گی اس کی اطلاع ان کے گھروں پر بھیج دی جائے گی۔ قدیر اہلکاروں کو اپنا پتہ لکھا کر اپنے گاؤں لوٹ گیا۔

کرامت علی جب روشن کو ساتھ لے کر اپنے گھر جائس پہونچا تو اس کی بے اولاد گھر والی چندا ایک پھول جیسی بچّی کو دیکھ کر خوشی سے نہال ہو گئی۔ چندا کرامت علی کے گھر آنے سے پہلے بدّھن کنگریا کے پاس تھی۔ جوانی میں متناسب اعضا کے ساتھ چہرے کے دلکش نقوش، رنگ و روپ میں ہلکی سی ملاحت اور خوبصورت آنکھوں کے سبب اس میں ایسی جنسی کشش پیدا ہو گئی تھی کہ اس کے احساس نے چندا کو بے حد ناز و نخرے والی بنا دیا تھا اور شاید اسی دلفریبی پر مر مٹ کر بدّھن کنگریا چندا کو اپنی جان کی بازی لگا کر کہیں سے بھگا لایا تھا۔ جب تک وہ تندرست اور ہٹّا کٹّا رہا تب تک چندا نے محلّہ کے دل پھینک جوانوں کو گھاس نہیں ڈالی مگر جب کمّو دھوبن سے چوری چوری ملنے کی پاداش میں بدّھن کا ڈھکا

چھپا جذام دھیرے دھیرے اس کے چہرے کے ناک نقشے کو اچھی طرح بگاڑ چکا تو چندا کو اس سے گھن اور شبّو گدّی سے کچھ کچھ رغبت ہونے لگی۔ اس طرح سال بھر تک شبّو کی مُرّا ابھینس کا خالص دودھ اور مٹّھا مفت میں پینے کے بعد ایک روز چندا کرامت علی کے گھر آ بیٹھی۔ اس ہیرا پھیری کی وجہ یہ تھی کہ چندا کے خیال میں شبّو اول درجہ کا گھامڑ گدّی تھا۔ برخلاف اس کے کرامت علی بڑا گبرو جوان اور تگڑا تھا۔ کرامت نے اُسے اپنے گھر میں ڈال لیا۔

کرامت نے روشن کو چندا کے حوالے کرتے ہوئے خوش خبری دی۔

''لے نیک بخت۔ اللہ میاں نے تیری گود بھر دی، بس اس بچی کو اپنی سمجھ کر پال''

چندا اُسے دیکھ کر خوشی سے کِھل اُٹھی ''ہائے اللہ کتنی پیاری گوری گوری ہے''

''ارے نظر نہ لگا'' کرامت بولا ''پہلے رب کا شکر ادا کر کہ اس نے ایک پالی پوسی، بچی دے دی''

''ارے میں صدقے واری جاؤں'' وہ روشن کی چٹا چٹ بلائیں لینے لگی پھر جب اس نے بچی کو اپنی گندی گود میں بٹھانا چاہا تو وہ چھٹک کر الگ کھڑی ہو گئی۔

''ہٹ!'' روشن ناک بھوں سکوڑ کر بولی

''اوہو۔ پہلے اسے کچھ کھانے کو دے۔ نہ جانے بے چاری نے کب سے نہیں کھایا۔'' کرامت نے کہا

''اچھا اچھا، دیتی ہوں'' چندا بولی۔ مگر گھر میں تو کچھ کھانے کو نہ تھا اس لئے وہ پڑوس میں ابراہیم بھانٹ کے گھر چلی گئی اور اس کی بیوی بٹّن سے جوار کی روٹی اور آلو پالک کی ترکاری مانگ لائی۔ روشن سچ مچ بھوکی تھی اس لئے کھانے لگی۔

''کہاں سے لے آئے یہ ہیرے کا ٹکڑا؟'' چندا نے اس کے کان میں پُھسکا۔

''اب یہ سب مت پوچھ'' کرامت نے سمجھایا ''بس جان لے کہ آج سے تو ہی اس کی ماں ہے اگر کوئی پوچھے تو یہی بتانا۔ سمجھ گئی؟''

''ارے تم نے مجھے دودھ پیتی بچّی سمجھا ہے کیا'' چندا بولی ''میں تم سے زیادہ چتُر ہوں۔''

لڑکی کو روٹی کھاتی چھوڑ کے کرامت علی ذرا دیر کو باہر نکلا۔ ابراہیم بھانٹ (میراثی) نئی تہمد اور سر پر نارنجی رنگ کا صافہ باندھے کہیں جانے کی تیاری کر رہا تھا اس کی چال میں پھرتی دیکھ کر کرامت نے قیاس لگایا کہ آج ضرور کہیں کوئی کھانے کی تقریب ہے۔ ساتھ ہی قصبے کی سب سے اوپری آبادی میں میاں صاحب کے دمدمہ سے لاؤڈ اسپیکر پر گانوں کی آواز آ رہی تھی۔ اپنی مزید تسلّی کے لئے کرامت نے ابراہیم سے پوچھ لیا۔

''او بیٹا ابراہیم۔ کہاں کی سائی ہے آج؟''

''ارے چچّا۔ جان پڑت ہے تمہری ناک میں خوشبو پہونچ گئی۔''

پھر آگے بڑھ کر اس نے کرامت علی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا ''حاجی مدّن کی چھوٹکی بٹیا کی برات نصیر آباد سے آئی ہے۔ اچھا کھانا پینا ہے۔ تم تنک ٹھیک ٹیم سے پہونچ جانا چچّا۔''

''ارے کیا پہونچ جائیں ابراہیم بیٹا'' وہ بولا ''اب تو ملکیا نے والے بھی دانتوں سے روٹی پکڑنے لگے ہیں۔ ہم لوگوں کو کچھ ملتا کہاں ہے۔''

''کاہے دل چھوٹا کرت ہو چچّا'' ابراہیم نے ڈھارس بندھائی ''بس تم اپنا برتن لے کے آ جانا پیٹ بھر بکرے کی بریانی نہ کھلوائے دیا تو میراثی نہیں سنیاسی سمجھنا۔''

حاجی مدن کے یہاں نصیر آباد سے جو بارات آئی تھی اس کی بڑی تواضع ہوئی۔ قصبہ کے معززین بھی کھانے پر مدعو تھے۔ شیرمال، قورمہ، کباب کے ساتھ مرغ کی بریانی بھی پکی تھی مگر ہائے رے براتیوں کا نصیبا کہ براتیوں میں کسی شریر من چلے نے شور مچایا کہ بریانی میں چوہے کی مینگنی ہے۔ پھر دو چار شر پسندوں نے بھی ہاں میں ہاں ملا دی تو پوس کی ٹھنڈک میں حاجی مدّن کو پسینے آ گئے مگر ان کے بڑے بھائی حافظ ملّن کے بیٹے عبد الصمد نے جو پیلی بھیت میں سب ڈویژنل مجسٹریٹ تھے اپنے نوکروں کو حکم دیا کہ بریانی کی ساری پلیٹیں اور ڈشیں دسترخوان سے ہٹا لی جائیں۔ آن کی آن میں سب کی سب بریانی گڈھا کھود کر دفن کر دی گئی مگر اس سے پہلے ہی رزّاق دو عالم نے ابراہیم بھانٹ کی جوڑ توڑ سے کرامت علی کی ایک بڑی سی بالٹی مرغّن بریانی سے بھر دی۔

★ ★ ★

بھدری کے میلے سے قدیر اپنے گاؤں مدنی پور لوٹا تو بیوی کے کفن دفن کے لئے سرکار سے ملے پانچ سو روپوں میں سب کا سب بچا لایا تھا پھر اپنی ماں زرّیں اور چھوٹی بہن لاڈلی کو ریل کا حادثہ اور میلے کا پورا قصہ سناتے ہوئے اس نے بتایا کہ گورنمنٹ سے ایک لاکھ روپیہ بیوی کے مرنے کا معاوضہ بہت جلد مل جائے گا اور جب یہ رقم اُسے مل جائے گی تو وہ بہت سے بڑے بڑے کام کرے گا اس کی ماں کو اتنی موٹی رقم ملنے کی اطلاع پر خوشی تو ضرور ہوئی مگر اس سے زیادہ حیرت اس بات کو سُن کر ہوئی کہ قدیر اچانک چند ہی دنوں میں بیوی والا کیسے بن گیا۔

''قدیر؛ میں پوچھتی ہوں تیرے پاس بیوی کہاں سے آ گئی''

''واہ امّاں'' وہ بولا ''میں کیا بیاہ نہیں کر سکتا۔ اچھا خاصا جوان آدمی ہوں۔ صورت بھی بہترین ہے۔ کیوں لاڈو میں جھوٹ تو نہیں کہتا؟''

”بالکل جھوٹ کہتے ہو“ لاڈلی نے چٹکی لی ”شادی کرنے والی صورت ایسی ہوتی ہے؟“

”پھر کیسی ہوتی ہے؟“ قدیر نے جلدی سے پوچھا

”وہ تو وقت آنے پر خود ہی معلوم ہو جائے گا۔“

”ارے لاڈو کی بچّی“ قدیر نے برا مانا

”اچھا خیر“ ماں نے کہا ”مگر اتنی جلدی اور بغیر مجھے بتائے تو نے شادی کیوں کر لی“

”اب جانے بھی دو اماں“ قدیر بولا ”وہ بے چاری تو آئی بھی اور چلی بھی گئی“

”ہاں لیکن مجھے تو یہ اُڑائی چڑھائی کی باتیں لگتی ہیں۔ یقین ہی نہیں آتا“ ماں بولی

”امّاں اب آپ کو یقین نہ آئے تو میں کیا کر سکتا ہوں“

”لیکن بھیّا مجھے تو اس بے چاری کے مرنے کا سچ مچ بڑا دکھ ہے۔ گھر لے آتے تو میں بھی دیکھتی“

”موقع کہاں ملا لاڈو“ وہ بولا ”مقدّر میں تو اتنی جلدی جدائی لکھی تھی“

”وہ دیکھنے میں کیسی تھی بھیّا؟“ لاڈلی نے پوچھا

”بڑی سُندر تھی- بالکل تمہارا جیسا رنگ تھا۔ خوبصورت آنکھیں تھیں- اچھا ٹھہرو میں اس کا فوٹو دکھاتا ہوں تمہیں۔“

قدیر نے میلے میں کھنچائی فوٹو ان دونوں کو دکھائی تو باری باری دونوں نے بہت لہک کر دیکھا اور دیکھ کر بہت خوش ہوئیں

”ہائے امّاں دیکھو تو - کتنی اچھی تھی بھابھی“ لاڈلی چہک کر بولی

”ہاں اچھی ہے“ ماں نے کہا ”لیکن قدیر یہ تو عمر میں تجھ سے بڑی لگتی ہے۔“

”اب چھوٹی بڑی دیکھ کر کیا کرو گی“ ٹھنڈی سانس لے کر ”وہ بے چاری تو جنّت میں ٹہل رہی ہو گی“

”دیکھو بھیّا“ لاڈلی بولی ”اب کی میں اپنی پسند کی بھابھی لاؤں گی“

”تمہاری پسند کس کام کی“ قدیر نے کہا ”لیکن خیر چلے گی- کوئی لڑکی ہے نظر میں؟“

”ہے“ وہ جھٹ بولی ”مگر بتاؤں گی نہیں“

”اچھا!- ٹھیک ہے تمہارا ہی گھاٹا ہو گا ہمیں کیا - نہ بتاؤ“

”کیوں کیوں- میرا گھاٹا کیوں ہو گا؟“ اُس نے کمر پر ہاتھ رکھ کر پوچھا

”اس لئے کہ میں پھر کہیں اور سے لے آؤں گا“

”اپنی ہی شادی کی رٹ لگائے ہو“ ماں بولی ”بہن کا کچھ نہیں سوچتے“

”ارے ہاں بھائی- اچھا لاڈلی تم بتاؤ تمہیں کیسا دولھا چاہیئے۔“ قدیر نے مذاق کیا

”امّاں- دیکھ رہی ہیں آپ انہیں“ پھر وہ روٹھ کر چلی گئی

”تم فکر نہ کرو امّاں- لاڈلی کو میں بہت اچھی جگہ بیاہوں گا۔“ قدیر بولا

”کوئی لڑکا دیکھا ہے کیا؟“

”اُفّوہ- کتنی بار سنو گی اماں“ قدیر بولا ”میں وسیم کے بارے میں کہہ رہا ہوں۔“

”مگر لاڈلی تو وسیم کے ساتھ راضی نہیں ہوتی“

”کیا کہتی ہے؟“

”کہتی تو کچھ نہیں۔ بس اس کے نام پر منھ لٹک جاتا ہے۔“

”تو میں دوسرا تلاش کروں گا“ قدیر بولا ”دوسرا نہیں تیسرا چوتھا۔ آخر تو لاڈلی کسی ایک کو پسند ہی کرے گی۔“

”اچھا شبیر میں کیا برائی ہے؟“ ماں نے سوال کیا

”شبیر؟“ قدیر بولا ”ہاں وہ بھی ٹھیک ہے۔ کان پور میں پریڈ پر اس کی جوتوں کی بہت بڑی دوکان ہے۔ بانس منڈی میں اس کا اپنا گھر ہے۔“

”تو تم شبیر کے بارے میں پہلے میر صاحب سے بات چیت کر لو“ ماں نے کہا

”کیوں؟- میر صاحب سے کیوں؟“ قدیر نے سوال کیا

”وہ کئی بار مجھ سے کہہ چکے ہیں کہ لاڈلی کا بیاہ میں اپنی پسند سے کروں گا تو جب تک انھیں بھی راضی نہ کر لیا جائے ہم لوگ اس بارے میں کچھ نہیں کر سکتے۔ ہاں تمہارے باپ زندہ ہوتے تو کوئی بات نہ تھی۔“

”ارے ابّا نہیں تو کیا ہوا“ قدیر بولا ”میں تو موجود ہوں“

”ہاں- مگر-“ وہ ہچکچا کر رہ گئی

”مگر کیا؟“ اس نے پوچھا ”امّاں تم صاف صاف کیوں نہیں بتاتیں“

”کہہ تو دیا کہ میر صاحب کی مرضی کے بغیر ہم لاڈلی کا بیاہ نہیں کر سکتے“ ماں نے کہا

”کیوں نہیں کر سکتے؟“ قدیر بولا ”میر صاحب کوئی لاٹ صاحب ہیں کہ توپ دم کر دیں گے- کوئی باگھ ہیں کہ نگل جائیں گے- اچھا- ٹھیک ہے۔ میں پہلے میر صاحب ہی سے بات چیت کروں گا۔“

ماں کی اس مجبوری اور میر صاحب سے خوف زدہ ہونے کی بظاہر کوئی وجہ قدیر کی سمجھ میں نہ آئی مگر اس نے اس مسئلہ پر ماں سے بحث کر کے بات آگے نہیں بڑھائی بلکہ چپ چاپ اُٹھ کر چلا گیا۔

میر فدا حسین خاتمۂ زمینداری سے پہلے مدنیؔ پور کے ساتھ دو اور گاؤں کے تنہا مالک تھے زمینداری کو ختم ہوئے تو بیس برس کا عرصہ گذر چکا تھا۔ اُن کے سارے آسامی سرکار میں دس گنا لگان جمع

کر کے بھومی دھر بن گئے تھے اور معاوضۂ زمینداری میں سرکار سے ملے ہوئے بانڈ بھی میر صاحب ایک ایک کر کے فروخت کر چکے تھے مگر اپنی وضعداری کی شان انھوں نے اب تک برقرار رکھی تھی اور اسی کے بل بوتے پر وہ اب بھی گاؤں والوں اور پرانے کارندوں پر اسی رعب ودبدبہ سے حکومت کر رہے تھے۔ قدیر کا باپ رحمان میر صاحب کا بڑا جاں نثار تھا اور ان کے ادنیٰ اشارے پر کچھ بھی کر ڈالنے کو ہمہ وقت تیار رہتا تھا۔ اس کی اس بے جگری اور وفاداری کا میر صاحب نے جی کھول کر فائدہ اٹھایا یہاں تک کہ اپنے مخالفین کے ساتھ ایک فوجداری میں وہ اپنے بہادر اور وفادار کارندے رحمان کی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ رحمان مرا تو اس کی بیس بائیس سال کی جوان اور بے حد حسین بیوی زرّیں کے پاس چار سال کا قدیر تھا لیکن چند مہینوں بعد ایک بچّی بھی اس کی گود میں آ گئی جس کو زرّیں کی یقین دہانی کی بنیاد پر میر صاحب اپنی بیٹی سمجھتے رہے۔

پرانے اصولوں والے میر فدا حسین بظاہر بڑے وضعدار اور خدا ترس آدمی تھے اس لئے جس جاں نثار نے ان کی خاطر اپنی جان گنوادی تھی بھلا اس کے بے سہارا خاندان کی کفالت وہ کیسے نہ کرتے۔ زرّیں جب اپنے کنبے کے ساتھ میر صاحب کے گھر آ گئی تو سخی دل میر صاحب نے اس غم زدہ کنبے کی ہر عنوان سے دل جوئی اور مدد کی۔ میر فدا حسین مدنی پور گاؤں کے رہنے والے نہیں تھے ان کا آبائی مکان ضلع رائے بریلی کے سب سے بڑے قصبہ جائس میں تھا اور اس قصبہ کی بڑی حویلی میں ان کی سیدانی زہرا بی بی اپنے مبروص اعضا کی پاداش میں میر صاحب کی بے التفاتیاں جھیلنے کے لئے پھیکی بے مزہ زندگی کے دن گذار رہی تھیں۔ دلکش اور متناسب ناک نقشے والی بے حد خوبصورت اور جوان زرّیں جو خود میر صاحب ہی کی آوردہ و پروردہ تھی جب ان کے گھر آ گئی تو وہ ساری دل جوئیاں اور عنایات جو سیدانی بی کے دست مبروص سے ابھی تک محفوظ تھیں ایک ایک کر کے وہ زرّیں پر نچھاور کرنے لگے۔ ناسمجھ قدیر اچھے اچھے کپڑوں کے ساتھ صبح کو دودھ جلیبی کا ناشتہ پانے لگا تو جلد ہی اپنے باپ کو بھول گیا۔ میر صاحب نے کچھ دنوں بعد اس کا نام بھی گاؤں کے اسکول میں لکھا دیا۔ کھانے پینے اور تن کے سب ہی سُکھوں سے مطمین ہونے کے بعد زرّیں کے چہرے پر پہلے سے زیادہ شادابی آ گئی، ایسی نکھری کہ میر صاحب اپنے نام کی رعایت سے سچ مچ اس پر ''فدا'' ہو گئے۔ مگر جلد ہی اس حسین شاداب وشگفتہ پھول کا ایک دعوی دار بھی آ گیا۔ زرّیں کی بڑی بہن رانی جائس کے کرامت علی درویش کو بیاہی تھی۔ پانچ چھ سال تک اپنے شوہر کی رفاقت کے بعد رانی اچانک ہیضہ سے مر گئی اور ایسا مری کہ کرامت علی کو اس کے مرنے کا پتہ ہی نہ چلا۔ اس کے مرنے سے ایک دن پہلے کرامت علی غازی میاں کے میلے میں پرشد لے پور گیا تھا اسی روز کسی مرنے والے کے تیجے میں بھر پیٹ ماش بھات کھانے کے بعد رانی کو تخمہ ہو گیا تو بھر دَر جیٹھ کی گرمی میں صبح سے شام تک تڑپ تڑپ کر رانی چل بسی۔

کرامت علی میلے سے لوٹ کر آیا تو پتہ چلا کہ رانی گذر گئی - رانی تو مر گئی مگر گھر سنسان کر گئی۔ کوئی اولاد بھی نہ چھوڑی۔ گھٹنے کی چوٹ میں جو درد ہوتا ہے وہ دو ایک دن بعد تو مٹ ہی جاتا ہے مگر جس وقت چوٹ لگتی ہے اس وقت انسان درد سے تلملا اُٹھتا ہے۔ کرامت علی بھی رانی کی اچانک مفارقت سے تڑپ اُٹھا۔ ہنوز یہ غم بھولا نہیں تھا کہ چند ہی روز بعد اپنے ہم زلف رحمان یعنی زرّیں کے شوہر کے قتل کی خبر ملی۔ پُرسے کے لئے زرّیں کے پاس جانا تو ویسے بھی ضروری تھا مگر اس کے ساتھ کرامت اپنے دل کے کسی گوشے میں دبی ہوئی اس خواہش کو بھی ساتھ لے چلا کہ زندگی کے لمبے سفر میں اب بھی اگر زرّیں کی رفاقت مل جائے تو دونوں کے اجڑے ہوئے گھر پھر سے بس جائیں گے۔ وہی زرّیں جس پر وہ کبھی دل وجان سے فدا تھا جو اس کی قسمت میں آنے کے بعد بھی نہ مل سکی اور جب تک اس کا بیاہ رحمان کے ساتھ نہیں ہوا تھا اس وقت تک کرامت اُسے اپنی سالی بنا کر خوب خوب ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ کیا کرتا تھا۔ چونکہ اچھے ہاتھ پاؤں اور مضبوط بدن کا گبرو جوان تھا اس لئے صنف نازک اس کی طرف آسانی کے ساتھ ملتفت ہو جاتی تھی۔ زرّیں کو بھی اس کے چھیڑ چھاڑ میں مزہ ملتا تھا، کبھی کبھی تو دونوں ہنسی مذاق میں اعتدال سے آگے نکل جاتے تھے پھر بھی کرامت کی دست درازیوں کا نہ کبھی رانی نے برا مانا اور نہ زرّیں نے۔

اور آج زرّیں کو حاصل کرنے کے میٹھے تصوّر کو لے کر جب کرامت علی اس کے پاس جا کر پوری پوری تعزیت ادا کر چکا اور اس کی آنکھوں سے نکلے ہوئے آنسوؤں کو اپنے ہاتھ سے خشک کر چکا تو ڈرتے ڈرتے حرف مدعا زبان پر لایا ''برا نہ مانو زرّو تو ایک بات کہوں''

زرّیں نے اپنی بھیگی پلکوں سے اس کی طرف دیکھا لیکن منھ سے کچھ نہ بولی۔

''اب تو اس غریب پر رحم کر دو زرّیں'' وہ بڑا جذباتی ہو کر بولا ''میرے کلیجے پر رکھا ہوا بھاری پتھر اگر اب چاہو تو ہٹا سکتی ہو۔ صبر کا امتحان اب آگے اور نہ لو۔ زرّیں اب میں تمہاری جدائی اور نہ سہہ سکوں گا۔ ادھر دیکھو تمہارے ہاں کہہ دینے سے ہم دونوں کی زندگیاں سنور جائیں گی۔''

''کیا کروں؟'' وہ گلوگرفتہ آواز میں بولی اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''اب بھی وقت نہیں گذرا'' کرامت نے کہا ''پھر ہم دونوں کے رفیق زندگی اب دنیا میں نہیں رہے کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم میری زندگی میں سچ مچ بہار بن کر آ جاؤ۔ میرے ساتھ نکاح پڑھا لو زرّیں میں پھول کی طرح سجا کر رکھوں گا۔ اپنی جان سے بڑھ کر چاہوں گا۔''

کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ بولی ''پہلے تم میر صاحب سے بات کر لو.... دیکھو وہ کیا کہتے ہیں''

''میر صاحب!'' کرامت بولا ''میر صاحب سے کیوں پوچھوں؟ دیکھو زرّو۔ جب ہم دونوں راضی ہیں تو بیچ میں میر صاحب کو ٹانگ اڑانے کی کیا ضرورت ہے۔ میں تمہیں اپنے کلیجے میں بٹھا کر رکھوں گا۔ خوش رکھوں گا۔ بس تم ایک بار ہاں کہہ دو''

''وہ بولی'' مگر تم میر صاحب سے پوچھ تو لو''

''یا میرے اللہ'' کرامت بولا ''میں پوچھتا ہوں وہ آخر کیا لگتے ہیں تمہارے۔ کیوں پوچھوں اُن سے۔ وہ جائس سے تمہیں یہاں لائے تھے، بس یہی نا۔ دیکھو زرّیں میں تمہارے ہی بھلے کی بات کہتا ہوں کیوں اپنی پیاری پیاری زندگی کو میر صاحب کے ساتھ برباد کر رہی ہو۔ چلو میرے ساتھ یہی دن تمہارے عیش کرنے کے ہیں زرّو''

اتنا کہہ کر کرامت علی نے اپنی مرحومہ گھر والی رانی کی سونے کی پنچ پڑی نکال کر زرّیں کے ہاتھ میں دی ''زرّیں! یہ تم میری طرف سے قبول کر لو۔ تمہاری بہن کی نشانی ہے''

''بعد میں لے لوں گی۔ ابھی تم اسے اپنے ہی پاس رکھو'' وہ بولی

★★★

میر فدا حسین کرامت علی کے منہہ سے زرّیں کی خواستگاری کا سوال سنتے ہی ہتھے سے اُکھڑ گئے۔ منہہ میں بھری پان کی پیک سے اُگالدان بھرنے کے بعد آنکھیں نکال کر بولے

''کیوں بے! پھکٹّے۔ تجھے کوئی اپنے قوم قبیلہ کی گھر بسانے والی نہیں ملی تھی جو یہاں تک چلا آیا۔ ابے میں پوچھتا ہوں کیا کھلائے گا سالے اپنی جورو کو۔ بھیک منگوائے گا کہ حرام کاری کرائے گا۔ عقل ہے نہ تمیز۔ بڑا آیا ہے سگا سمدھی بن کر''

کرامت علی ہاتھوں کو جوڑ کر گڑگڑایا ''میر صاحب۔ آپ کے پیروں پڑتا ہوں۔ زندگی بھر آپ کی تابع داری کروں گا۔ آپ کی جوتیاں اُٹھاؤں گا۔ اپنے قدموں میں پڑا رہنے دیجئے۔ یہ غلام رحمان ہی کی طرح زندگی بھر آپ کی چاکری کرے گا۔''

میر صاحب بھلا اس بندۂ بے دام کو ہمیشہ اپنے قدموں سے لگائے رکھنے کی حماقت کیوں کرتے جب کہ وہ ان کی مملکت پر نگاہ ہی نہیں کچھ کچھ حق بھی رکھتا ہو۔ اُنھوں نے سوچا سالا فقیر کی اولاد اگر یہاں آ کر بس گیا تو اپنی ساری پاک دامنی کا تیا پانچہ کر دے گا اور ساری عزّتِ سادات خاک میں مل جائے گی۔ کرامت علی کے گڑگڑانے پر اُنھوں نے بات ٹالنے کے لئے کچھ تامل کے بعد کہا

''مجھے زرّیں سے پوچھنا ہوگا اس لئے تم ابھی اپنے گھر واپس جاؤ''

''وہ تو راضی خوشی ہے میاں'' کرامت نے جھٹ جواب دیا ''آپ بھی ہاں کہہ دیجئے۔''

''کیسے جانا کہ وہ راضی ہے؟'' اُنھوں نے پوچھا ''کیا اس سے باتیں کی تھیں؟''

''ہاں میاں۔ میں نے اس سے بات کی تھی وہ نکاح پر راضی ہے اسی لئے آپ کے پاس آیا

ہوں۔ یہ سونے کی پنچ لڑی اُس کے لئے قبول کر لیجئے مالک آپ ہی اس کے مائی باپ ہیں۔''

اتنا سنتے ہی میر صاحب کے تن بدن سے جوالا مکھی پھوٹ پڑا جوتا تان کر کھڑے ہو گئے۔

''حرام زادے پھکٹّے۔ یہاں سے دفعان ہوتا ہے کہ لگاؤں دس جوتے کھوپڑی پر''

کرامت علی نے اب تک ایسی ذلّت آمیز جھڑکی کبھی نہیں کھائی تھی اور نہ کبھی کسی کے دروازے سے دھتکار کر بھگایا گیا تھا مگر آج کی یہ بے عزّتی اور میر صاحب کی گالی اس کے دل میں تیر و نشتر بن کر اُتریں۔ روندھا ہو کر اُٹھ گیا۔ منھ سے تو کچھ نہیں کہا لیکن جاتے جاتے سچّے دل سے میر صاحب کو بددعائیں دے گیا۔

''جاؤ سیّد صاحب۔ ہم نے تمہیں معاف کیا مگر اوپر والا تمہیں کبھی معاف نہ کرے گا۔ سن لو۔ وہ ہم غریبوں کی بھی سنتا ہے تم اس ناانصافی کی سزا ضرور پاؤ گے۔ سیّد صاحب''

تو اس طرح مایوس و نامراد لوٹ کر کرامت علی نے مجبوراً اپنے پڑوسی بدّھن کنگریا کی عورت چندا سے پینگ بڑھانی شروع کر دی جو ادھر چند مہینوں سے دھیرے دھیرے اس کی طرف ملتفت ہو رہی تھی اور بغیر کسی محنت مشقّت کے اُس کے دسترس میں تھی کہ اچانک ایک شام کو چندا خود ہی اس کے دروازے پر آ گئی اور اندر جھانک کر بولی۔

''شام ہو گئی تو چراغ کاہے نہیں جلاتے۔ اندھیارے میں کاہے پڑے ہو؟''

کرامت علی نے کھاٹ پر لیٹے لیٹے چندا کی آواز سنی، بغیر اُٹھے بولا

''تجھے میرا بڑا خیال ہے تو آ کر تو ہی جلا دے نا چراغ''

چندا اندھیرے میں کوٹھری کے اندر آ گئی۔ پیروں میں چاندی کے ہلکے ہلکے توڑوں کے گھونگھرو چُھن چُھن بول رہے تھے اُسے ایسا لگا جیسے تپتے ہوئے انگاروں پر پانی کی بوندیں چُھن چُھن گر رہی ہوں۔ لیٹے ہی لیٹے انداز نے اس نے اندھیرے میں ہاتھ بڑھایا تو چندا کی کلائی مل گئی۔

''کا کرتے ہو۔ اذان کا ٹیم ہے'' چندا دھیرے سے بولی

پھر نہ تو چندا نے کوٹھری میں چراغ جلایا نہ کرامت علی نے اذان کی آواز سنی لیکن اس اندھیرے میں جو افہام و تفہیم دونوں کے بیچ ہوئی اس کے نتیجے میں کرامت علی نے لوگوں کی مخالفت اور بدّھن و شبّو سے گالی گلوج اور ہاتھا پائی کے بعد چندا کو ہمیشہ کے لئے اپنے گھر بٹھا لیا۔

★★★

مدنی پور تھانہ کے انچارج داروغہ شیر علی جتنے موٹے تھے اُتنی ہی موٹی اُن کی عقل بھی تھی۔ ۱۹۴۲ء کے بھارت چھوڑو اندولن میں اُن کے والد الٰہ آباد کے کسی تھانے میں سب انسپکٹر

تھے۔ کانگریسیوں کے ایک پُرتشدّد جلوس کو روکنے کی کوشش میں وہ اپنی جان گنوا بیٹھے۔ ایک انگریز ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس کی سفارش پر اُن کے بیٹے شیر علی جنھوں نے تین سال فیل ہو ہو کر دسویں جماعت پاس کی تھی تھانے داری کا عہدہ پا گئے مگر پچیس سال کی ملازمت کے بعد وہ جہاں تھے وہیں کے وہیں بنے رہے، نہ تو کوئی ترقی اُنھوں نے چاہی اور نہ ملی۔ شیر علی کو شعر و شاعری کی لت لگی تھی، اُنھوں نے اپنی ملازمت میں نہ تو کوئی نمایاں کار منصبی انجام دیا اور نہ ڈھنگ کی شاعری کر سکے۔ دراصل وہ شاعری نہیں کرتے تھے بلکہ شاعری کی ٹانگ توڑتے تھے۔ حُسن و عشق، گل و بلبل، شمع و پروانہ والی شاعری تو اُنھیں آتی نہ تھی مگر اپنے اشعار میں ایسی ایسی نایاب اصطلاحات اور نادر تشبیہ و استعارات استعمال کرتے تھے کہ سننے والوں کے ہوش اُڑ جاتے۔ ہتھکڑی، جیل، سزا، خطا، چور، داروغہ، کوتوال، مجرم، قتل، پھانسی، انھیں خیالات پر وہ اپنی شاعری کا محل تعمیر کر رہے تھے۔ کم از کم تین دیوان اپنا مرتّب کر چکے تھے مگر اُنھیں چھپوانے سے اس لئے گریز کرتے تھے کہ لوگ اس طرز شاعری کا چربہ اُتار لیں گے۔

داروغہ شیر علی اپنی کرسی پر بیٹھے اس وقت کوئی تازہ غزل تیار کر رہے تھے کہ اپنے سامنے قدیر کو دیکھا جو سر پر ایک گھڑا اور ہاتھ میں ایک بوریہ لئے کھڑا تھا

''سلام وعلیکم داروغہ صاحب''

''اہا- قدیر تم'' وہ خوشی میں کِھل اُٹھے ''آؤ آؤ- بھائی اس وقت تو میں تمھیں کو یاد کر رہا تھا۔ بات یہ ہے کہ گاؤں بھر میں ایک تم ہی ہو جو شعر کو ٹھیک سے سمجھ سکتے ہو کیونکہ دسویں جماعت تک پڑھے ہو''

''مگر یہ سامان'' قدیر نے گھڑے اور بوریہ کی طرف اشارہ کیا

''یہ تو گنّے کا رس معلوم ہوتا ہے- اور یہ بوریہ میں کیا ہے؟''

''یہ شکر قند اور ہری مٹریں آپ کے لئے لایا ہوں۔''

''اِسے یہیں رکھو اور پہلے میری غزلیں سنو'' وہ بولے ''عرض کیا ہے''

''حضور والا میں ان چیزوں کو پہلے آپ کے کوارٹر میں رکھ آؤں پھر لوٹ کر آپ کا کلام سنوں گا''

''بعد میں کیوں''

''کیوں کہ اگر رس کا گھڑا ڈھنگ گیا تو میری محنت برباد ہو جائے گی۔'' قدیر نے جواب دیا۔

''اچھا جاؤ۔ جلدی سے رکھ آؤ میں تمہارے انتظار میں بیٹھا ہوں۔''

قدیر سامان لے کر داروغہ کے کوارٹر کی طرف چلا تو چلّا کر بولے

''دروازے پر پکار کے اندر جانا''

قدیر نے کوارٹر کے دروازے پر آواز دی ''میں قدیر سامان لایا ہوں- اندر آ جاؤں؟''

پردہ کی آڑ سے ایک گل چہرہ لڑکی نے جھانک کر دیکھا اور ہنس کر بولی ''اوہنک- اندر آنا منع ہے۔''

''میں نے داروغہ جی سے اجازت لے لی ہے''

''کس بات کی اجازت؟'' لڑکی نے پوچھا

''تمھیں پیار کرنے کی''

''بہت اُڑنے لگے ہو'' لڑکی نے ہنس کر دروازہ کھول دیا ''آج تمھیں سزا دوں گی''

''مگر بندہ کا قصور تو بتایئے ثریا بیگم'' قدیر نے اندر آ کر پوچھا

''کہاں غائب ہو گئے تھے- میں روزانہ تمہاری راہ دیکھتی تھی''

قدیر نے معذرت کرتے ہوئے بتایا کہ وہ بیلوں کی جوڑی خریدنے کے لئے بھدری کے میلے میں گیا تھا مگر بیل تو خرید نہ سکا البتہ اس کے لئے ایک خوبصورت تحفہ لایا ہے۔''

''ذرا دیکھوں تو وہ خوبصورت تحفہ'' ثریا نے کہا

قدیر نے جیب سے سونے کی چمپا کلی نکال کر ثریا کے گلے میں پہنانا چاہی

''ارے پہلے یہ کھڑکی تو بند کر دو- باہر سے دکھائی دیتا ہے'' وہ بولی

''ارے تو کیا میں تمہارے ابّا جان سے ڈرتا ہوں'' قدیر نے کہا ''اچھا تم ایسا کرو کہ کھڑکی کھلی رہنے دو تا کہ اگر وہ اس طرف آئیں تو میں انھیں دور ہی سے دیکھ لوں اور اپنے ٹیپ ریکارڈر میں ڈرامہ والا کیسٹ آن کر دوں''

''تم میرے ابّا جان سے نہیں ڈرتے نا؟'' وہ بولی ''ذرا صورت تو دیکھوں باگھ بہادر کی''

''سچ پوچھو تو میں ان کی شاعری سے ڈرتا ہوں یعنی اگر وہ سچ مچ کسی کو سزا دینا چاہیں تو اُسے اپنی غزلیں سنانا شروع کر دیں بس کباڑا ہو جائے گا اس کا''

''پہلے میری بات سنو'' ثریا نے کہا ''اگر واقعی تم آسانی کے ساتھ مجھ تک پہونچنا چاہتے ہو تو ابّا جان کی غزلوں میں بھرپور دلچسپی لینا شروع کر دو، اُن سے بھاگو مت''

''ارے واہ!'' قدیر ہنسا ''یعنی ابا جان تو ابا جان اُن کی دختر نیک اختر بھی باپ کی لنگڑی لولی شاعری کا پرچار کرنے لگیں۔''

''یہ پرچار نہیں جناب والا- آپ کے لئے ایک آسان طریقہ بتا رہی ہوں۔''

''اچھا اگر میں کسی رات تم سے ملنے کے لئے اس کھڑکی کے نیچے آ کر چھپ جاؤں اور اتفاق سے کوئی سپاہی مجھے کھڑکی کے نیچے بیٹھا دیکھ لے تو کیا میں پٹائی سے بچ سکتا ہوں۔''

''ہاں'' ثریا نے کہا ''تم کہہ دینا میں داروغہ جی کا کلام سننے آیا ہوں چوری کرنے نہیں آیا''

''اور ابّا جان اگر پوچھ بیٹھے کہ بیٹا کب میں نے تمھیں بلایا تھا تو؟''

''تو ایسا کرو- کہ تم ابّا جان سے اپنے لئے شعر سننے کا پرمانٹ دعوت نامہ حاصل کر لو۔ جب

پکڑے جاؤ کہہ دینا ابّا حضور میں تو آپ کی غزل سننے آیا تھا۔''

''ارے واہ ثریا بیگم'' قدیر نے کہا ''جواب نہیں تمہاری سوجھ بوجھ کا۔ اچھا اب ذرا آگے تشریف لائیے تو بندہ یہ چمپا کلی حضور کے گلے میں اپنے ہاتھوں سے پہنا دے۔''

عین اس وقت جب قدیر ثریا کے گلے میں چمپا کلی پہنا رہا تھا اس نے کمرے کی شلف پر ایک خوبصورت چوڑے روپہلے فریم کے اندر جس عورت کی تصویر دیکھی وہ یقیناً زرّیں کے سوا کسی اور کی نہیں تھی مگر اس بارے میں اُسے فوراً ہی ثریا سے کچھ پوچھنے کا موقع اس لئے نہ مل سکا کیوں کہ باہر داروغہ شیر علی دروازہ پیٹ پیٹ کر چنگھاڑ رہے تھے۔

''ثریا کی بچی۔ جلدی دروازہ کھول''

بات یہ ہوئی کہ اِدھر تو داروغہ کی صاحبزادی قدیر سے پیار و محبت کی باتوں میں لگی تھیں اور اسی بیچ تھانے کا ایک بیوقوف سپاہی گنپت رام داروغہ شیر علی کو رپورٹ دینے پہونچ گیا

''حضور سچ کہتا ہوں۔ میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے۔ وہ آدمی حضور کی برائی بھی کر رہا تھا اور بٹیا رانی سے... ہی ہی ہی... معاف کیجئے گا۔ پریم شریم کی باتیں بھی...''

''چوپ۔ خبر دار'' داروغہ جی نے ڈانٹا

''چپ ہو گیا۔ بالکل چپ ہو گیا۔''

''تم نے اُسے گرفتار کیوں نہیں کیا؟''

''غلطی ہو گئی'' گنپت بولا ''میں ابھی اس کو گرفتار کرنے جاتا ہوں''

''نہیں۔ اب میں خود جاؤں گا'' اُنھوں نے پستول سنبھالا ''سالا بچ کے کہاں جائے گا''

''حضور میں بھی آؤں آپ کے ساتھ؟''

''نہیں۔ تم یہیں میری جگہ پر بیٹھو۔''

داروغہ شیر علی اپنے کوارٹر کی کھڑکی کے نیچے چپ چاپ بیٹھ گئے۔ کھڑکی کے شیشے لگے پلّے بند تھے اور اندر سے آواز آ رہی تھی ''میں سمجھ گئی۔ تمہیں مجھ سے کوئی محبت نہیں''

''جانِ من۔ ایسا مت کہو۔ میں تو تمہاری محبت میں دن رات دیوانوں کی طرح ٹھوکریں کھاتا بھٹکتا پھر رہا ہوں آج اتنے دنوں بعد تم ملی ہو تو دو منٹ ہنسی خوشی سے باتوں کے بجائے ناراض ہو رہی ہو''

''اگر تم سچ مچ مجھ سے پیار کرتے ہو تو ابھی اسی وقت مجھے اپنے ساتھ لے چلو''

''مگر ڈیر۔ تمہارے والد۔''

داروغہ شیر علی نے برآمدہ کے اندر جا کر کمرے کا دروازہ پیٹ ڈالا

''ثریا کی بچّی۔ کھول دروازہ''

''کون ہے؟'' اندر سے ثریا کی آواز آئی

''تیرا باپ۔ جلدی کھولو دروازہ'' شیر علی نے ڈپٹ کر کہا

ثریا نے جھٹ دروازہ کھول دیا اور بڑی حیرت سے باپ کی طرف دیکھنے لگی۔ الماری پر رکھے ہوئے ٹو اِن ون سے اب بھی آواز آ رہی تھی

''میرے باپ کو کچھ نہ کہو۔ میں کسی طرح اُنھیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔ وہ پیروں سے معذور ہیں اور ان کو میرے سہارے کی ضرورت ہے۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ وہ بھی میرے ساتھ رہ سکتے ہیں میں نے مان لی تمہاری بات''

شیر علی کو جو غصّہ آیا تھا اُسے ناکامی کی خفّت اور اپنی اکلوتی بیٹی پر شک کرنے کی شرمندگی نے بالکل دور کر دیا۔ اُنھوں نے دبی زبان سے پوچھا

''قدیر یہاں آیا تھا۔ وہ سامان رکھ کر کہاں چلا گیا؟''

''مجھے کیا معلوم۔ آپ ہی کے پاس گئے ہوں گے''

''اچھا ٹھیک ہے۔ مگر بیٹی تم یہ سب واہیات ڈرامے نہ سنا کرو''

داروغہ شیر علی کے اُٹھ کر جاتے ہی قدیر دوسری طرف سے گھوم کر ان کے کمرے میں پہونچ گیا تھا وہاں گنپت رام سپاہی داروغہ والی کرسی پر براجمان تھے۔

''داروغہ جی کہاں گئے؟'' قدیر نے آتے ہی گنپت رام سے پوچھا

''وہ۔ وہ تو تمہیں گولی مارنے گئے ہیں۔''

''کاہے بھیّا۔ کیوں مذاق کرتے ہو'' قدیر ہنس کر بولا

''ہنسو ہنسو... خوب ہنسو'' گنپت نے کہا ''آج تو تمہاری لہاش گرے گی یہاں پر''

''تمہاری لاش گرے گی'' قدیر نے کہا

''ہم اس ٹیم یہاں کے تھانہ انچارج ہیں'' وہ مونچھوں پر تاؤ دے کر بولا ''اور تمہیں گرفتار کر کے اسی دم حوالات میں ڈال سکتے ہیں۔''

''کس جرم میں حضور داروغہ جی۔ کیا کیا ہے میں نے؟''

''تم نے داروغا کی لونڈیا سے چھیڑ چھاڑ کی ہے۔ کہہ دو کہ جھوٹ ہے''

''بالکل جھوٹ ہے'' داروغہ شیر علی اندر آ کر گرجا ''ابے او چمگادڑ کی اولاد یہ تو کیسی بے سر پیر کی اُڑا رہا ہے۔ ابے وہ تو ٹیپ بجا کر ناٹک سن رہی تھی اور تو نے یہاں آ کر فضول باتیں گڑھ کر سنا دیں۔ ہٹ جا میری کرسی پر سے۔''

''کیا بات ہوئی داروغہ جی؟'' قدیر نے پوچھا

''بات یہ ہوئی - کہ تم کہاں مر گئے تھے پہلے یہ بتاؤ'' شیر علی نے کہا ''میں گھنٹے بھر سے تمہاری راہ دیکھ رہا تھا۔ چلو بیٹھ جاؤ اس بینچ پر ابھی مجھے کئی غزلیں سنانی ہیں۔''

''ہاں ہاں سنایئے - اسی لئے تو میں آیا ہوں''

شیر علی نے میز کی دراز سے اپنی نوٹ بک نکالی پھر چشمہ نکالا پھر دانت نکال کر بولے

''بڑی کراری غزل ہے سنو''

''میرے منہ میں پہلے ہی سے کڑاکے دار ریوڑیوں کا مزہ آ گیا''

''اچھا اچھا - بہت مت بکو - سنو - عرض کیا ہے''

''عرض کیا ہے'' قدیر نے دہرایا

''افّوہ - یار میں نے عرض کیا ہے۔ ع جس نے آنکھ آپ سے لڑائی ہے۔ کیا سمجھے؟

قدیر نے بلند آواز سے مصرعہ دہرایا ''جس نے آنکھ آپ سے لڑائی ہے۔ کیا سمجھے''

شیر علی نے پھر پڑھا ''جس نے آنکھ آپ سے لڑائی ہے - اس کی سرکار سے لڑائی ہے''

''واہ واہ - سبحان اللہ - مگر قبلہ اس میں ردیف کیا ہے اور قافیہ کیا ہے''

''تنقید نہیں - آگے سنو''

''ارشاد''

''نیند آتی نہیں تھی پہرے پر - اب تو سولی پہ نیند آئی ہے''

''ارے واہ - ذرا ٹھہریئے ٹھہریئے اس کو ٹھیک سے سمجھ لینے دیجئے''

''ہے نا اونچا شعر؟ اچھا آگے سنو - عرض کیا ہے''

ہر گلے میں ہے طوق اور زنجیر - ہتھکڑی کاسۂ گدائی ہے

''اس شعر پر تو آپ کو ترقی ملنی چاہئے''

''کیوں کیوں؟

''بڑا محکمہ جاتی شعر ہے - سبحان اللہ''

''اچھا اچھا - اب یہ شعر سنو۔ بہت جم کے کہا ہے''

''ارشاد''

''نہ تو کھٹمل نہ چارپائی ہے - انھوں نے نیا مصرعہ پڑھا

''اچھا! کھٹمل؟'' قدیر ہنس پڑا ''میر صاحب کو ضرور سناؤں گا یہ شعر''

''خبردار قدیر - یہ سب مت کرنا - پورا شعر سنو''

نہ تو کھٹمل نہ چارپائی ہے - قید میں کیسی پارسائی ہے

قدیر ایک دم کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا ''آپ کی کرسی میں کھٹمل معلوم ہوتے ہیں''

''بیٹھو بیٹھو'' وہ بولے

قدیر ان کے کان میں کھُس پھُس کرنے لگا

''افّوہ - اچھا جاؤ بھائی - میرے کوارٹرس چلے جاؤ''

قدیر وہاں سے اٹھ کر گیا تو پھر لوٹ کر نہ آیا۔

دو تین دنوں تک قدیر کو دو باتوں کی بڑی فکر رہی۔ ایک تو یہ کہ ماں کی تصویر داروغہ شیر علی کے گھر میں کیوں لگی تھی۔ دوسرے یہ کہ اس کی چھوٹی بہن لاڈلی کی شادی میر صاحب کی مرضی و رضامندی کے بغیر کیوں نہیں ہو سکتی۔ امّاں ایسا کیوں کہتی ہیں۔ وہ کون سی بات ہے جو اماں بتا نہیں سکتی یا بتانا نہیں چاہتی۔ پھر میر صاحب ایسا کیوں کہتے ہیں کہ وہ لاڈلی کا بیاہ اپنی مرضی سے کریں گے۔ آخر کیوں۔ کیا ہم سب ان کے حکم کے غلام ہیں۔ ایک رات تو یہی سب سوچ سوچ کر اسے بڑی دیر تک نیند نہیں آئی۔ سوچتا رہا۔ سوچتا رہا۔ آخر عاجز آ کر اس نے ماں کو جگا ہی لیا

''کیا بات ہے قدیر۔ کس لئے جگایا ہے؟'' ماں نے پوچھا

قدیر نے بڑی سنجیدگی اور ادب کے ساتھ پوچھا ''کیا تمہاری کوئی اور بہن بھی تھی ماں؟''

''ہاں۔ ایک بڑی بہن تھی جو تمہارے خالو کرامت علی کو بیاہی تھی''

''اس کے علاوہ کوئی چھوٹی بہن بھی تھی؟''

''نہیں'' زرّیں نے جلدی سے کہا ''بس ہم دو ہی بہنیں تھیں۔''

زرّیں اتنا کہہ کر پھر سونے والی تھی کہ قدیر نے ایک اور سوال پوچھا

''امّاں - کیا لاڈلی میر صاحب کی بیٹی ہے؟''

جوان بیٹے نے اچانک بڑا ٹیڑھا سوال پوچھا تھا کچھ دیر تو زرّیں خاموش رہی پھر بولی

''تم نے یہ سوال کیوں پوچھا قدیر؟

قدیر اپنی غلطی محسوس کر کے چپ ہو گیا۔ اُس نے سوچا اسے ماں سے یہ سوال نہیں کرنا چاہئے تھا مگر قدیر کی خاموشی دیکھ کر زرّیں خود ہی بولی ''لاڈلی تیری سگی بہن ہے''

ماں کے جواب سے قدیر پوری طرح مطمئن تو نہیں ہوا مگر یہ سوچ کر چپ ہو گیا کہ اس بارے میں اس کا کچھ سوچنا بے کار ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ دنیا میں ہر فرد کی صحیح ولدیت کی نشان دہی صرف اس کی ماں کر سکتی ہے۔ اب اگر ماں کے کہنے کے مطابق لاڈلی اس کی سگی بہن ہے تو ضرور ہو گی۔

دوسرے دن قدیر میر صاحب کے پاس گیا وہ فجر کی نماز سے فارغ ہو کر صبح کا ناشتہ کر رہے تھے۔ قدیر ان کی مسہری کے پائنتی بیٹھ گیا

''میاں آپ سے ایک بات کہنی ہے'' وہ ڈرتے ڈرتے بولا

میر صاحب کے منہ میں تر بتر حلوے پراٹھے کا دبیز لقمہ ٹھنسا تھا اس لئے کچھ بولنے کے بجائے انھوں نے قدیر کی طرف دیکھ کر صرف ''ہوں'' کہا۔ یعنی بولو کیا کہنا ہے

''میاں- لاڈو کا نکاح کرنا ہے'' قدیر نے کہا

اس اطلاع پر میر صاحب نے پہلے ایک بڑا چمچہ بھر کے حلوہ اپنے منہہ میں ڈالا پھر ہونٹوں پر جھولتی ہوی مونچھوں کو انگلیوں سے ادھر اُدھر برابر کیا اور بڑی بڑی آنکھیں نکال کر بولے

''تو کرو- پوچھنا کیا ہے''

''آپ کی اجازت چاہئے میاں'' قدیر بولا ''آپ ہاں کردیں تو.....''

''تو؟''

قدیر میر صاحب کے پینترے دیکھ کر سہم گیا مگر ہکلاتا ہوا بولا ''وہ شبیر ہے نا میاں۔ وہی جس کی جوتوں کی دوکان پریڈ یا بازار میں ہے۔ اچھا لڑکا ہے''

میر صاحب نے صرف سنا اور جلدی جلدی حلوے کی طشتری انگلی سے چاٹنے لگے۔ قدیر سمجھا شاید وہ لڑکے کے بارے میں دل ہی دل میں کچھ سوچ بچار کر رہے ہیں اس لئے اس نے شبیر کی ایک آدھ خوبیاں اور بتانا چاہیں

''بانس منڈی میں اس نے اپنا گھر بھی بنوالیا ہے۔''

''ہوں''

''لاڈلی اس کے ساتھ خوش رہے گی''

''ہوں''

''میاں آپ اجازت دے دیجئے'' قدیر نے التجا کی

''دیتا ہوں'' کہہ کر میر صاحب ناشتہ کی چوکی سے اٹھے جھک کر اپنا ناگرہ جوتا اٹھایا اور بغیر کچھ کہے سنے قدیر کی پیٹھ پر ایک ہاتھ جڑ دیا

قدیر میر صاحب سے مار کھا کر چپ چاپ چلا گیا اور جاکر ماں سے شکایت کی ماں نے سمجھایا

''جانے دو قدیر- بڑوں کی بات کا برا نہیں مانتے۔ وہ تمہارے باپ کی جگہ ہیں۔''

''باپ کی جگہ ہیں'' وہ زیر لب بدبدا کر خاموش ہو گیا

میر صاحب نے قدیر کو مار تو ضرور دیا مگر بعد میں پچھتائے کہ ناحق غصہ میں آکر لڑکے کو مارا- جوان خون ہے- بے عزتی کا احساس بھی ہوگا- کہیں غصہ میں کچھ کر نہ بیٹھے۔

پھر آخر وہ لاڈلی کا بھائی بھی تو ہے۔ اُسے اگر اپنی بہن کی شادی کا خیال ہے تو اس میں کیا

برائی ہے۔ خود انھیں بھی اس کے بیاہ کی فکر کرنی چاہیے آخر وہ انھیں کا گوشت پوست تو ہے۔ میر صاحب انھیں خیالات میں گم سم بیٹھے تھے کہ سامنے سے لاڈلی کتابیں لئے گذری۔ میر صاحب نے نظر اٹھا کر دیکھا سترّہ برس کی نرم و نازک گلاب کی پنکھڑی کی طرح حسین و شاداب۔ سیاہ لمبے لمبے بال۔ اور ان ظاہری خوبیوں کے ساتھ ساتھ بے حد شوخ و چنچل۔ شاید آج پہلی بار میر صاحب نے اسے نظر بھر کے دیکھا تھا

''لاڈلی- بٹی ذرا یہاں آنا'' انھوں نے آواز دی

لاڈلی ان کے قریب آئی تو میر صاحب اس پر مشفقانہ نظر ڈال کر بولے

''کہاں جارہی ہو؟''

''شاداب کے یہاں پڑھنے جارہی ہوں'' وہ بولی ''آپ کو کوئی کام ہو تو بتایئے۔''

''ہاں کام ہے'' وہ ایک لمحہ رک کر بولے'' کل تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔ اور اب شاداب کے یہاں کی پڑھائی تمہیں ختم کرنی ہوگی''

''کہاں چلنا ہے؟'' وہ گھبرا کر بولی ''پڑھائی کیوں ختم کرنی ہے۔''

''ایسا ہے'' میر صاحب نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا ''کہ اب تم کو امّاں بیگم کے ساتھ جائس میں رہنا ہے۔ وہیں پڑھنا لکھنا۔ دیکھو نا وہ بے چاری اتنی بڑی حویلی میں اکیلی ہیں۔ اور اکیلے میں ان کا دل گھبراتا ہے۔ اس لئے میں نے طے کیا ہے کہ تمہیں جائس بھیج دوں۔''

''اور امّاں؟'' لاڈلی نے پوچھا

''وہ یہیں رہیں گی ہم لوگوں کے ساتھ''

''میں جائس وائس نہ جاؤں گی'' اس نے ضد کی ''میں بھی یہیں رہوں گی''

''ناسمجھی کی باتیں نہ کرو بٹی'' میر صاحب نے سمجھایا ''تم ہمیشہ کے لئے وہاں تھوڑی جارہی ہو۔ بس تھوڑے دنوں کے لئے امّاں بیگم نے بلوایا ہے۔ جب تمہارا گھر بس جائے گا تو جہاں کی ہو وہاں چلی جانا۔

''کیا بس جائے گا- کہاں چلی جاؤں گی؟''

''ارے جب تیرا بیاہ ہو جائے گا''

''نہیں نہیں- میں نہ جاؤں گی۔ وہاں میرا جی گھبرائے گا'' لاڈلی نے کہا

''بالکل نہیں'' وہ بولے ''وہاں تو تمہیں بہت سی سہیلیاں مل جائیں گی۔ بس تم تیاری کرلو''

لاڈلی کا منہہ اتر گیا۔ روندھی ہو کر ماں کے پاس جانے لگی

''اپنی ماں کو بتا دینا کہ کل صبح والی گاڑی سے جانا ہے'' میر صاحب نے اسے پکار کر کہا

لاڈلی نے رو رو کر ماں کو میر صاحب کے پروگرام سے مطلع کیا۔ قدیر اس سے پہلے ہی میر

صاحب سے مار کھا چکا تھا اب لاڈلی کے بہتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھ کر تڑپ اٹھا ماں سے بولا

''امّاں- میں تمہارا لحاظ کر جاتا ہوں نہیں تو میاں کو ان کی اصلیت سمجھا دیتا۔ آخر انھوں نے ہمیں سمجھا کیا ہے ہم ان کی رعیّت ہیں ان کے بسے ٹکے ہیں یا ان کے ٹکڑوں پر پل رہے ہیں۔''

''خبردار قدیر'' زرّیں نے کہا ''اب اور آگے کچھ منہ سے کہا تو میں بہت برا مانوں گی۔''

''ہاں تم تو ضرور برا مانو گی'' وہ بولا ''مانو برا۔ مگر مجھے ان سے کوئی سروکار نہیں وہ میرے اتنی سی بات پوچھ لینے پر کہ لاڈو کی شادی کرنا ہے اسے یہاں سے ہٹائے دے رہے ہیں۔''

میر صاحب دوسری منزل پر اپنے کمرے میں جانے کے لئے دالان سے نکل کر صحن میں آ گئے قدیر جو ابھی میر صاحب کے خلاف انگارے اگل رہا تھا ایک دم خاموش ہو گیا میر صاحب کچھ بولے بغیر کوٹھے پر چلے گئے ان کے جاتے ہی قدیر پھر بولا

''بہت واہیات آدمی ہے یہ میر صاحب کا بچہ''

لاڈلی روئے چلی جا رہی تھی زرّیں نے اُسے لپٹا کر کہا ''ارے میں تمہیں بہت جلدی بلالوں گی لاڈو''

''میں تمہیں جلدی جلدی خط لکھا کروں گا لاڈو'' قدیر نے کہا

کسی طرف سے سہارا نہ پا کر لاڈلی پھر ماں کے شانے پر سر رکھ کر رونے لگی

''تم لوگ مجھے بہلا رہے ہو'' وہ بولی ''میں اب وہاں سے نہ آپاؤں گی''

''ایسا نہ سوچو۔ ہمیں بھی تمہارے جانے کا دکھ ہے۔'' ماں نے کہا

قدیر نے لاڈلی کو اپنے پاس بلایا اور کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر سونے کا بسکٹ نکالا اور چپکے سے لاڈلی کو دے کر بولا ''یہ سونے کا بسکٹ تم اپنے پاس رکھ لو''

لاڈلی نے سونے کا بسکٹ لے کر غور سے دیکھا پھر خوشی خوشی اُسے اپنے بکس میں رکھنے لے جا رہی تھی کہ میر صاحب پھر زینے سے اتر کر صحن میں آ گئے اور زرّیں سے مخاطب ہو کر بولے

''سنو جی- لاڈلی کا سب سامان کپڑے لتے وغیرہ ٹھیک سے بکس میں رکھ دینا۔ اور اس کے گہنے بھی سنبھال کر بکس میں رکھ دینا۔ کل صبح وہ میرے ساتھ جائے گی''

یہ حکم دے کر میر صاحب نے لاڈلی پر نظر ڈالی تو اس کے ہاتھ میں سونے کا بسکٹ دکھائی دیا

''یہ کیا ہے؟'' انھوں نے سوال کیا

لاڈلی نے بغیر کچھ کہے ہتھیلی کھول کر بسکٹ اُن کے سامنے کر دیا

''یہ کہاں سے ملا؟''

''بھیّا میرے لئے لائے ہیں''

میر صاحب نے بسکٹ کو الٹ پلٹ کر دیکھا پھر بغیر کچھ بولے لاڈلی کو واپس کر دیا

دوسری صبح کو میر صاحب لاڈلی کو اپنی سیدانی بی کی خدمت میں پہونچانے کے لئے مدنی پور سے جائس چلے گئے۔

★★★

روشن کو کرامت علی کے گھر آئے ہوئے ایک مہینہ سے اوپر ہو گیا تھا۔ چندا بہت خوش تھی اور ہر دم اس پر صدقے واری جاتی تھی اس نے کرامت سے کہہ کر روشن کے لئے بازار سے خوبصورت اور نئے ڈیزائنوں کے فراک خرید دا دیئے۔ ایک روز روشن اپنے گھر کے سامنے ایک بیل گاڑی پر بیٹھی عیدو گدّی کے لڑکے خیراتی سے باتیں کر رہی تھی۔ اس کی رنگین اور چمکدار نئی فراک دیکھ کر خیراتی بہت خوش ہوا اور اپنی جیب میں بھری ہوئی کچھ بیریں روشن کو دیں

تیری فراک تو بہت اچھی ہے رے۔ کہاں سے پایا؟''

''بابا خرید کر لائے ہیں'' وہ بولی ''تین فراک لائے ہیں۔ دور کھی ہیں۔''

''تو جب مجھ سے باتیں کرتی ہے نا تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے''

''تمہاری بیریں بہت میٹھی ہیں۔ کہاں سے لائے خیراتی؟'' روشن نے پوچھا

''یہ تو نور میاں کی پھلواری سے توڑی ہیں۔ تم چلو تو اور توڑ لائیں''

''نہیں نہیں- میری فراک گندی ہو جائے گی''

خیراتی دس گیارہ سال کا گٹھے بدن اور گندمی رنگت والا ایک سیدھا سا لڑکا تھا۔ اس کے باپ عیدو کے پاس دو مرّا بھینسیں اور ایک گائے تھی جس کی آمدنی سے اس کے کنبے کی روٹی چلتی تھی۔ عیدو اس کے علاوہ بھی بہت سے کام کرتا تھا مثلاً کریم ڈفالی کے ساتھ شادی بیاہ میں ڈھول تاشہ بجانا۔ بھُسّن فقیر کے ساتھ گورکنی کرنا اور بدلو کے بیمار ہو جانے پر کبھی کبھی اس کا یکّہ چلانا۔ مگر اس کے پانچ بچوں میں صرف خیراتی ایسا تھا جو اپنے کنُم کی روایات کے برخلاف اسکول جانے کی علّت میں گرفتار تھا اگرچہ محلّہ کے سمجھ دار بڑے بوڑھوں نے عیدو کو بہت سمجھایا کہ اپنے لونڈے کو پڑھائی لکھائی جیسے بے مصرف کام میں وقت ضائع کرنے سے منع کرے مگر عیدو نے نہ تو خیراتی کو اسکول جانے سے روکا اور نہ اس نے اسکول جانا چھوڑا۔

ایک روز خیراتی کسی پھلواری سے خوب بڑے بڑے امرود توڑ لایا اور روشن کو دینے کے بہانے چندا کے پاس جا کر بولا

''چندا خالہ تمہارے لئے امرود لایا ہوں''

''چل چل- تو مجھے کیا دے گا'' وہ بولی ''میں سمجھتی نہیں کیا۔تو روشن کے لئے لایا ہے''

سچ کہتا ہوں خالہ۔تمہاری قسم۔ یہ میں تمہارے لیے لا ہوں'' خیراتی نے کہا ''ارے خالہ تم نہیں جانتیں کہ میں تمہیں کتنا چاہتا ہوں۔ ابّا کہتے تھے تم نے مجھے بچپن میں بہت کھلایا ہے۔لو خالہ یہ بڑا والا امرود تم لو۔ یہ بہت میٹھا ہے۔''

''اچھالا ایک مجھے دے دے'' چندا بولی ''ہاں سچ ہے میں نے تجھے گود میں کھلایا ہے۔ارے میں تو اب بھی تجھے بہت چاہتی ہوں۔ تجھے تو میں نے اپنی اولاد ہی جان کر پالا ہے تیری ماں مجھے دے کر کھیت پر چلی جاتی تھی۔ یہ سب تجھے کہاں یاد ہوگا تو تو بڑا ہو کر نالائق ہو گیا رے''

''اور خالہ بٹّن چاچی کہتی تھیں کہ پہلے تم نے بدّھن چچا سے بیاہ کیا تھا پھر شبّو چچا سے کیا پھر کرامت خالو کے گھر آ گئیں- یہ سب سچ ہے؟''

''ارے وہ خود ہی چھٹی چھنال ہے کل موہی''

''ایک بات مانو گی خالہ؟''

''پہلے بتاؤ''

''روشن کا نام اسکول میں لکھا دو''

''کیوں لکھا دوں- تیری طرح وہ بھی کسی کام کی نہ رہ جائے''

''خالہ پڑھنا لکھنا تو اچھی بات ہوتی ہے۔''

''اور بھی بہت سے کام اچھے ہوتے ہیں''

''جیسے چار چار مردوں سے بیاہ کرنا''

''اے حرامی مُوت- جاتا ہے کہ لگاؤں ایک ڈنڈا''

''ارے نہیں نہیں خالہ'' وہ معافی مانگنے لگا ''میرا مطلب تھا کہ اگر روشن پڑھ لکھ لے گی تو آگے چل کر خوب پیسے کمائے گی تم لوگ مزے سے کھانا بیٹھ کر''

''ہاں مزے سے کھانا بیٹھ کر'' چندا نے طنز کیا ''پڑھ لکھ کر وہ میم صاحب بن جائے گی۔ڈپٹی بن جائے گی۔گھر بھر دے گی روپوں سے''

''اچھا خالہ تم روشن سے پوچھ لو'' خیراتی نے کہا ''کیوں روشن تو اسکول میں پڑھے گی؟''

''ہاں ہاں پڑھوں گی'' روشن خوش ہو کر بولی

''دیکھ خیراتی ایک تو تو پڑھنے لکھنے میں اپنا ٹیم برباد کر رہا ہے اب اسکو بھی بہکا رہا ہے اب اگر تو نے پڑھائی لکھائی کی بات کی تو جانتا ہے کیا کروں گی؟''

''کیا کرو گی؟''

''یہ کروں گی کہ اس کو پھٹے پرانے کپڑے پہنا کر ایک جھولی ہاتھ میں دے کر گھر سے باہر نکال دوں گی''

اس بات کو سن کر روشن نے کوٹھری کے ایک کونے میں پڑا ہوا چارپائی کا ٹوٹا پایہ اٹھایا اور چندا کے پاؤں پر دے مارا ''لاؤ جھولی'' وہ غصہ میں بولی

''ہائے مار ڈالا'' چندا پاؤں پکڑ کر چلائی

خیراتی تو چندا کی چیخ سن کر بھاگ گیا مگر روشن دونوں ہاتھ اپنی کمر پر رکھ کر بولی

''مجھے جھولی دو گی- میں بھیک مانگوں گی؟''

''جا ڈوب مر- تیرا ناس ہو جائے۔ہائے ابھی تک پاؤں جھنّا رہا ہے۔''

اس رات چندا نے روشن کے بارے میں ایک کے بعد ایک بہت سی باتیں سوچیں وہ اسکول جانے کے لئے ضد کرتی ہے اور وہ اسے اسکول بھیجنا نہیں چاہتی یوں ادھر اُدھر گھومتے رہنا بھی ٹھیک نہیں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی چاہیے۔سوچتے سوچتے وہ اس نتیجے پر پہونچی کہ ابراہیم میراثی کی عورت بٹّن سے اس بارے میں صلاح و مشورہ کرے۔

بٹّن اس محلّہ میں ایک نمبر کا چلتا پرزہ تھی ۔صورت شکل تو معمولی تھی مگر تھی بڑی پُرفن اور میراثن ہونے کی وجہ سے بڑا اچھا گلا پایا تھا۔خوب گاتی تھی خاص کر شادی بیاہ اور چھوٹی موٹی تقریبوں میں بٹّن ڈھولک لے کر گاتی تو ایک سماں بندھ جاتا جو سنتا وہ لہلوٹ ہو جاتا۔بٹّن بہت دنوں سے اس فکر میں تھی کہ روشن کو اپنی شاگردی میں لیلے اور گانا بجانا سکھائے۔اس روز صبح صبح جب وہ اپنے مکان کے چبوترے پر بیٹھی کوئیلے سے دانت مانجھ رہی تھی تو چندا اپنی کوٹھری سے نکل کر چھپر کے نیچے آ کر بیٹھ گئی جہاں صبح کی ہلکی ہلکی دلنواز دھوپ پھیل رہی تھی۔بٹّن نے اسے دیکھ کر پہلے دو تین کلیّاں پھنکیں پھر بولیں

''کا حال ہے چچّی تمہرے پاؤں کے درد کا؟''

''ارے کا بتائی بٹّن'' وہ کراہتے ہوئے بولی ''جاڑا آوا نہیں کہ ہمری جان کا مصیبت آئی''

''چچّا کہوں باہر گئے ہیں کا؟''

''ہاں - باہر گئے ہیں'' وہ بولی ''الہ آباد کے ماگھ میلہ شروع ہوئے گا ہے نا''

''ارے تو اب ایک مہینہ سے پہلے کا آئی ہیں''

''اور کا'' پھر ذرا رک کر بولی ''بٹّن چائے بنائیو تو اک دوئی گھونٹ ہم کو دیہیو۔''

تھوڑی دیر بعد بٹّن المونیوم کے میلے سے گلاس میں چندا کے لئے چائے لے آئی اور چائے دینے کے بعد تجسّسانہ نظروں سے کوٹھری کے اندر باہر دیکھنے لگی تو چندا نے بھانپ لیا کہ وہ روشن کو ڈھونڈھ رہی ہے اس لئے چائے کا ایک گھونٹ پی کر چندا نے خود ہی کہا

''ارے بٹّن - روشن کے لئے اب تم ہی کچھ بتاؤ''

''کا بتائی - تم کچھ پوچھو تو''

وہ اسکول میں پڑھنے کے بہت ضد کئے ہے اور ہم پڑھے لکھے پر بیٹھا و انہیں چاہت''

''ہوں ہوں - چچّی یہ وہی عیدو کے لونڈا خیراتیا سکھائس ہوئی''

''اور کا'' چندا نے گرم چائے میں پھونک ماری

''تو دیکھو چچی'' بٹن نے سمجھایا ''یہ پڑھے لکھے والی بات تو تمہرے بس کی ناہیں۔ اسکول کی فیس۔ کتاب کاپی قلم اور سب الّم غلّم - خرچہ بڑھی کہ ناہیں۔''

''جرور بڑھی''

''تو کہاں سے آئی یہ سب خرچا۔ کون دیہی۔ اپن اوقات بھی تو دیکھے چاہی آدمی کا''

''ٹھیک کہت ہو بٹن'' وہ بولی ''آخر پھر کو نے راہ پر لگائی لونڈیا کا''

''ای ما کا بتائی'' بٹن نے کہا ''ہمرے ذمّہ کر دیو تو چار دن میں سنگیت سکھائے دیہی۔ راگ راگنی کے ریاض۔ ڈھولک بجانا۔ ابھی تو کچی عمر ہے آگے کچھ نام کر جائی۔''

''ارے یہ تو تم بہت اچھی بات بتائیو'' اتنی دیر میں وہ چائے کا گلاس ختم کر چکی تھی۔ ذرا دیر بعد روشن باہر سے گھوم کر آئی تو چندا نے اُسے بلا کر پیار سے پوچھا

''تو پڑھے گی نا روشن؟''

''ہاں پڑھوں گی''

''ٹھیک ہے۔ میں ضرور پڑھواؤں گی''

''سچ!'' وہ خوش ہو کر اچھل پڑی ''جاتی ہوں خیراتی کو بتانے''

''اری سن تو پگلی'' چندا نے کہا ''تجھے بٹن پڑھائے گی۔''

''بٹّن!'' روشن بولی ''وہ کالی کلوٹی اس کے کپڑوں سے مہک آتی ہے۔ میں اس سے نہیں پڑھوں گی''

''اگر تو بٹّن سے نہیں پڑھے گی تو کھانا نہیں ملے گا۔''

اتنا کہہ کر چندا نے اُسے ڈھکیل کر گھر کے باہر کر دیا اور اپنے کھاٹ پر لیٹے لیٹے بٹن کو پکار کر بولی

''اری بٹن - لو روشن آ رہی ہے تمہارے پاس''

بٹّن اپنے مکان کے باہر چھپّر میں بیٹھی ریڈیو پر فلمی گانوں کا فرمائشی پروگرام سن رہی تھی چندا کی آواز سن کر پہلے ریڈیو بند کیا پھر روشن کا بازو پکڑ کر اُسے اپنے گھر کے اندر لے گئی اور چٹاپٹ اُس کی بلائیں لے کر بڑی ملائمیت سے پوچھا ''تجھے گانا آتا ہے روشن؟''

''ہاں آتا ہے''

''تو سناؤ - دیکھوں کیسا گاتی ہو تم''

''پہلے اپنی ڈھولک لاؤ تو اس پر گاؤں گی''

بٹن کھونٹی پر ٹنگی ہوئی ڈھولک اٹھا لائی اور روشن کو دے کر بولی

''یہ لو - اب سناؤ اپنا گانا''

''ہگ - پہلے تم اپنا منہ اُدھر کر لو''

بٹّن نے اس کی یہ ضد بھی پوری کر دی تو اچانک روشن نے پاس کھڑی ہوئی بکری کی سینگوں پر وہ ڈھولک دے ماری۔ ڈھولک پھوٹنے کی آواز سن کر بٹن نے یہ دلخراش منظر دیکھا تو چیخ پڑی

''ارے حرامن - یہ تو نے کیا کیا'' بٹن نے دو ہتڑ روشن کے شانے پر مارا

''مجھے کیوں مارتی ہو۔ تمہاری بکری کے سینگ مارنے سے پھوٹی ہے''

''ارے تو نے میری ڈھولک پھوڑ ڈالی کم بخت۔ ہٹ یہاں سے۔''

بٹن راٹھا کی موٹی ڈنڈی اُٹھا کر روشن کے پیچھے دوڑی اور چلا کر چندا کو پکارا

''چچّی - تمہاری چھوا نے میری ڈھولک پھوڑ ڈالی''

کسی جنّت نصیب کے چالیسویں کا فاتحہ ہوا تھا اُس کا مرغّن کھانا چندا کے لئے آیا تھا۔ روشن اس وقت بٹن کے یہاں تھی اس لئے چندا نے سوچا روشن کے واپس آنے سے پہلے پلاؤ، زردہ، شیر مال، کباب اور کھیر کا پیالہ وہ خود کھا جائے اور نان و گوشت روشن کے لئے چھوڑ دے۔ وہ خوب مزے لے لے کر پلاؤ کے نوالے غٹا غٹ نگل رہی تھی کہ روشن بٹن کے گھر سے نکل پڑی۔ چندا نے ایلومونیم کی رکابی میں رکھا مہک دار زردہ چپکے سے کھاٹ کے نیچے رکھ دیا۔ روشن اُسے کچھ کھاتا دیکھ کر دور سے بولی

''کیا کھا رہی ہو امّاں؟''

چندا نے گھی اور شوربے میں سنی ہوئی انگلیوں کو ایک ایک کر کے چاٹا پھر باقی ماندہ پلاؤ مٹی کی مڑتی میں سمیٹ کر بڑے پیار بھرے لہجے میں روشن سے بولی

''لے - یہ پلاؤ کھا لے روشن''

''ہٹ'' وہ جھوٹا پلاؤ کھانے کے تصوّر سے گھنا گئی ''میں روٹی کھاؤں گی اسے تم کھاؤ''

''اچھا کہہ کر چندا نے تنوری نان اور مٹی کے پیالے میں رکھا ہوا سالن جس کا شوربہ ٹھنڈک سے جم کر پیلا ہو گیا تھا روشن کے آگے سرکا کر بولی

''لے - جا وہاں کونے میں بیٹھ کر کھا لے''

روشن کوٹھری کے چوکھٹ پر اُکڑوں بیٹھ کر روٹی کھانے لگی تو چندا نے پوچھا

''یہ بٹّن کیوں چلاّ رہی تھی رے؟''

روشن کے منہ میں نان کا موٹا نوالہ تھا اس لئے وہ بمشکل بول سکی

''بکری نے اس کی ڈھولک میں سینگ مار کر پھوڑ دیا۔''

''ارے۔رے۔رے۔ڈھولک پھوٹ گئی؟''

''ہاں'' روشن اس سے آگے شاید کچھ اور بتاتی مگر بٹّن کو اپنے گھر سے نکلتے دیکھ کر وہ چپ ہوگئی کیوں کہ بٹّن کے ہاتھ میں راٹھے کی چھڑی تھی اور وہ چلّا رہی تھی

''تمہاری لاڈلی نے دو سو روپیہ کا نقصان کر دیا میری ڈھولک پھوڑ ڈالی۔ چچّی تم نقصان بھرو۔ میں کچھ نہیں جانتی۔''

''کیا ہوا بٹّن۔ ارے کچھ بتا بھی تو'' چندا نے پوچھا

''میں کاہے بتاؤں۔ تم خود اپنی چہیتی سے پوچھو'' بٹّن نے لڑنا شروع کر دیا اس کا شور وغل سن کر خیراتی آ گیا اور کھڑا ہو کر بٹّن کی بات سننے لگا۔

''پوچھو نا روشن کی بچی سے'' بٹّن بولی ''کاہے کو اس نے میری ڈھولک پھوڑی''

''تمہاری ڈھولک پہلے ہی سے پھوٹی تھی'' خیراتی نے دھیرے سے کہا

''کیا!'' وہ زخمی سانپ کی طرح پھنکار مار کر خیراتی پر جھپٹی۔ غصّہ اور بھی زیادہ بڑھ گیا تھا کیوں کہ خیراتی کا کہنا سن کر روشن ''کھس'' سے کر کے ہنس پڑی تھی

''رہ جا حرامی'' بٹّن بولی ''تجھے ہیضہ ہو جائے۔ مجھ پر چوٹ کرتا ہے۔''

خیراتی نے کوئی جواب نہیں دیا معصوم بنا چپ چاپ کھڑا رہا۔ بٹّن چھڑی ہلا کر بولی

''آنے دو عیدو بھائی کو۔ ایسی خبر لواؤں گی تیری کہ یاد کرے گا۔''

''ارے میں تیری ڈھولک ٹھیک کرادوں گی بٹّن'' چندا نے کہا ''جانے دے۔ نا سمجھ ہے۔''

''پھر دوسرا کوئی پھوڑ دے گا'' خیراتی نے پھر چٹکی لی اور روشن پھر ہنس پڑی بٹّن نے طیش میں آ کر ایک چھڑی خیراتی کے کولھے پر جڑ دی خیراتی منہ بنا کر جھوٹ موٹ رونے لگا ''ارے خالہ بچاؤ۔ میری بھی ڈھولک پھوٹ رہی ہے۔''

بٹّن اپنا پورا غصّہ اتارے بغیر پیر پٹختی ہوئی اپنے گھر چلی گئی تو خیراتی نے روشن کے کان میں کہا

''چل روشن۔ چل باہر کھیلا جائے۔''

★★★

میر فدا حسین لاڈلی کو اپنی سیدانی بی بی کے پاس پہونچا کر جب پھر مدنی پور واپس آئے تو وہاں ایک نیا ہنگامہ دیکھا۔ مدنی پور تھانہ کے انچارج داروغہ شیر علی قدیر کے پاس انکوائری کرنے آئے تھے۔

پولیس کو بتایا گیا تھا کہ بھدری کے ریل حادثہ میں مرنے والی شہزادی کو قدیر نے اپنی بیوی بتا کر فریب دہی کی ہے اور گورنمنٹ سے پانچ سو روپے کفن دفن کے لئے بھی وصول کئے ہیں جب کہ مرنے والی کا شوہر کوئی اور تھا جو اپنی بیوی کے ''خون بہا'' میں ملنے والی سرکاری رقم سے زیادہ اپنی بیٹی کے لئے فکرمند تھا اور اسی لئے وہ قدیر کو تلاش کرتا ہوا مدنی پور آ پہونچا تھا۔ داروغہ شیر علی کا کہنا تھا کہ چونکہ قدیر نے جان بوجھ کر بے ایمانی اور دھوکہ دھڑی سے روپے لئے ہیں اور آگے بھی روپے حاصل کرنے کی فکر میں ہے اس لئے اس پر تعزیراتِ ہند کی دفعہ ۴۲۰ لاگو ہوتی ہے۔ مگر قدیر اس بات پر اڑا تھا کہ مرنے والی عورت اس کی بیوی ہے اور اس نے کوئی بے ایمانی نہیں کی۔ قدیر کی اکڑ دیکھ کر داروغہ نے مصلحتاً تھوڑی نرمی دکھائی ''اچھا قدیر میاں'' وہ بولے ''چلو بھائی مان لیا کہ تم صحیح کہتے ہو مگر یہ تو بتادو کہ اِن صاحب کی بیٹی کہاں ہے؟'' اُنھوں نے اپنے ساتھ آئے ہوئے آدمی کی طرف اشارہ کیا ''یہ صاحب! ۔کون ہیں یہ صاحب؟'' قدیر نے کہا ''میں تو ان کو جانتا بھی نہیں۔ ان کا نام بھی مجھے نہیں معلوم پھر ان صاحب کی بیٹی کے بارے میں میں کیا بتا سکتا ہوں''

''ارے ہاں۔ تم ان کا نام کیا جانو'' وہ بولے ''یہ مسٹر عزیز بیگ ہیں۔ بنارس کے بہت بڑے بزنس میں۔ لاکھوں کا کاروبار ہے ان کا''

''ٹھیک ہے۔ مگر داروغہ جی میں ان کی بیٹی کو کیا جانوں۔ یہ آپ مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''اچھا بھائی۔ چلو یہ بھی جانے دو۔ یہ بتاؤ کہ تم اس عورت کو جانتے ہو؟''

''داروغہ شیر علی نے ہاتھ کے اشارے سے مسٹر عزیز بیگ سے ایک فوٹو مانگ کر قدیر کو دکھایا

''بالکل پہچانتا ہوں'' قدیر بولا ''یہ میری بیوی تھی جو بھدری میں ریل سے کٹ کر مری ہے''

''اور اس کی بیٹی کہاں گئی؟''

''میری کوئی بیٹی نہیں تھی اور نہ ہے'' قدیر نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا

داروغہ شیر علی کو بڑی دیر بعد غصّہ آیا ''قدیر کے بچّے۔ بس بہت ہو چکا۔ بہت نرمی دکھائی ہے میں نے۔ اب سیدھی طرح سب کچھ بتا دو نہیں تو یہ ہنٹر دیکھا ہے۔ ابے سچ کہتا ہوں اتنا ماروں گا کہ چمڑی اُدھڑ جائے گی۔''

''واہ صاحب'' قدیر بولا ''زبردستی مجھ پر برس رہے ہیں آخر کیا کیا ہے میں نے۔ کیا بتادوں آپ کو''

''تو تم ایسے نہ مانو گے'' داروغہ نے کہا ''اچھا چلو۔ گاؤں میں سے کسی کو اپنی گواہی میں لے آؤ جو یہ بتا سکے کہ یہ عورت تمہاری بیوی تھی۔''

''بہت اچھا۔ ایک نہیں بیس گواہ لاؤں گا۔''

اتنا کہہ کر قدیر اپنے گھر کے اندر آ گیا اور دو ہی منٹ بعد ایک فوٹو لے کر آ گیا۔ وہی فوٹو جو

اس نے بھدری کے میلے میں شہزادی کے ساتھ کھنچوایا تھا۔ گلے میں ہاتھ دئے اور مسکراتے ہوئے ''لیجئے دیکھئے۔ یہ ہم دونوں میاں بیوی کی فوٹو ہے۔ اب شعر موزوں ہوا کہ نہیں؟''

اب عزیز بیگ نے اپنی گردن لمبی کر کے فوٹو کو دیکھنا چاہا مگر اس سے پہلے ہی شیر علی نے فوٹو کو چیڑ پھاڑ اور ریزہ ریزہ کر کے زمین پر پھینک دیا تھا

''ارے ارے– یہ آپ نے کیا کیا؟'' قدیر نے احتجاج کیا

داروغہ شیر علی نے دانت پیستے ہوئے پہلے قدیر کا کالر تھاما پھر ہنٹر کا ہاتھ اس کے کولھے پر مارا

''بہت بقراطی آ گئی ہے۔ سالے لٹا لٹا کر ماروں گا''

قریب تھا کہ داروغہ ایک آدھ ہاتھ اور مارتا کہ اتنے میں میر فدا حسین وہاں آ گئے۔ شیر علی نے اُن کی طرف دیکھ کر بڑی ناراضگی سے کہا

''میر صاحب– اس لونڈے کو سمجھا لیجئے اگر مجھ سے زبان چلائی تو میں آپ کا بھی لحاظ نہیں کروں گا۔ بہت ماروں گا اس کو''

''آخر میں نے کون سا جرم کیا ہے جو مار رہے ہیں'' قدیر روندھا ہو کر بولا

میر فدا حسین خود نیرنگیٔ زمانہ کے مارے ہوئے تھے۔ ان کے دادا جان نے اپنے وقت میں فرنگی کپتان پولیس کو گھوڑے کی پیٹھ پر سے ٹانگ پکڑ کے گھسیٹ لیا تھا کیوں کہ وہ گھوڑے پر بیٹھا بیٹھا ان سے ہم کلام تھا اور ابّا جان نے ملک معظّم شاہ جارج پنجم کے جشن تاج پوشی پر دلّی دربار میں کرسی اور شاہی ڈنر پانے کی خوشی میں پورے قصبہ کی شاندار دعوت کی تھی مگر اب تو زمانہ ہی دوسرا تھا نہ تعلقہ رہ گیا تھا نہ رئیسی اس لئے بدلے ہوئے موقع کی نزاکت کو خوب اچھی طرح سمجھ کر وہ فوراً ہی کچھ نہ بولے پہلے اپنے مہندی سے رنگے سرخ بالوں پر بڑے تفکرانہ انداز سے ہاتھ پھیرا پھر کرتے کی جیب سے پان کی مراد آبادی ڈبیہ نکالی اخلاقاً داروغہ شیر علی کی طرف بڑھا کر اکٹھا تین بیڑے اپنے منہ میں رکھے پھر تمبا کو قوام اور پپر منٹ چاٹ کر منہ کے اندر خوب گاڑھا لعاب تیار کیا مگر کچھ بولنے کے لئے اتنے قیمتی اور لذیذ پیک کو نگل یا اُگل کر ضائع کرنے کے بجائے میر صاحب نے آگے بڑھ کر قدیر کا کان تھاما اور منہ بند کئے کئے بولے

''ہوں؟'' یعنی بول کیا معاملہ ہے

''میں آپ کو بتاتا ہوں'' شیر علی نے جلدی سے کہا ''پہلے آپ یہ بتایئے کہ اس کی شادی ہو چکی ہے'' ''ہوں'' میر صاحب نے منہ بند کئے کئے اس طرح آواز نکالی کہ ہوں کے معنی ہاں اور نا دونوں نکلیں۔ ان کی اس 'ہوں' کو سنتے ہی قدیر قوی دل ہو کر بولا

''میاں– گھر والی کے ساتھ میری جو فوٹو تھی اُسے داروغہ صاحب نے چیڑ کر پھینک دیا۔ یہ دیکھئے'' اس اطلاع پر بھی میر صاحب نے کچھ نہیں کہا بلکہ بڑی بڑی آنکھیں نکال کر داروغہ کی طرف

استفہامیہ نظروں سے اس طرح دیکھا جیسے پوچھتے ہوں ''کیوں صاحب– آپ نے ایسا کیوں کیا؟''

اس بار داروغہ نے عزیز بیگ والی فوٹو میر صاحب کو دکھا کر پوچھا

''یہی ہے اس کی عورت؟''

میر صاحب نے سر کے اشارے سے حامی بھری مگر اس بیچ قدیر دوبارہ بھاگ کر اندر گیا اور میلے والی فوٹو کی دوسری کاپی لے کر آ گیا

''یہ دیکھئے میاں– یہی فوٹو تھی جسے داروغہ جی نے پھاڑ کر پھینکا ہے کہتے ہیں یہ ان صاحب کی عورت ہے''

''میں اب سچ مچ تجھے نہیں چھوڑوں گا'' داروغہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا

اب میر صاحب کے بولنے کی باری تھی انھوں نے قریب میں لیٹے ہوئے ایک کتّے کی پیٹھ پر اپنی گاڑھی پیک پھینک کر کہا ''سنئے داروغہ جی– میں بہت دیر سے آپ کی زیادتیاں دیکھ رہا ہوں مگر خاموش ہوں۔ اب اگر آپ کو لڑکے سے کچھ اور پوچھنا ہے تو ابھی اسی وقت پوچھ لیجئے مگر بغیر وارنٹ گرفتاری کے اسے قطعی ہاتھ مت لگایئے گا۔ سمجھ گئے آپ؟''

''ٹھیک ہے۔ میں آپ دونوں سے سمجھ لوں گا۔ تحت الثریٰ میں نہ پہونچا دیا تو شیر علی نام نہیں''

داروغہ پیر پٹختا اور ہنٹر ہوا میں ہلاتا ہوا چلا گیا اور اس کے ساتھ عزیز بیگ بھی۔

''کیوں بے– یہ عورت کا کیا معاملہ ہے؟'' اب میر صاحب نے قدیر سے پوچھا

قدیر نے میر صاحب کو میلہ اور میلے میں ریل گاڑی والے حادثے کو من وعن بیان کر دیا کرامت علی کا نکاح پڑھنا اور مرنے والی عورت کی بیٹی کو کرامت علی کا اپنے ساتھ جائس لے جانا سب کچھ اُس نے میر صاحب کو بتا دیا لیکن اس نے میر صاحب کو اس بات کی بھنک نہیں دی کہ مرنے والی عورت نے اُسے سونے کا ایک بسکٹ بھی دیا تھا۔ ساری باتیں سن کر میر صاحب بولے

''یہ سب باتیں تم نے مجھے پہلے نہیں بتائیں– ایں– یعنی کہ میں تمہارا کچھ بھی نہیں ہوں اور تم آپ اوپر ہو گئے ہو۔ اب اگر کوئی قانونی گرفت آتی ہے تو چلو میاں ہے ہی ہیں بچانے کو''

''مجھ سے بھول ہو گئی میاں'' قدیر نے ندامت ظاہر کی

''اچھا خیر'' وہ بولے ''جو کچھ ہوا سو ہوا۔ اب تم کو اپنے اسی بیان پر اٹل رہنا ہے کہ وہ عورت تمہاری بیوی تھی۔ تمہارا نکاح اس کے ساتھ ہوا تھا۔ کیا سمجھے؟– اور ہاں اس کی بیٹی کا پتہ کسی کو مت بتانا– کہہ دینا مجھے نہیں معلوم۔''

رات کے سنّاٹے میں مسٹر عزیز بیگ پھر قدیر کے پاس آئے اس بار وہ اکیلے ہی آئے تھے اُنھوں نے قدیر سے عاجزی اور منّت سماجت کے ساتھ کہا

‘‘قدیر بھائی - دیکھوتم میرے چھوٹے بھائی کی طرح ہومگر میں تمہارے ہاتھ جوڑ تا ہوں تم جو کچھ بھی مانگو گے وہ میں دوں گا مگر تمہیں اللہ ورسول کا واسطہ دیتا ہوں میری بیٹی کا پتہ بتادو۔ تمہیں گورنمنٹ سے جومعاوضہ بھی ملے وہ تم لے جاؤ لیکن یہ بتادو کہ میری بیٹی کہاں ہے۔’’

قدیر کے دل میں رحم آ گیا بولا ‘‘بھائی پہلے آپ یہ بتایئے کہ صبح سے آپ نے کچھ کھایا پیا کہ نہیں۔’’

عزیز بیگ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ‘‘تم نے ٹھیک سوچا بھائی سچ مچ صبح سے میں نے کچھ نہیں کھایا صرف دو بار دوکان پر چائے پی ہے۔ مجھے یہ امید تھی کہ تم سے اپنی بیٹی کا پتہ معلوم ہو جائے گا مگر جب سے آپ نے انکار کر دیا ہے میرا کچھ کھانے پینے کو دل نہیں کرتا۔ اسی لئے ایک بار پھر تمہارے پاس امید لے کر آیا ہوں رحم کی بھیک مانگتا ہوں۔ جب تک نہ بتاؤ گے میں ایسے ہی بھوکا پیاسا رہوں گا۔’’

‘‘ٹھہریئے’’ قدیر نے کہا ‘‘جب آپ نے مجھے چھوٹا بھائی کہا ہے تو پہلے میرا کہا مان کر کھانا کھا لیجئے۔’’

یہ کہہ کر قدیر گھر کے اندر گیا۔ میر صاحب چوکی پر عشاء کی نماز پڑھ رہے تھے۔ وہ ماں سے کھانا لے کر ایک سینی پر لئے ہوئے جب دوبارہ میر صاحب کے قریب سے گذرا تو اُنھوں نے تسبیح پڑھتے پڑھتے کن انکھیوں سے قدیر کی طرف دیکھا اور پھر تسبیح میں منہمک ہو گئے۔ قدیر نے کھانے کی سینی عزیز بیگ کے آگے رکھ کر کہا ‘‘اٹھئے ہاتھ منہ دھوکر کھانا کھا لیجئے۔’’

عزیز بیگ سچ مچ بھوکے تھے بغیر زیادہ اصرار کے کھانے لگے گر دو ہی نوالہ کھانے کے بعد انھوں نے کھانے کی سینی آگے سرکا دی اور پانی کا پورا گلاس پی کر بولے

‘‘بس بھیّا قدیر- تمہارے کہنے سے اتنا کھا لیا اب بالکل جی نہیں چاہتا۔’’

‘‘دیکھئے- آپ کو میری قسم ہے ٹھیک سے کھا لیجئے۔’’

قسم کی بات سن کر عزیز بیگ نے چونک کر قدیر کی طرف دیکھا پھر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے

‘‘اپنی قسم رکھا کر مجبور کر رہے ہو تو میں بھی تمہیں اسی دانیال کی قسم دے کر پوچھتا ہوں۔ کیا وہ تمہاری بیوی تھی۔ دیکھو قدیر جھوٹ نہ بولنا مجھے سچ سچ بتادو میں پولیس کو نہ بتاؤں گا’’ قدیر کچھ سوچ کر بولا ‘‘تو اب اس بات کو قسم دے کر پوچھنے سے کیا حاصل۔ وہ میری بیوی رہی ہو چاہے آپ کی اب تو وہ اس دنیا میں رہی نہیں۔’’

عزیز بیگ دو منٹ کے لئے خاموش ہوئے اور پھر سر جھکا کر کھانا کھانے لگے قدیر سمجھا کہ بیگ صاحب اس کی بات کو سن کر لا جواب ہو گئے ہیں اس لئے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی خاطر بولا

‘‘اس کے علاوہ آپ ہم دونوں کی فوٹو بھی دیکھ چکے ہیں یقین کر لینا چاہئے۔’’

عزیز بیگ نے پانی پی کی گلاس خالی کیا پھر ہاتھ منہ دھونے کے بعد بولے ‘‘تو وہ تمہاری بیوی تھی؟’’

‘‘ہاں’’

‘‘تمہارا نکاح ہوا تھا اس کے ساتھ؟’’

‘‘بے شک ہوا تھا’’ قدیر نے جواب دیا

عزیز بیگ نے دو قدم آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا

‘‘بھیّا - میں نے تو تمہارا نمک کھا لیا اس لئے اب تمہیں اندھیرے میں نہیں رکھوں گا۔ در اصل وہ عورت جو ریل سے کٹ کر مری ہے وہ میری بیوی نہیں تھی’’

‘‘اچھا!’’ قدیر نے اظہار تعجب کیا

‘‘ہاں- اور وہ تمہاری بیوی بھی نہیں تھی۔ لیکن اگر تم اس بات پر اصرار کرتے ہو کہ وہ تمہاری بیوی تھی تو سمجھو کہ بات اب شروع ہوتی ہے۔’’

‘‘شروع ہوتی ہے- کیا مطلب؟’’ قدیر نے کہا

‘‘مطلب یہ کہ......’’ عزیز بیگ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے پھر اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد قدیر کا ہاتھ پکڑ کر بڑی راز داری سے بولے

‘‘میں یہاں وہ بات نہیں بتا سکتا کیوں کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں لیکن اگر تم میرے ساتھ سامنے نہر کے کنارے والی باغ تک چلو تو وہاں سب کچھ بتادوں گا- بالکل صحیح صحیح۔’’

‘‘آپ یہیں بتا دیجئے -کوئی ڈر کی بات نہیں ہے۔’’ قدیر نے کہا

‘‘اونہک’’ بیگ نے کہا ‘‘باغ تک چلے چلو وہاں تمہیں کچھ دکھانا بھی ہے۔’’

قدیر ان کے ساتھ باہر جانے لگا تو میر صاحب کھانستے ہوئے دالان سے نکل کر آنگن میں آ گئے

‘‘کہاں جا رہے ہو قدیر؟’’

‘‘میاں میں ابھی آتا ہوں- ذرا بیگ صاحب کے ساتھ نہر والی بغیا تک جا رہا ہوں’’

‘‘کیا کام ہے؟’’

‘‘بہت ضروری کام ہے میاں’’

‘‘جاؤ- جلدی واپس آنا’’ میر صاحب یہ کہہ کر پھر دالان میں لوٹ گئے۔

نہر والی باغ میں پہونچ کر عزیز بیگ نے قدیر سے کہا

‘‘ہاں تو یہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ وہ عورت میری بیوی نہیں تھی۔ تم پوچھو گے کہ پھر کیا تھی۔ تو سمجھ لو وہ میری نوکرانی تھی اور شادی شدہ بھی نہیں تھی۔ اب تم پوچھو گے پھر میں اس کے لئے اتنا پریشان

کیوں ہوں'' اتنا کہہ کر وہ ذرا دیر کو رکے

''ہاں یہ تو پوچھوں گا''

''دو باتوں سے پریشان ہوں'' عزیز بیگ بولے ''پہلی بات یہ کہ وہ عورت میری تجوری سے سونے کے ایک سو بسکٹ لے کر بھاگی تھی۔ ایک سو بسکٹوں کی قیمت تم جانتے ہو گے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ میری بیٹی روشن کو اپنے ساتھ لے آئی ہے۔ مجھے یہ دونوں چیزیں چاہئے۔''

اتنا کہہ کر عزیز بیگ نے قدیر کی کلائی پر اپنے مضبوط ہاتھوں کی گرفت سخت کر لی پھر دوسرا ہاتھ اُنھوں نے اپنے پینٹ کی جیب میں ڈالا تو قدیر اس ڈر سے کہ اب وہ پستول نکالنے جا رہے ہیں گھبرا کر اپنی کلائی چھڑانے لگا'' ارے ارے۔ آپ میرا ہاتھ تو چھوڑ دیئے۔''

عزیز بیگ نے جیب سے پستول کی جگہ نوٹوں کی گڈی نکالی

''یہ تم رکھ لو قدیر بھائی۔ پورے دس ہزار ہیں اگر مجھے دونوں چیزیں مل جائیں تو میں اتنی ہی رقم اور دے سکتا ہوں۔''

''قدیر کو معاملہ کی نزاکت کا احساس تو ہو گیا مگر وہ کچھ بولنے کے بجائے دم بخود کھڑا رہا

''یہ تمہاری قسمت کے روپے ہیں۔ انھیں لے لو قدیر بھائی'' عزیز بیگ نے سمجھایا

''اگر میں ان روپوں کو نہ لوں تو؟'' اس نے پوچھا

''تو بھی ٹھیک ہے'' عزیز بیگ نے کہا'' روپے لو یا نہ لو تمہاری مرضی لیکن اگر تم نے میری بیٹی روشن کا پتہ نہ بتایا تو میں تمہیں زندہ سلامت یہاں سے نہ جانے دوں گا۔ اس وقت یہاں اندھیرا ہے رات کا سنّاٹا ہے اور میرے پاس جرمنی کا بنا بغیر آواز والا پستول۔ مار کر لاش اسی نہر میں پھینک دوں گا''

عزیز بیگ دانت پر دانت بٹھائے دھیمے مگر درشت لہجہ میں بولتے گئے

''اس وقت یہاں کوئی دیکھنے والا ہے۔ نہ گواہی دینے والا۔ رہ گئے تمہارے میاں جی تو ان سے بھی جا کر ابھی نپٹے لیتا ہوں مگر پہلے تمہارا حساب چکتا کر کے''

قدیر چاروں طرف چھائے اندھیرے اور سکوت میں اپنی موت کی آہٹ پا کر کانپ اٹھا۔ کچھ بولنا چاہا مگر آواز گلے میں پھنسنے لگی۔ بمشکل بول سکا

''واہ صاحب۔ اچھا انصاف ہے آپ کا اُلٹا مجھ ہی کو پھنسانے لگے۔ دیکھئے۔ مجھے آپ کے بسکٹوں کے بارے میں کچھ پتہ نہیں''

''اور لڑکی کے بارے میں؟''

''ہاں لڑکی کے بارے میں بیشک جانتا ہوں مگر پہلے روپوں کی یہ گڈی مجھے دے دیجئے اور پھر میرے ساتھ گھر تک چلئے''

''او دیہاتی بجّو بُو'' – وہ دانت پیس کر بولے'' بہت زیادہ ہوشیاری مت دکھاؤ۔ اور اب نہ میں تمہیں یہ روپے دوں گا اور نہ گھر تک جانے دوں گا جب تک کہ مجھے لڑکی کا پتہ نہیں بتاتے'' پھر نوٹوں کی گڈی اپنے پینٹ کی جیب میں ڈال کر اُنھوں نے پستول نکال لیا

''دیکھو۔ میں تین نہیں چھ تک گنتی گنتا ہوں اس پر بھی تم نہیں بتاتے تو پوری میگزین پستول کی تمہارے شکم میں خالی کر دوں گا۔''

''اچھا۔ بتاتا ہوں۔ آپ کی بیٹی .....''

قدیر کے منہ سے اتنا ہی نکلا تھا کہ اندھیرے میں پستول چلنے کی آواز آئی۔ قدیر کی کلائی پر بیگ کے ہاتھ کی گرفت یک بیک ڈھیلی ہوگئی اور ساتھ ہی دونوں کے منہ سے چیخ نکل پڑی پھر اس کے آگے کیا ہوا قدیر کے لئے یہ سوچنے سمجھنے یا دیکھنے کا موقع نہیں تھا وہ سر پر پیر رکھ کر بھاگا اور جدھر سینگ سمائی بے تحاشہ بھاگتا چلا گیا۔ اس کو یہ بھی اندازہ نہ ہوا کہ وہ اپنے گھر کی طرف جا رہا ہے یا کسی دوسری طرف۔ بس بھاگتا گیا۔ اس سے بے پروا کہ کس نے گولی چلائی عزیز بیگ پر کیا گذری اور ان کا کیا حشر ہوا۔ بھاگتے بھاگتے جب وہ تھک کر رکا تو سامنے مدنی پور تھانے کا آہنی پھاٹک کھلا تھا۔ وہ اندر داخل ہو گیا۔

تھانہ انچارج شیر علی لیمپ کی روشنی میں کسی استاد کے دیوان سے اشعار چوری کر کے ان کی ہئیت بگاڑ رہے تھے اور اس کام میں اتنا منہمک تھے کہ انھیں اس کی آہٹ ہی نہ ملی کہ قدیر ان کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اسی محویت کے عالم میں جب اُنھوں نے قدیر کی کھانسی کی آواز سنی تو ایسا اُچھل پڑے جیسے کسی ڈاکو یا خونخوار درندے نے پیچھے سے حملہ کر دیا ہو۔

''کون ہے بے؟'' اُن کے منہ سے بے تحاشہ نکل پڑا پھر فوراً ہی بولے'' آج چھا۔ تو آپ ہیں۔ مسٹر قدیر۔ ایں! قدیر عالم ہیں کہ قدیر الزماں؟''

''میں اس لئے آیا ہوں'' قدیر نے رک رک کر کچھ کہنا چاہا کیوں کہ سانس ابھی تک پھول رہی تھی

''پہلے بیٹھو تو سہی'' شیر علی بولے'' کیا معرکتہ الآرا غزل ہوئی ہے۔ سنو گے تو پھڑک اٹھو گے''

''مم۔ میں۔ تو۔ اس وقت...''

''واہ رے شیرا'' شیر علی نے کہا'' یہ کپ کپی کیوں طاری ہے تم پر۔ یار دن میں تو اپنے میاں جان کے سامنے ماش کے آٹے کی طرح اکڑ رہے تھے اور اب اتنی جلدی مردہ چوہیا کیوں بن گئے مجھے تو لگتا ہے کوئی مرڈر کر کے آ رہے ہو''

''نہیں نہیں۔ میں نے مرڈر نہیں کیا''

''نہیں کیا تو اتنا گھگھیا کیوں رہے ہو پیارے لال۔ ارے میں تمہیں کھا جاؤں گا کیا؟۔ خیر چلو جلدی بتاؤ اس وقت رات میں یہاں کیا کرنے آئے ہو''

’’وہ مسٹر عزیز بیگ۔ جو صبح آپ کے ساتھ آئے تھے‘‘ وہ رک رک کر بولا ’’وہ۔وہ‘‘

’’جلدی بولو یار۔قتل ہو گئے کہ نہیں۔‘‘ داروغہ نے بڑی بے پروائی سے پوچھا

’’سنئے تو‘‘ قدیر بولا ’’میں نے انھیں نہیں مارا۔ اللہ پاک کی قسم کھاتا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم اندھیرے میں ان پر کسی نے گولی چلائی ہے۔‘‘

’’بھائی جب تم اللہ پاک کی قسم کھا رہے ہو تو کیسے نہ مانوں گا‘‘ داروغہ نے چٹکی لی ’’مگر یہ بتاؤ پیارے کہ ان کی لاش کہاں پر ہے۔ وہیں ہے یا ٹھکانے لگ گئی؟‘‘

’’مجھے نہیں معلوم۔ اندھیرے میں میں نے کچھ نہیں دیکھا۔ آپ چل کر خود دیکھ لیں۔‘‘

’’ہاں ہاں ضرور چلوں گا۔ ابھی چلتا ہوں۔‘‘ شیر علی نے کہا ’’یہ جاڑے کی ٹھنڈی رات۔ مگر پہلے میں اپنی غزل سناؤں گا۔ پھر تمہیں حوالات میں بند کروں گا۔ پھر موقع واردات پر پہونچوں گا۔‘‘ اس کے بعد شیر علی نے منشی جی کو آواز دے کر حکم دیا ’’منشی جی۔ چلئے ان کی ایف آئی آر لکھئے۔‘‘ پھر قدیر سے مخاطب ہو کر کہا ’’فسٹ کلاس مسہری تمہارے لئے حوالات میں لگوائے دیتا ہوں۔‘‘ ایک سپاہی جھٹ آگے بڑھا اور قدیر کی جامہ تلاشی لینے لگا۔ شیر علی مسکرا کر شعر پڑھنے لگے

’’ارے پکڑے جاتے ہیں دروغہ کے لکھے پر ناحق۔اس کا دوسرا مصرعہ تم بتاؤ قدیر‘‘

سپاہی قدیر کی تلاشی لے کر بولا ’’ڈھائی روپے جیب سے نکلے ہیں۔‘‘

’’بس؟‘‘ شیر علی کھیس نکال کر بولے ’’اماں بس؟۔برخوردار اور روپے کہاں چھپایا ہے؟‘‘

’’میرے پاس اور روپے نہیں ہیں‘‘

’’ہاں بالکل نہیں ہیں‘‘ داروغہ نے کہا ’’مگر بیٹا عزیز بیگ کے روپے کیا تمہارے چوتڑ میں گھس گئے۔‘‘ دیکھو میں نے اچھے اچھوں کو سیدھا کر دیا ہے اور تمہیں دس منٹ کا موقع دیتا ہوں سب اُگل دو نہیں تو حلق میں ہنٹر گھسیٹر کر سب کھایا پیا اگلوا لیں گے ہم۔‘‘

’’میں نے ان کے روپے نہیں لئے‘‘ قدیر گڑگڑایا

’’اپنی اماں کی قسم کھاؤ۔اپنی مادر گرامی کی۔ کھاؤ کھاؤ۔ چھوڑ دوں گا اللہ قسم‘‘ قدیر نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ سوچنے لگا یہ ماں کی قسم کیوں کھلا رہے ہیں۔ اللہ رسول قرآن کی قسم کیوں نہیں دلاتے۔ اس کی خاموشی دیکھ کر مسٹر شیر علی نے حولدار کو آواز دی ’’حولدار گنپت رام۔ ذرا ان صاحب کو جھوٹ سچ ناپنے والی مشین میں گھسیٹر کر دیکھو تو۔ جاؤ بیٹا قدیر۔ چُچ چُچ۔ جاؤ پنوالو۔‘‘

حولدار گنپت رام قدیر کی قمیص کا کالر پیچھے سے پکڑ کر گھسیٹ لے گیا اور حوالات میں ڈھکیلنے کے بعد بولا ’’بیٹا اس دن تو بچ کر نکل گئے تھے پر آج تمہاری لہاش ضرور کرے گی۔‘‘

’’میں نے کون سا جرم کیا ہے حولدار بھائی؟‘‘

’’سالے۔ دروغہ جی کی لونڈیا پر ڈورے ڈالتا ہے پھر پوچھتا ہے کون سا جرم۔ ارے مجھے تعزیراتِ ہند کی دفعہ تو معلوم نہیں۔ میں ڈنڈا قانون جانتا ہوں۔ ڈنڈا۔ ہنڈا‘‘

’’اللہ کرے آپ ڈی آئی جی ہو جائیں۔‘‘ قدیر نے مسکا لگایا

’’پھر تو ہو چکا ہے‘‘ وہ تالا بند کرتے ہوئے بولا ’’بھگوان کی دعا مانگتے تو شاید ہو بھی جاتا‘‘

’’بھگوان آپ کو انسپکٹر جنرل آف پولس بنا دیں‘‘

’’ہائے رام۔ایک بار پھر بولو۔ مزہ آ گیا‘‘

’’بھگوان آپ کو چوکیدار بنا دیں‘‘ قدیر نے کہا

’’کیا کہا؟۔ابے۔ابے‘‘ اتنے میں داروغہ شیر علی کی آواز آئی ’’چوکیدار گنپت رام۔ ادھر آؤ‘‘

قدیر کو حوالات میں بند ہوئے ایک گھنٹہ بھی نہیں ہوا تھا کہ میر فدا حسین عزیز بیگ کو اپنے ساتھ لئے ہوئے تھانہ پہونچ گئے۔ قدیر نے حوالات کے جنگلے سے عزیز بیگ کو زندہ دیکھا تو جان میں جان آ گئی۔ میر صاحب کے پہونچتے ہی داروغہ نے اپنی غزلوں والی کاپی بند کی اور مسکراتے ہوئے کھڑے ہو گئے

’’ارے ارے میر صاحب۔ آیئے آیئے۔تشریف لایئے۔ اس طرف بیٹھئے۔ کرسی لاؤ۔ ارے صاحب وہ کیا ہے کہ۔ وہ آئے گھر میں ہمارے۔ اب یہ قبلہ سچ مچ ہماری خوش قسمتی ہے۔ کہاں آپ۔ اور کہاں یہ ناچیز۔ میر صاحب آپ کے بارے میں تو مغل شہنشاہ اورنگ زیب نے کیا خوب کہا تھا۔ سادات عظام چوں چوب بیت الحرام۔ نہ لائق سوختی نہ لائق فروختنی۔ ہہ ہہ ہہ!!۔آپ ہیں کعبہ شریف کی لکڑی۔ ہاں تو فرمایئے قبلہ کیسے زحمت فرمائی جناب عالی نے‘‘

’’قدیر کو آپ نے کس جرم میں بند کر رکھا ہے؟‘‘ میر صاحب نے بڑے خشک لہجہ میں پوچھا

’’جھوٹی رپورٹ لکھانے کے جرم میں‘‘ داروغہ نے جھٹ جواب دیا

میر صاحب سر جھکا کر دو تین منٹ خاموش رہے ان کی اس بے چارگی سے شیر علی بہت محظوظ ہوئے۔ اور اُنھیں اب سے تین سال پہلے کا وہ واقعہ یاد آ گیا جب وہ شروع شروع مدنی پور تھانہ میں تبدیل ہو کر آئے تھے اور میر فدا حسین نے حسب عادت جس طرح دوسرے حکّام کو دعوت دیتے تھے اپنے گھر پر ان کی دعوت کی تھی۔ انھوں نے دعوت کھانے کے بعد میر صاحب سے کہا تھا ’’بھائی میر صاحب۔ ہم تو انگریزی عہد کے تھانے دار ہیں۔ ہماری اور زمینداروں کی تو ہمیشہ دانت کاٹی روٹی والا میل جول رہا ہے۔ ہم آپ کا ساتھ دیا کرتے تھے اور آپ ہم تھانیداروں کا۔ کیوں۔ میں غلط تو نہیں کہتا۔‘‘

’’بجا فرماتے ہیں۔‘‘

’’تو پھر میر صاحب‘‘ وہ بولے ’’زمینداری گئی تو جانے دیجئے کم بخت کو آپ ہماری طرف سے بے فکر ہو کر خود بھی کھایئے۔ اور ہمیں بھی کھانے دیجئے۔ بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ ہم دونوں مل بانٹ

کر کھایا کریں تو کیا حرج ہے۔ بولئے۔"

"واللہ بڑے دلچسپ خیالات ہیں آپ کے" میر صاحب شرما حضوری ہنسے

"تو پھر قبلہ- ہاتھ ملایئے ایں جانب سے۔"

میر صاحب نے ہاتھ ملانے کو تو ملالیا مگر یہ نہ سمجھ سکے کہ ہاتھ ملانے سے شیر علی کا مقصد کیا ہے "جناب ذرا وضاحت فرمایئے- بندہ آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہے" میر صاحب نے پوچھا "ارے ارے میر صاحب۔ کیوں ہمیں گنہگار کرتے ہیں" داروغہ نے کہا "قبلہ آپ سیّد ہیں آل رسول ہیں خدمت کرنے کا تو مجھے موقع ملنا چاہئے۔ میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ ہم دونوں مل بانٹ کر کھایا کریں۔"

"تو حکم دیجئے" میر صاحب بولے "مل بانٹ کر ہی کھایا جائے گا۔"

"اب حکم کیا دوں" داروغہ نے پھر پہیلی بجھائی" آپ تو سمجھدار ہیں آپ کو خود ہی سمجھ لینا چاہئے۔ اب دیکھئے نا کہ ہم تو دو سال سے اپنی شریکِ حیات کی مفارقت کے بعد ماہیٔ بے آب ہیں۔"

اتنا کہہ کر داروغہ شیر علی پھر خاموش ہوگئے میر صاحب نے پھر معذرت کی

"معاف کیجئے بندہ اب بھی کچھ نہیں سمجھا"

ایک ہلکا سا قہقہہ لگا کر شیر علی نے پان کی ڈبیہ میر صاحب کے ہاتھ سے لی اور ایک گلوری منہ میں دبا کر میر صاحب کے کندھے پر ہاتھ رکھا "آپ برا نہ مانیں تو عرض کروں۔"

"بے تکلف فرمایئے۔"

"تو پھر-وہ- جو ایک غیر منکوحہ آپ نے گھر میں ڈال رکھی ہے"

"کیا؟" میر صاحب چونک کر اس طرح کھڑے ہوگئے جیسے بجلی کی کرنٹ چھوگئی ہو

"پوری بات تو سنئے" داروغہ نے کہا "میں چاہتا ہوں اُسے دو چار دن کے لئے۔ ہی ہی ہی۔ غریب خانہ پر بھیج دیجئے۔ ہی ہی ہی۔ کچھ کام کاج کر دے گی گھر کا"

میر صاحب اتنے بڑے بے حمیّت نہ تھے چوٹ کھاتے ہی تڑپ اُٹھے

"بس بس جناب" ان کی سیادت کو جوش آگیا "مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ کے خیالات اتنے پست و لچر ہیں۔ آپ کو شرم نہ آئی یہ بات کہتے۔"

"شرم تو آپ کو آنی چاہئے قبلہ" شیر علی نے اپنے عہدے کا تاؤ دکھایا "میں کون سی حرام کاری کر رہا ہوں۔ خیر معلوم ہوگیا کہ میری آپ کی نہیں نبھ سکتی۔ آپ ایک معمولی رکھیل کی خاطر مجھ سے بگاڑ کر رہے ہیں تو ٹھیک ہے۔ جایئے۔"

"جناب وہ میری رکھیل نہیں ہے" میر صاحب بولے

"اچھا- تو وہ آپ کی منکوحہ ہے؟"

"یہی سمجھ لیجئے۔"

اس دن کے بعد سے میر صاحب اور داروغہ جی میں ان بن ہوگئی۔ اب تین سال بعد آج میر صاحب کو غرض منداد یکھ کر داروغہ شیر علی نے اپنی مونچھیں مروڑیں اور دل میں تہیہ کر لیا کہ آج میر صاحب کو زیر کئے بغیر نہ رہیں گے۔ میر صاحب پوچھ رہے تھے

"جھوٹی رپورٹ؟- آخر کیا لکھایا ہے قدیر نے"

"قدیر نے رپورٹ لکھائی ہے کہ کسی نے عزیز بیگ پر پستول سے گولی چلا کر انھیں ہلاک کر دیا ہے۔"

"تو اب تو یہ آپ کے سامنے زندہ سلامت کھڑے ہیں۔ قدیر کو چھوڑ یئے۔" میر صاحب نے کہا "ہاں ہاں زندہ ہیں" شیر علی ہنس کر بولے "خدا ان کی عمر دراز کرے۔ مگر قبلہ سیّد صاحب قدیر نے تو گولی چلانے والی بات کہی ہے اگر مسٹر عزیز بیگ اس بات کی تصدیق کر دیں کہ ہاں سچ مچ ان پر کسی نے گولی چلائی تھی تو میں قدیر کو ابھی ایک منٹ میں چھوڑے دیتا ہوں۔ کیوں عزیز صاحب؟"

"مجھ پر کسی نے گولی نہیں چلائی" عزیز بیگ نے کہا

"چلو بات ختم ہوئی" شیر علی بولے "اب چونکہ قدیر نے جھوٹی رپورٹ لکھا کر محکمہ کو پریشان کیا ہے اس لئے اُسے کچھ نہ کچھ سزا تو ضرور ملے گی۔ کہ غلط کہتا ہوں میر صاحب؟"

میر صاحب چند لمحے خاموش و متفکر بیٹھے رہے شاید داروغہ کے جواب کی گہرائی ناپتے رہے کہ اس خاموشی کو پھر داروغہ شیر علی نے توڑا

"مگر آپ ایک بزرگ آدمی ہیں سیّد ہیں اور جاڑے کی ٹھنڈی رات میں آپ بہ نفس نفیس یہاں تشریف لائے ہیں اس لئے آپ کا لحاظ تو کرنا ہی پڑے گا- تو فرمایئے کیا حکم ہے"

"قدیر کو چھوڑ دیجئے" میر صاحب بولے

"بہت اچھا" شیر علی جھٹ بولے پھر میر صاحب کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے کمرے کے باہر چلے گئے اور ایک کونے میں لے جا کر میر صاحب سے کہا

"قدیر کو چھوڑ رہا ہوں۔ لیکن سوچ لیجئے شرط وہی تین سال پرانی ہے"

شیر علی اپنا رول ہتھیلی پر مارتے ہوئے مسکرا رہے تھے اور میر صاحب ان کی صورت پر وہی تین سال پہلے والی خباثت دیکھ کر دل ہی دل متفکر ہو رہے تھے دراصل وہ داروغہ کی اس خواہش سے کبھی بھی غافل نہیں رہے تھے۔ آج وہی طلب پھر ان کے سامنے تھی مگر اُسے بلا توقف ٹھکرا دینا اس وقت ان کے نزدیک غیر دانشمندی کی بات تھی کیوں کہ خود انھیں بھی اپنے ذاتی کام کے لئے شیر علی کی مدد کی ضرورت تھی کچھ سوچ کر وہ اس نتیجہ پر پہونچے کہ داروغہ کو ملا کر رکھنے میں بڑی عافیت ہے رہی ان کی انا

اور عزّت وتکریم کی بات تو یہ سب تو بدلے ہوئے سیاسی و سماجی حالات کے ہاتھوں کب کی چور چور ہوچکی تھیں ان کا غم کوئی کب تک منا سکتا ہے۔ وہ بڑی مری مری آواز میں بولے

''ٹھیک ہے۔ کل شب میں غریب خانہ پر آپ کی دعوت ہوگی۔''

''یہ ہوئی سمجھ داری کی بات۔ بہت بہت شکریہ'' شیر علی کی باچھیں کھل گئیں۔

کمرے میں واپس آ کر شیر علی نے میر صاحب سے کہا ''اب آپ تشریف لے جائیں۔ قدیر آجائے گا''

میر صاحب اور عزیز بیگ کے جانے کے بعد گنپت رام حولدار حوالات کا دروازہ کھولنے گیا تو قدیر سے کہا ''اے میاں۔ تم نے کیا کہا تھا میں کیا ہو جاؤں؟''

''پہلے دروازہ کھولو تو بتاؤں''

''پہلے مجھے سلوٹ کرو تو دروازہ کھولوں''

قدیر نے حوالات کے اندر سے گنپت رام کو سلوٹ مارا پھر باہر نکل کر حولدار سے بولا

''تو آج سے میری اور آپ کی دوستی پکّی ہوئی''

''دوستی! ہہ ہہ۔ بیٹا میں سب سمجھتا ہوں'' حولدار نے کہا ''یہ دوستی رشوت کی ہے مگر خیر میں یہ رشوت اس لئے لے رہا ہوں کہ مجھے دوسری پارٹی نے بھی رشوت دے رکھی ہے بھائی ہم تو دونوں فریق سے مال اینٹھتے ہیں وہ دیکھو۔ وہ کھڑکی میں تمہاری پریمکا تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ اب چپکے سے کھسک لو میں داروغہ جی کو سنبھال لوں گا۔''

''ارے جیو جیو میرے گنپت رام ۔ بھگوان کرے تم آئی جی ہو جاؤ''

ثریا سچ مچ قدیر کے انتظار میں تھی۔ کھلی ہوئی کھڑکی سے قدیر باہر سے جھانک کر ثریا کو دھیرے سے پکارا ''ثریا دروازہ کھولو۔ میں آیا ہوں۔''

دروازہ کھولتے ہی ثریا نے کہا ''میں بڑی دیر سے تمہاری راہ دیکھ رہی تھی تمہیں تھانے میں آتا دیکھ کر میں نے کھڑکی کھول دی تھی تم اتنی دیر کہاں تھے''

''ڈیر تمہارے والد نے آج پانچ غزلیں سنائیں جو سب کی سب چہار غزلہ تھیں۔ ہر غزل میں اکیس شعر پانچ مطلعے تین مقطعے تھے اور ہر مقطعہ کے آخر میں کہتے تھے ''اس ردیف و قافیہ میں پھر لکھو شیدا غزل'' کیا بتاؤں ثریا بس یہ سمجھ لو کہ حلال کر ڈالا انھوں نے''

''تم یہ تو پوچھو کہ میں اتنی بے قراری سے تمہارا انتظار کیوں کر رہی تھی۔'' ثریّا نے کہا

''چلو اب پوچھے لیتا ہوں'' قدیر نے کہا ''اس خاکسار کی یاد کیسے آئی''

ثریا نے کہا ''تم نے مجھے جو چمپا کلی دی تھی''

''ہاں ہاں۔ کیا ہوا''

''وہ ابّا جان کے ہاتھوں میں پڑ گئی''

''کیسے؟'' قدیر نے پوچھا ''ابّا جان کو کیسے مل گئی۔''

''اس روز جب تم یہاں تھے تو اچانک ابّا جان آ گئے تھے میں نے دروازہ کھولنے سے پہلے چمپا کلی گلے سے اتار کر گھبراہٹ میں کھڑکی سے باہر پھینک دی تھی یہ سوچ کر کہ بعد میں اٹھا لوں گی مگر لوٹتے وقت ابّا جان نے کھڑکی کے نیچے اُسے پڑا ہوا دیکھ کر اُٹھا لیا مجھ سے پوچھا کہ یہ تمہاری تو نہیں جب میں نے انکار کر دیا تو کسی دوسرے کا مال سمجھ کر انھوں نے اسے اپنے پاس رکھ لیا''

قدیر نے ہنس کر تسلّی دی ''چلو کیا ہوا۔ گھی کھچڑی ہی میں تو گرے گا۔ غم نہ کرو میں اور دوں گا''

اچانک قدیر کی نظر شلف پر رکھی ہوئی پھر اسی تصویر پر گئی جو ہو بہو اس کی ماں سے مشابہ تھی اور جسے وہ اس سے پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ اس نے ثریّا سے پوچھا

''یہ کس کی تصویر ہے؟''

''میری والدہ کی'' وہ بولی

پھر اس کے آگے قدیر نے کچھ نہیں پوچھا اور گھر میں آئے ہوئے مہمان کا بہانہ کر کے چلا گیا۔

میر صاحب عزیز بیگ کو تھانہ سے لے کر چلے تو ریلوے اسٹیشن والے موڑ پر پہونچ کر عزیز بیگ سے کہا ''بیگ صاحب اب آپ یہیں سے اسٹیشن چلے جایئے۔ یہاں سے ایک فرلانگ پر اسٹیشن ہے وہاں ساڑھے دس بجے رات میں پسنجر گاڑی ملے گی۔''

گھر پہونچ کر میر صاحب نے پہلے اپنے کمرے کا دروازہ بند کیا پھر عزیز بیگ سے ملی دس ہزار روپے کی گڈی نکال کر لالٹین کی روشنی میں گننے لگے۔ سو سو کے سو نئے نوٹوں کی گڈی تھی اس لئے دو تین بار گننے میں بھی زیادہ وقت نہیں لگا۔ اُنھوں نے اپنی دانست میں بڑی دانش مندی اور دور اندیشی کا کام کیا تھا کہ عین اس وقت جب کہ قدیر عزیز بیگ کو لڑکی کا پتہ ٹھکانہ بتانے والا تھا اُنھوں نے اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر اپنے پستول کے ہوائی فائر سے قدیر کو دہشت زدہ کر کے وہاں سے بھگا دیا پھر عزیز بیگ کو اکیلا پا کر اُن سے سودا کر لیا۔ دس ہزار روپوں کی گڈی اپنے قبضہ میں لے کر لڑکی کا پتہ ٹھکانا بتا دیا۔ البتہ سونے کے بسکٹوں کے بارے میں وہ کچھ نہ بتا سکے کیوں کہ اس بارے میں وہ خود لاعلم تھے مگر اُنھیں عزیز بیگ کی اس بات میں وزن ضرور محسوس ہوا کیوں کہ سونے کا ایک بسکٹ وہ لاڈلی کے ہاتھ میں دیکھ چکے تھے جس کے بارے میں اُنھیں یہ بتایا گیا تھا کہ اسے قدیر نے دیا ہے۔ میر صاحب نے عزیز بیگ سے جو سودا بازی کی تھی اس کی بھنک قدیر کو نہ لگی۔ سو سو کے نوٹوں کو متعدد بار گننے کے بعد جب وہ تھک گئے تو گاؤ تکیہ سے ٹیک لگا کر تخت پر نیم دار نہ ہو گئے مگر چند ہی منٹ دروازہ ''چوں'' سے کر کے کھلا وہ گھبرا کر

اُٹھ بیٹھے تو سامنے زرّیں کو کھڑا پایا

''پتہ نہیں قدیر کہاں چلا گیا'' زرّیں پریشان لگ رہی تھی ''صبح جب سے تھانے دار آیا تھا تب سے نہ جانے میرا دل کیوں دھڑک رہا ہے۔''

''تمہارا دل تھانے دار کو دیکھ کر دھڑکنے لگا ہوگا'' میر صاحب نے مذاق کیا ''کہ غلط کہتا ہوں؟''

''دل لگی مت کیجئے۔ میں سچ مچ پریشان ہوں'' وہ بولی

''ناحق پریشان ہو'' وہ بولے ''ارے بھائی دل کا کام ہی دھڑکنا ہے رہی قدیر کی بات تو وہ ابھی آجائے گا میں اُسے تھانہ میں چھوڑ کر آیا ہوں۔''

''تھانہ میں کیوں؟ - کیا بات ہے سچ مچ بتایئے نا''

''بات یہ ہے زرّو کہ قدیر ایک سنگین معاملہ میں پھنس گیا ہے۔ ارے تم آؤ تو۔ یہاں بیٹھو میرے پاس''

میر صاحب نے زرّیں کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پہلو میں بٹھا لیا پھر بولے

''مگر میرے ہوتے ہوئے اُس کا بال بیکا نہیں ہوگا۔ تم بے فکر رہو''

''کیا کیا ہے اُس نے؟'' زرّیں نے پوچھا

''کیا کرو گی تفصیل جان کر'' میر صاحب نے کہا ''جوان لڑکوں سے غلطیاں ہو ہی جاتی ہیں۔ کچھ نہ کچھ کیا جائے گا اس کے بچاؤ کے لئے۔'' بھئی جو جرم اُس نے کیا ہے اس میں سات سال کی سزا ہے۔''

''ہائے اللہ!''

''مگر داروغہ شیر علی اپنا یار ہے اُس نے ساتھ دیا اور مدد کا وعدہ کیا ہے ورنہ قدیر ضرور جیل چلا جاتا۔ اب سوچتا ہوں کہ شیر علی کا احسان کیسے چکاؤں۔ تم کچھ بتاؤ زرّو''

''میں کیا بتاؤں'' زرّیں نے کہا ''آپ جو کر رہے ہیں وہ ٹھیک ہی کریں گے میری بھی وہی رائے ہے''

''میں یہ سوچتا ہوں'' میر صاحب ذرا دیر کو رُکے'' کہ کل رات میں داروغہ کی دعوت کر دوں۔ میرا مطلب ہے کہ اُسے رات میں کھانے پر بلا لوں۔ کیوں؟ - کیا رائے ہے تمہاری؟''

''ہاں ہاں - بلا لیجئے'' زرّیں نے کہا'' ٹھیک ہے۔ جو کہئے گا وہ میں پکا دوں گی۔''

میر صاحب نے لیمپ کی ہلکی روشنی میں زرّیں کے چہرے پر بغور نظر ڈالی۔ کیا کھلی کھلی جوانی تھی اور کیسا دلکش رنگ و روپ پایا تھا کہ چالیس برس کی عمر ہوتے ہوئے بھی جنسی کشش اور دل فریبی میں کوئی کمی نہ تھی۔ میر صاحب بہ ہمہ طور اپنی بے بسی کے باوجود اس تخلیہ میں اُسے اپنی بوڑھی باہوں میں لپٹا کر ہلکا پھلکا پیار کئے بغیر نہ رہ سکے

''صرف کھانا ہی پکانا نہیں ہے'' وہ ہنس کر بولے ''داروغہ کو شیشے میں بھی اتارنا ہے زرّو''

''شیشے میں؟ - وہ کیسے؟'' اس معصومانہ سوال پر اُنھیں پھر پیار آیا بولے

''بڑی نادان ہو'' وہ دیر تک مسکراتے رہے ''اچھا کان میں سنو''

میر صاحب کان میں اپنا مدعا بیان کر چکے تو زرّیں شرما کر بولی ''ہٹیئے بھی -'' وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی

''نہیں نہیں! اسے دل لگی مت سمجھو'' وہ بولے ''بس تھوڑی دیر کے لئے اُس کے دل میں اُتر جاؤ وہ تمہارے لئے تڑپا نہیں کہ بس اپنی مٹھی میں ہوگا۔''

''نہیں'' وہ ٹھنک کر بولی'' بُری بات ہے - یہ میں نہ کروں گی''

''اُفّوہ!'' میر صاحب زور دیئے گئے ''تم سمجھتی کیوں نہیں زرّو۔ ارے یہ میں ہمیشہ کے لئے تھوڑی کہہ رہا ہوں بس ذرا دیر کے لئے بے شرم بن جانا۔ ارے اپنا کام نکالنا ہے نا''

اس کے آگے وہ کچھ نہ کہہ پائی کیوں کہ باہر قدیر بول رہا تھا ''میاں - کہاں ہیں آپ؟''

زرّیں دوسرے دروازے سے آنگن میں چلی گئی قدیر کے اندر آنے پر میر صاحب نے پوچھا

''سنو- یہ سونے کے بسکٹوں کا کیا معاملہ ہے؟''

قدیر سمجھ گیا کہ عزیز بیگ نے میر صاحب سے سونے کے بسکٹوں کے بارے میں بات کی ہے اور میر صاحب کو بتا دیا ہے اس لئے اب اس بارے میں اپنی لاعلمی ظاہر کرنا بے کار ہے۔ اس نے کہا

''میاں - عزیز بیگ کہتے ہیں کہ وہ عورت ان کے سونے کے سو بسکٹ چرا کر بھاگی تھی مگر مجھے اللہ قسم بسکٹ کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔''

''ہوں - تمہیں کچھ پتہ نہیں'' میر صاحب بولے ''اور وہ بسکٹ جو تم نے لاڈلی کو دیا تھا۔ وہ کیا تھا؟''

''جی - وہ - وہ - بسکٹ مجھے اس عورت نے دیا تھا۔ بس وہی ایک بسکٹ اس کے علاوہ میں نہیں جانتا''

''اونہک۔'' میر صاحب بولے ''تم سچ نہیں بول رہے۔ ذرا بھی سچائی تمہاری باتوں سے نہیں جھلکتی۔ مگر خیر۔'' وہ اُٹھ کر کھڑے ہو گئے ''تم اس وقت جاؤ۔ رات زیادہ ہو چکی ہے۔ میں تمہیں رات بھر کا موقع دیتا ہوں خوب اچھی طرح سوچ سمجھ کے مجھے کل صبح سب کچھ ٹھیک ٹھیک بتا دینا ورنہ میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا۔ عدالت کچہری جو چاہے ہو۔''

''میاں۔ آپ کے سر عزیز کی قسم کھاتا ہوں۔ میں نے جو بتایا ہے بس وہی صحیح ہے۔''

''مت بکو'' اُنھوں نے ڈانٹا اور خشمگیں نظروں سے دیکھتے ہوئے باہر چلے گئے۔

قدیر سچ مچ عزیز بیگ کے سونے کے بسکٹوں کے بارے میں بالکل لاعلم تھا۔ بستر پر سونے

کے لئے لیٹا تو اس معمّہ کو سلجھانے میں اُسے دو تین گھنٹے لگ گئے۔اس نے سوچا اگر عزیز بیگ کی یہ بات درست ہے کہ شہزادی سونے کے سو بسکٹ تجوری سے نکال کر فرار ہوئی ہے تو پھر وہ بسکٹ کہاں چلے گئے۔

شہزادی کے پاس کوئی سوٹ کیس یا بیگ بھی نہیں تھا جس میں بسکٹ رکھے جاتے۔مگر میلہ میں ایک بدمعاش نے اُسے چاقو دکھا کر پوچھا تھا ''بول کہاں چھپایا ہے'' تو ضرور وہ ان بسکٹوں کے بارے میں ہی پوچھ رہا ہوگا اور وہ بسکٹ اس وقت ضرور اس کے پاس رہے ہوں گے۔کیا ہو گئے وہ بسکٹ۔اس بدمعاش کو ملے نہیں۔شہزادوں کا سارا سامان وہ خود اُٹھالایا تھا۔بہت غور کرنے کے بعد اس کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ ہوسکتا ہے کہ مہوہ کے جس پیڑ کے نیچے شہزادی نے اپنا تمبو لگایا تھا اسی مقام پر کسی جگہ گڈھا کھود کر اس نے بسکٹوں کو دفن کر دیا ہو یہ خیال اُسے قرین قیاس معلوم ہوا اس لئے اس نے جلد سے جلد بھدری پہونچنے کا فیصلہ کرلیا تا کہ وہاں پہونچ کر بسکٹوں کو تلاش کر سکے۔اس نے سوچا اگر یہ سارے بسکٹ اُسے مل گئے تو پلک جھپکتے ہی وہ ایک بڑا آدمی بن جائے گا۔سرکار سے معاوضہ میں ملنے والی رقم الگ سے رہی انھیں ہوائی قلعوں میں بھٹکتے بھٹکتے اُسے نیند آ گئی اور صبح سویرے جب سو کر اُٹھا تو میر صاحب سے ملے بغیر وہ بھدری کے لئے روانہ ہو گیا۔

★★★

رات میں میر فدا حسین نے داروغہ شیر علی کو کھانے پر مدعو کیا تھا اس لیے دن ہی میں اُنھوں نے زرّیں کو سمجھا دیا تھا ''دیکھو رات میں کوکا کولا رنگ والی شیفون کی امپورٹیڈ ساڑی پہننا وہی جو ساجدہ نے شارجہ سے تمہارے لئے بھیجا ہے۔اور سینٹ بھی بڑھیا والا لگانا''

''ارے تو کیا میں اس کے سامنے بے پردہ آؤں گی؟'' زریں نے پوچھا

''پھر اُس پر بجلی کیسے گرے گی؟۔زرّو تم سمجھتی کیوں نہیں میں اتنی دیر سے خوامخواہ بک بک کر رہا ہوں''

زرّیں کی سمجھ میں بات آ گئی تھی اس لئے شرم سے اس کا چہرہ گلنار ہو گیا اظہار اطاعت میں اس نے سر جھکا لیا میر صاحب گویا ہوئے ''دیکھو۔اس وقت داروغہ کو ہر صورت سے ملا کر رکھنا ہے اُس کو خوش رکھنے میں ہماری بھلائی ہے کیوں کہ قدیر کئی الزام میں ماخوذ ہے۔ایک بار تو اُسے حوالات سے چھڑا لایا ہوں اب آگے سب کچھ داروغہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔اُس نے تمہارے بارے میں سب کچھ سن رکھا ہے۔لالچی آدمی ہے ذرا دیر کو اس کے سامنے آ کر اس کا دل بہلا دو گی تو کیا تمہارے پھول جھڑ جائیں گے۔خوبصورتی کم ہو جائے گی؟''

''شرم لحاظ بھی تو کوئی چیز ہے۔'' اُس نے عذر پیش کیا۔

''میں شرمانے کو منع نہیں کرتا۔خوب جی بھر کے شرمالینا مگر ذرا۔ناز و انداز کے ساتھ۔ہاں''

''ہائے اللہ'' وہ بولی ''میں بالکل ہی بے شرم بن جاؤں کیا''

''ہاں تھوڑی دیر کے لئے یہی سمجھو''

''آپ تو وہاں رہیں گے نا؟''

''کیا ضرورت ہے میری'' میر صاحب بولے ''بس تم اپنا کام کرنا میری طرف سے ہر بات کی چھوٹ ہے''

دعوت میں میر صاحب نے کھانے کا کوئی خاص انتظام نہیں کیا تھا صرف مرغ کا قورمہ، مٹر پلاؤ، کباب اور شاہی ٹوسٹ تھے البتہ اس بات کا خصوصی خیال رکھا تھا کہ زرّیں اپنے شباب کو بھرپور نمایاں کر سکے اور خوب بن ٹھن کر داروغہ کے سامنے جائے اس اطاعت مند نے ویسا ہی کیا بھی ایسا دم دار ہلاکت خیز سنگار کیا کہ میر صاحب پر بھی بلا پئے سرخوشی طاری ہو گئی۔

داروغہ شیر علی دیر رات کو تنہا کھانے پر آئے۔میر صاحب نے بڑی عزت و توقیر کے ساتھ اُنھیں اپنی خواب گاہ میں بٹھایا۔شیر علی نے آتے ہی سب سے پہلے قدیر کے بارے میں پوچھا اور جب میر صاحب نے یہ بتایا کہ وہ گاؤں سے باہر کہیں گیا ہے تو ان کو اطمینان ہو گیا۔وہ میر صاحب کو مخاطب کرکے بولے

''یہ لڑکا۔قدیر۔ دل کا برا نہیں لگتا۔کیوں میر صاحب''

''انتہائی مہذّب اور ادب کرنے والا لڑکا ہے'' میر صاحب نے کہا ''وہ تو اکثر آپ کے پاس آتا جاتا ہے۔اپنی والدہ سے آپ کے اخلاق کی برابر تعریف کیا کرتا ہے''

''اچھا اچھا'' شیر علی یک بیک پھول کر کپّا ہو گئے ''ارے صاحب یہ تو آپ کی مہذبانہ تربیت کا نتیجہ ہے۔''

''نہیں بھائی شیر علی صاحب'' وہ بولے ''قدیر کی والدہ خود بڑی خوش تدبیر خاتون ہیں۔''

شیر علی کی نظر دروازے کی طرف گئی جس کا پردہ ہلنے لگا تھا پتہ نہیں کوئی جھلک دیکھی تھی یا نہیں بہت خوش ہو کر بولے ''ماشاءاللہ'' جیسے سچ مچ کوئی چھم سے باہر آ گیا ہو۔

میر صاحب کو ان کی بے قراری کا فوری اندازہ ہو گیا مگر لوہا تو ابھی پوری طور پر گرم نہیں ہوا تھا اس لئے انھوں نے اس پر چوٹ لگانے کی جگہ دوسری بات اپنے مطلب کی چھیڑ دی۔

''یہ شیورتن مجھے بہت تنگ کر رہا ہے داروغہ صاحب۔کچھ اس کا حساب کتاب لگائیے۔''

''شیورتن؟'' داروغہ نے کہا ''آپ کا مطلب ہے گاؤں کا پردھان؟''

’’جی ہاں‘‘ میر صاحب بولے ’’آپ اس حرام زادے کا کچھ بندوبست کردیجئے ورنہ میرا اس گاؤں میں رہنا سہنا دشوار ہوجائے گا‘‘

’’آپ حکم دیں میر صاحب- چٹکی بجاتے سب ٹھیک کردوں گا۔ یہ تو بتایئے وہ کیا کرتا ہے‘‘

’’چک بندی کے بعد میرا ایک چھتنار درخت مہوے کا اس کے کھیت میں آ گیا ہے تو اب وہ کہتا ہے کہ یہ پیڑ میرا ہے۔ بس زورزبردستی کرتا ہے چار دن میں مہوے کی فصل آنے والی ہے۔‘‘

’’میری مانئے تو آپ اس درخت کو جڑ سے کٹوا ڈالئے اور ہمارے یہاں رپورٹ لکھا دیجئے کہ اس پیڑ کو شیورتن اور اس کے آدمیوں نے کاٹا ہے۔ میں اس کو اندر کردوں گا‘‘

شیر علی کے اس مشورہ کا سیدھا مطلب فوجداری کرنا تھا جس سے میر صاحب شاید متفق نہ تھے۔

’’ہاں ہوتو سکتا ہے‘‘ وہ بولے ’’لیکن اس میں معاملہ طول پکڑے گا اور مقدمہ بازی کی نوبت آجائے گی بہتر ہے کہ اُسے کسی دوسری طرح سے مات دی جائے۔‘‘

’’کیوں فکر کرتے ہیں جناب‘‘ داروغہ نے کہا ’’شیر علی نے جسے ایک بار اپنا کہہ دیا پھر اس کے لئے جان بھی دے سکتا ہے۔ اب آپ نے دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے تو اپنے یار کی دلداری بھی دیکھئے گا میرے آگے یہ شیورتن پدّی کیا ہے۔‘‘

کھانا کھانے کے بعد داروغہ شیر علی نے سر درد کا بہانہ کیا تو میر صاحب اُنھیں مسہری پر آرام کرنے کا مشورہ دے کر اندر چلے گئے اور فوراً ہی زرّیں کو اپنے ساتھ لئے واپس آ گئے۔ داروغہ نے بستر پر لیٹے لیٹے جیسے ہی زرّیں کو آتے دیکھا تو اس طرح اُٹھ کر بیٹھ گئے جیسے بجلی کی کرنٹ چھوگئی ہو۔ زرّیں کیا تھی ایک قیامت تھی اس کا ہوش ربا سنگھار اور اُس کے شگفتہ حُسن کی حشر سامانیاں اگر شہر علی پر قیامت نہ توڑتیں تب بھی از خود رفتگی سے اُن کے ہوش وحواس کا جانا یقینی تھا۔ وہ حواس باختہ اور تعجب بھری نظروں سے زرّیں کو تو ضرور دیکھ رہے تھے مگر جو چہرہ اس وقت ان کی نظروں کے سامنے تھا وہ سو فیصدی اُن کی مرحومہ شریک حیات مہر النساء کے شاداب و حسین چہرے سے مشابہ تھا۔ وہی چہرہ، وہی نقوش وہی رنگ وروپ وہی نکھار ویسی ہی دلکشی۔ گھبرا کر اُنھوں نے اپنی آنکھیں ملیں۔ سوچا کہیں یہ خواب تو نہیں ہے۔ مُہرن جنت الفردوس سے اُتر کر اُن کے تصوّر میں آج یک بیک کیسے آ گئی پانچ سال پہلے تو وہ اپنی پیاری بیگم مُہرن کو حالت زچگی میں دم توڑتا دیکھ چکے تھے۔ تو پھر یہ کیا تھا۔ کیسا خواب تھا۔ جب میر صاحب نے اُن کی یہ بے حالی دیکھی تو یہ خیال کرکے کہ واقعی زرّیں نے داروغہ کے دل ودماغ پر جادو کردیا ہے دل ہی دل خوش ہوکر بولے

’’داروغہ صاحب کے سر میں درد ہو رہا ہے۔ تم سر میں تیل کی مالش بہت اچھا کرلیتی ہو۔ ذرا تم اپنا جادو دکھاؤ تو‘‘

شیر علی مسہری پر بیٹھے تھے میر صاحب نے زرّیں کی انگلی پکڑ کر دھیرے سے اشارہ کیا تو وہ بھی شرما کر مسہری پر بیٹھ گئی میر صاحب الماری سے اصلی جونپوری چمیلی کا خوشبو دار تیل نکالنے کے لئے دوسری طرف چلے گئے۔ شیر علی کی پیٹھ پر زرّیں کے سینے کے لمس نے ان کے سارے بدن میں بخار دوڑا دیا تھا۔ زرّیں اُن کے بالوں میں ہلکے ہلکے چمپی کرنے لگی۔ میر صاحب بولے

’’تب تک میں آپ کے لئے سگریٹ لے آؤں‘‘ اور وہ باہر چلے گئے۔

جب تک زرّیں ان کے سوکھے بالوں میں اپنی نازک نازک انگلیوں سے چمپی کرتی رہی وہ گم سم بغیر کچھ بولے سحر آگیں خواب کا مزہ لیتے رہے مگر بالوں میں خوشبو دار تیل کے پڑتے ہی شیر علی بے ہوش ہونے لگے۔ اپنی ناک سے گہری گہری سانس لیتے ہوئے یک بیک اس طرح خاموش ہوگئے جیسے سائیکل کے ٹیوب سے ہوا نکل گئی ہو۔ پھر اچک کر زمین پر کھڑے ہوگئے

’’بس بس- اب اور نہیں‘‘ وہ بولے زرّیں کچھ کہنے کے بجائے صرف ہلکی سی ہنسی ہنس کر چپ ہوگئی۔ شیر علی نے ایک بار پھر اس کی طرف دیکھا کوکا کولا رنگ کی ساڑی اور اسی رنگ کے بلاؤز میں زرّیں کی گوری شفاف گردن پر کالا تِل۔ شاید اس کا یہ قاتلانہ سحر کچھ دیر اور چلتا لیکن اس سے پہلے چمپی کرتے کرتے جب زرّیں نے اچانک اپنے ہاتھ روک لئے تو شیر علی کو اس کے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے سے جڑی چھٹی انگلی دکھائی دی حیرت واستعجاب کا وہ لمحہ یک بیک ختم ہوگیا۔ یہ ان کی مرحومہ شریکِ حیات نہ تھی مگر اس سے ہو بہو کتنی مشابہت تھی پھر اچانک اُن کے دل میں زرّیں کے لئے پیار اُمنڈ پڑا۔ اُنھوں نے اپنی جیب سے چمپا کلی نکالی اور اپنے ہاتھوں سے زرّیں کے گلے میں پہنانا چاہا وہ پھر بیٹھ گئے۔

’’یہ حقیر تحفہ میری طرف سے ہے۔ اسے قبول کرلو‘‘

زیور عورت کی سب سے بڑی کمزوری ہوتا ہے وہ زیور سے کبھی انکار نہیں کرسکتی۔ داروغہ کی چمپا کلی کو دیکھ کر زرّیں کے منہ میں پانی آ گیا۔ اتنا بھاری اور خوبصورت ہار پاتے ہی زرّیں شیر علی کے پہلو سے اور چپک کر بیٹھ گئی۔ اس کے بدن کی قربت اور رخساروں کے قریب زرّیں کے گرم گرم سانسوں کے لمس نے شیر علی کو پھر بے حال کردیا وہ اچھل کر الگ بیٹھ گئے

’’یہ کیا- تم نے تو ہاتھ لگاتے ہی-‘‘

زرّیں نے ایسا محسوس کیا جیسے اس سے کوئی جرم سرزد ہوگیا ہو جب ہی تو شیر علی اُس سے ہٹ کر الگ بیٹھ گئے ’’آپ کو اچھا نہیں لگا؟‘‘ اس نے دھیرے سے پوچھا

’’بہت اچھا لگا- بہت مزہ آیا۔‘‘ وہ بولے

میر صاحب سگریٹ لے کر واپس آئے تو داروغہ شیر علی جانے کے لئے تیار ہو چکے تھے

’’آپ اتنی جلدی جا رہے ہیں‘‘ میر صاحب بولے ’’کوئی ہرج نہ ہو تو شب میں یہیں قیام

کیجئے۔'' مگر شیر علی نہیں رکے اور چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد میر صاحب نے زرّیں کی طرف دیکھا
تو گلے میں سونے کی خوبصورت چمپا کلی دکھائی دی۔ زرّیں مسکرا رہی تھی

''یہ!'' میر صاحب نے مسکراتے ہوئے انگلی کے اشارے سے معنی خیز سوال کیا یعنی کیا یہ
حسین تحفہ شیر علی نے دیا ہے

''ہوں'' زرّیں نے بھی ہنس کر اتنا ہی مختصر جواب دیا۔

اس کے بعد میر صاحب نے اُسے لپٹا لیا اور اپنی بچھی کچھی محبت کی چوما چاٹی سے اُس کے
تپتے ہوئے بدن پر ٹھنڈی سنکائی کرتے کرتے وہ سو گئے دوسرے دن علی الصباح اُنھیں قدیر کے تعاقب
میں بھدری جانا تھا۔

★★★

میر فدا حسین سے کرامت علی کا پورا پتہ لے کر مسٹر عزیز بیگ ایک لمبی لمبی سیاہ زلفوں اور مان
منوہر داڑھی والے گیسو دراز فقیر کے بھیس میں جائس کے اسٹیشن پر اُترے تو ایک مقامی تانگے والا اپنی
چابک لہراتا ہوا ان کے پاس آ کر بولا

''آیئے۔آیئے شاہ جی۔ بڑے قصبہ (جائس) چل رہے ہیں؟''

''ہاں۔ کتنا پیسہ لو گے وہاں تک کا؟'' بابا جی نے پوچھا

''دو روپیّہ ہوتا ہے۔مگر آپ کا جو دل چاہے دے دیجئے گا۔'' تانگے والا بولا

شاہ جی تانگے پر بیٹھ گئے تو اس نے پوچھا ''آپ مخدوم صاحب بابا کی درگاہ پر جایئے گا؟''

''نہیں بیٹا۔تم مجھے نوگزی قبر کے چوراہے پر اتار دینا''

مزید دو تین سواریاں لے کر تانگے والا قصبے کی طرف چل پڑا۔ تانگہ میں قصبہ کے مشہور کبوتر
باز ریاض بھائی بھی بیٹھے تھے وہ ایک پردیسی بابا جی کو دیکھ کر بولے

''آپ پنجابی ہیں یا بنگالی؟''

اُنھوں نے کوئی جواب دینے کے بجائے اپنی بند مٹھی ریاض بھائی کی طرف بڑھائی اور کوئی
چیز ان کی ہتھیلی پر رکھ کر پھر ان کی مٹھی بند کر دی۔ ریاض بھائی نے دیکھا تو پودینے کی دو تین سبز اور تازی
پتیاں ان کی ہتھیلی پر رکھی تھیں

''برگِ سبز تحفۂ درویش'' اتنا کہہ کر شاہ جی دوسری طرف دیکھنے لگے مگر تانگے والا ریاض
بھائی سے مخاطب ہو کر زور سے چلّایا ''بھیّا۔ تم تر گئے'' اور یا علی کہہ کر اس نے گھوڑے کو دو تین چابکیں

ایسی ماریں کہ گھوڑا سڑک پر سرپٹ دوڑنے لگا

''صوفی جی'' ریاض صاحب مرعوب ہو گئے ''آپ یہاں پردیسی ہیں نوگزی قبر کے پاس اُتر
کر کہاں تشریف لے جائیں گے اگر برا نہ مانیں تو محلّہ غوریانہ میں عبدالرحیم صاحب کی کوٹھی غریب خانہ
ہے دو ایک دن وہاں قیام فرمالیجئے''

''نہیں میاں'' وہ بولے ''فقیر کسی کے گھر میں نہیں رکتے ایک فقیر ہی کی جھونپڑی پر جانا ہے۔''

''کہاں جانا ہے؟'' تانگے والے نے پوچھا ''آپ بتائیں تو میں آپ کو وہاں پہونچا دوں۔''

''بیٹا۔ میرے لئے مرشد کا حکم ہوا ہے کہ جائس میں کرامت علی نام کا ایک پہونچا ہوا کراماتی
پیر ہے۔تم فوراً اس سے جا کر ملو۔ اگر تم بابا کرامت علی کا گھر جانتے ہو تو مجھے وہاں تک پہونچا دو۔''

''ارے بدّھن'' ریاض بھائی نے تانگے والے سے کہا ''کرامت تو تمہارے گھر کے پاس
ہی رہتا ہے''

''ارے وہ کرامت'' بدّھن تانگے والا بولا ''وہ سالا فقیر وا ٹکیہ چور''

''اُسے فقیر نہ کہو بچّہ۔ وہ بڑا اللہ والا درویش ہے۔'' شاہ جی نے کہا

''ارے ہاں بہت اللہ والا ہے'' بدّھن نے کہا ''سالا ہمری مہرارو کو بھگائے لے گوا حرامی''

''جانے دو بچّہ'' وہ بولے ''میں خود ہی پوچھتا پوچھتا ان کے آستانے پر پہونچ جاؤں گا''

''آستانے پر! ہہ ہہ!...... خیر ٹھیک ہے چلئے میں ان کے آستانے پر آپ کو پہونچا دوں گا وہ
تو میرے پڑوسی ہیں۔مگر آج کل وہ یہاں نہیں ہیں الہ آباد گئے ہیں۔''

''ہاں مجھے معلوم ہے'' شاہ جی نے کہا ''ان کے گھر والے تو ہوں گے''

شاہ جی کو کرامت علی کے گھر تک پہونچا کر بدّھن تانگے والا چلا گیا۔ روشن اس وقت باہر
کھیل رہی تھی صرف چندا گھر میں اکیلی تھی

''کرامت علی گھر یہی ہے؟'' عزیز بیگ نے دروازے سے آواز دی

''چندا اُٹھ کر باہر آئی اور ایک اجنبی کو اپنے دروازے کھڑا دیکھ کر بولی ''وہ تو باہر گئے ہیں''

''میں جانتا ہوں بہن'' وہ بولے ''کرامت علی نے ہی مجھے یہاں بھیجا ہے''

''اچھا اچھا'' چندا نے کہا آؤ آؤ۔اندر آجاؤ''

''بہن جی۔ آپ ان کی کون ہیں؟''

''وہ ہمارے گھر والے ہیں''

''کیا بتاؤں بہن'' وہ غمگین لہجے میں بولے ''کرامت علی کا ایک پاؤں ریل گاڑی سے کٹ گیا''

چندا نے ہائے رے دیّا کہہ کر سینہ کوٹ لیا

''میرا نام لوٹن شاہ ہے میں اور بھائی کرامت دونوں ایک ساتھ الہ آباد میں تھے پریاگ اسٹیشن پر میلہ یاتریوں کی بھیڑ بھاڑ میں وہ ریل گاڑی سے گر پڑے ان کا ایک پاؤں ریل سے کٹ گیا اُنھوں نے مجھے آپ کے لانے کے لئے بھیجا ہے''

چندا سینے پر دوہتھڑ مار مار کر روئے جا رہی تھی اس کے رونے کی آواز سن کر پڑوسی جمع ہونے لگے تو عزیز بیگ نے چندا کو سمجھایا

''بہن رونے دھونے کا وقت نہیں وہ زندہ ہیں آپ چلنے کے لئے تیار ہو جایئے۔''

ہاں چلتی ہوں بھائی'' چندا آنسو پونچھتی ہوئی بولی ''ارے کوئی میرے روشن کو بلا دے۔ وہ باہر کھیل رہی ہوگی۔''

چندا کے سارے پڑوسی ایک ایک کر کے جمع ہو گئے۔ شبّو، عیدو، ابراہیم، بٹّن اور خیراتی۔ بٹّن نے چندا سے پوچھا

''چچّی تم جا رہی ہو تو کیا روشن کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤ گی''

چندا کے بولنے سے پہلے شاہ صاحب خود بول اُٹھے

''ہاں ہاں وہ بھی ساتھ چلے گی۔ اُسے کہاں چھوڑیں گے''

ابراہیم میراثی نے بھی ایک سوال اُٹھایا ''الہ آباد کے کون سے اسپتال میں چچّا بھرتی ہیں؟''

''بیلی اسپتال میں'' شاہ صاحب جلدی سے بولے

''ہم پوچھتے ہیں کیسے ٹانگ کٹ گئی چچّا کی'' عیدو نے پوچھا

''ارے بھائی ریل گاڑی سے گر پڑے تھے'' شاہ جی بولے

''چچّی تم روشن کو میرے پاس چھوڑ دو میں دیکھے رہوں گی'' بٹّن نے کہا

''میں بھی چلوں گی'' روشن نے جلدی سے کہا

''ہاں بٹی تو بھی چلے گی'' شاہ صاحب بولے

ایک گھنٹہ کے اندر اندر کچھ ضروری سامان اور کچھ نقدی وغیرہ لے کر چندا اور روشن شاہ جی کے ساتھ الہ آباد کی طرف جانے والی پسنجر گاڑی میں بیٹھ گئے خیراتی جوان لوگوں کو اسٹیشن تک پہونچانے آیا تھا گاڑی کے رینگتے ہی بڑی غمگین صورت اور نم ناک آنکھوں کے ساتھ پلیٹ فارم کے آخری سرے تک دوڑتا گیا پھر رک کر زور سے بولا

''روشن -جلدی لوٹ آنا''

گذرتے جاڑوں کی سہ پہر کو پسنجر گاڑی دھیرے دھیرے ہر اسٹیشن پر رکتی ہوئی جا رہی تھی۔ چندا کے دل و دماغ پر صرف ایک ہی خیال چھایا ہوا تھا۔ کرامت کے پیر کٹنے کا خیال اس کے دماغ میں

برابر کچوکے لگا رہا تھا اور اسی کے ساتھ اُسے دیوا شریف کے میلے کی بات یاد آ گئی۔ پندرہ سال پہلے جب وہ نئی نئی کرامت کے ساتھ دیوا شریف کے میلے میں گئی تھی تو ایک جگہ کوئی عطائی بزرگ زمین پر کمبل اور جیوتش و نجوم کی بساط بچھائے لوگوں کے ہاتھ کی لکیروں سے ان کا ماضی و مستقبل بتا رہے تھے۔ ایک نوجوان کسان کو اُنھوں نے کنویں میں ڈوب کر مرنے کی اطلاع دی تو وہ ان کے سر پر کھڑا ہو کر گالیاں بکنے لگا۔ کرامت علی نے بیس آنے دے کر اپنا ہاتھ بھی ان کی طرف بڑھایا وہ بزرگ شاید مستقبل کی بری باتیں بتانے کے ماہر تھے۔ ڈرتے ڈرتے بولے

''بچہ- ایک پیر بڑھاپے میں کٹ جائے گا۔''

کرامت نے اس پیشین گوئی کو بہت سبک تصوّر کرتے ہوئے کوئی اثر نہیں لیا۔ مسکرا کر پوچھا

''میری گھر والی اس وقت تک زندہ رہے گی نا؟''

''اپنی گھر والی کا ہاتھ دکھاؤ'' وہ بولے

چندا نے اپنا داہنا ہاتھ آگے بڑھایا تو وہ بولے ''بایاں ہاتھ دکھاؤ''

''چندا نے بایاں ہاتھ آگے کیا۔ کلائی سے اوپر کہنی تک سورج اور کیکڑے کے نشان کا گودنا گودا تھا ساتھ ہی اس کا نام بھی۔ نجومی بزرگ نے گودنا دیکھ کر پہلے چندا کی طرف دیکھا پھر بولے

''بیس آنے لاؤ''

پیسے پا کر اُنھوں نے چندا کے لیے بتایا ''یہ بہت دن زندہ رہیں گی۔ تم سے بہت زیادہ''

آج چندا کو ان نجومی بزرگ کی پیشین گوئی بالکل صحیح معلوم ہوئی یعنی وہ ''زندہ ہے اور کرامت کا پیر کٹ گیا۔

ریل گاڑی چار پانچ اسٹیشن گئی ہوگی کہ دن ڈوب گیا۔ جاڑوں کی ٹھنڈی شام میں بڑھتے ہوئے اندھیرے اور فضا میں چھائی ہوئی دھوئیں کی دبیز چادر کے ساتھ گاڑی کے اندر مسافروں کی گنتی کم ہوتی گئی جلبلا کا جنکشن اسٹیشن آیا تو بالکل اندھیرا ہو چکا تھا۔ دوسرے پلیٹ فارم پر فیض آباد جانے والی سرجو ایکسپریس کا اسٹیم انجن شوں شوں کر رہا تھا۔ شاہ جی روشن کو اپنے ساتھ لے کر گاڑی سے اُتر گئے اور چنداں کی نظریں بچا کر فیض آباد والی گاڑی میں چپکے سے جا بیٹھے۔

چندا کی گاڑی چھوٹ گئی تو شاہ جی یعنی عزیز بیگ نے گاڑی کے ٹائیلٹ میں جلدی جلدی اپنی حلیہ تبدیل کی۔ نقلی داڑھی اور سر پر سے دراز زلفوں کا وھیگ اُتارا۔ ڈبے کے جس حصّے میں وہ بیٹھے تھے وہاں ان دونوں کو چھوڑ کر اور کوئی نہیں تھا چھت کی ایک لائیٹ بھی غائب تھی جب وہ اپنی اصلی صورت میں آ گئے تو روشن اُن کو دیکھتے ہی چونک اُٹھی

''چچّا!'' اس نے انتہائی حیرت اور خوف کے لہجے میں کہا

"ہاں۔اورخبر دار چپ چاپ بیٹھے رہنا۔اگر ذرا بھی شور مچانے کی کوشش کی تو گلا دبا دوں گا"

روشن ان کی صورت دیکھ کر مارے خوف کے اس طرح کانپ رہی تھی جیسے قصائی کو دیکھ کر بکری ڈرتی ہے۔آنکھوں میں آنسو آ گئے۔چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں مگر ڈر کے مارے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی

"چل۔اس طرف چپکے سے بیٹھ جا" عزیز بیگ نے پھر دھمکایا "اور یہ سمجھ لے کہ اگر روئی دھوئی یا شور غل مچایا تو تیری ٹانگ توڑ دوں گا۔"

وہ خاموشی کے ساتھ سہم کر عزیز بیگ کے پاس بیٹھ گئی تو اُنھوں نے اپنا کمبل اس پر ڈال دیا

"کچھ کھائے گی؟"

اس نے انکار میں سر ہلا دیا

"چائے۔سموسے۔تجھے بھوک نہیں لگی؟"

روشن نے سب سے انکار کیا اور عزیز بیگ کو ڈر کے مارے چپ چاپ لیٹی تکتی رہی۔ٹرین چلبلا اسٹیشن سے چلی تو عزیز بیگ نے اُٹھ کر پورے ڈبّے کا سرسری جائزہ لیا۔چار پانچ کیبنوں کا چھوٹا سا ڈبہ تھا جس میں مشکل سے پانچ سات آدمی بیٹھے تھے۔وہ ڈبہ کا چکر لگا کر پھر واپس آ گئے ٹرین کے اسپیڈ میں آتے ہی وہ روشن سے مخاطب ہوئے

"ہاں اب بول" وہ کڑے لہجے میں بولے "تو اس بڈھے کے ساتھ اس کے گھر کیوں گئی تھی؟" اس بات کا روشن نے کوئی جواب نہیں دیا چپکے بیٹھی رہی۔اُنھوں نے دوسرا سوال کیا

"تیری ماں کیسے مری تھی؟"

روشن نے اس کا بھی جواب نہیں دیا "مجھے نہیں معلوم۔بابا کہتے تھے کہ اماں کہیں چلی گئیں۔"

"ہوں۔تو پھر تو اپنے گھر کیوں نہیں آئی۔"

"مجھے گھر نہیں معلوم تھا" وہ بولی

"اچھا یہ بتا کہ تیری ماں نے سونے کے بسکٹ کہاں چھپا کر رکھے ہیں" بیگ نے پوچھا

روشن اس سوال پر بھی خاموش رہی۔عزیز بیگ اور بھی سخت لہجے میں بولے

"میں پوچھتا ہوں اس نے بسکٹ کہاں رکھے ہیں؟"

"میں نہیں جانتی" وہ بولی

"نہیں جانتی؟۔اچھا ٹھیک ہے۔ابھی چلتی گاڑی سے نیچے پھینکتا ہوں تجھے ساری ہڈّی پسلی چور ہو جائے گی اور اندھیرے جنگل میں بھیڑیئے اور لکڑ بگھے تیری بوٹیاں نوچیں گے" وہ اس سزا کے بھیانک تصوّر سے ڈر کر رونے لگی۔

"رونا نہیں۔رونا نہیں" اُنھوں نے سمجھایا "دیکھ روشن تیری ماں ریل گاڑی سے کٹ کر مر گئی ہے تجھے میرے ساتھ رہنا ہے اور جو سونے کے بسکٹ تیری ماں کے پاس تھے وہ کسی اور کو نہ ملیں بلکہ تجھے مل جائیں میں اسی کوشش میں لگا ہوں۔اگر تو چاہتی ہے کہ وہ سونا تجھے ملے اور اچھے اچھے گہنے تیرے لئے بن جائیں تو مجھے بتا دے میں تیرے ہی بھلے کے لیے پوچھ رہا ہوں بیٹی"

"اماں نے بتانے کو منع کیا تھا۔" وہ سسکتی ہوئی بولی

"کسی غیر کو بتانے کے لئے منع کیا ہوگا میں تو تیرا چچا ہوں اور تیرے ہی لئے پوچھ رہا ہوں۔"

"کہا تھا چچا کو نہ بتانا نہیں تو وہ ہڑپ لیں گے۔"

"پگلی۔تیری ماں اب کہاں ہے وہ تو مر چکی ہے"

روشن یہ سن کر پھر رونے لگی۔عزیز بیگ دانت پیستے ہوئے بولے

"دیکھ اب اگر تو نہیں بتاتی تو تیرا کلیجہ چاقو سے نکال کر کھا جاؤں گا۔اور تیری دونوں آنکھیں پھوڑ کر باہر پھینک دوں گا"

وہ روتی ہوئی بولی "پیڑ کے چھید میں رکھا ہے۔"

"پیڑ کے چھید میں۔کاہے کا پیڑ ہے؟"

"مہوے کا پیڑ ہے" وہ بولی "دفتی کے ڈبّے میں بسکٹ رکھ کر کپڑے کے تھیلے میں لپٹا ہے۔"

"یہ بات اور کسی کو معلوم ہے؟"

"نہیں"

"میں تجھے اس جگہ لے چلوں گا۔اب تو لیٹ کر سو جا۔"

سلطان پور اسٹیشن آنے سے پہلے روشن سو گئی۔

چندا الہ آباد جانے والی ٹرین میں بے بس و لاچار اکیلی بیٹھی اپنی تقدیر کو رو رہی تھی۔عزیز بیگ اور روشن جب اچانک ٹرین سے غائب ہو گئے تو وہ بڑی فکرمند ہوئی اور بڑی دیر تک ان دونوں کی راہ دیکھتی رہی مگر جب گاڑی پرتا بگڈھ اسٹیشن سے چھوٹ کر دو تین اسٹیشن آگے نکل گئی تو وہ ناامید ہو کر چپکے چپکے رونے لگی۔اب اُسے اس بات کا یقین ہو گیا کہ شاہ جی یعنی عزیز بیگ روشن کو اپنے ساتھ لے کر رفو چکر ہو گئے ہیں۔اب اُس نے بہتے ہوئے آنسوؤں میں شاہ جی کو جی بھر کے کوسا اور بھوکی پیاسی ایک سیٹ پر سکڑ کر لیٹ رہی۔ریل گاڑی جب الہ آباد اسٹیشن پر رکی تو چندا بڑی دیر تک ڈبے کے فرش پر لیٹی رہی مگر جب ڈبے میں اندھیرا ہو گیا تو گاڑی سے اُتر کر پلیٹ فارم کے ایک کونے میں سکڑ کر بیٹھ گئی۔

الہ آباد اسٹیشن پر ماگھ میلہ کی وجہ سے یاتریوں کی بڑی بھیڑ تھی ایسے جگہ جگہ پر چور اور رہزن بھی کافی چاق چوبند ہو گئے تھے جو بھولے بھالے پردیسی یاتریوں کو الٹی سیدھی پٹی پڑھا کر ٹھگ لیتے

تھے۔ چندا پلیٹ فارم کے جس نیم تاریک کونے میں جا کر بیٹھی تھی تھوڑی رات گذرنے کے بعد وہیں چپ چاپ سکڑ کر سوگئی اور رات میں اس وقت جاگی جب ایک پولیس کانسٹبل اس کو اپنے ڈنڈے کی نوک سے کھود کر جگا رہا تھا

''اے عورت - اُٹھ کہاں جائے گی؟''

چندا گھبرا کر اُٹھ بیٹھی اور اپنے سامنے پولیس کے سپاہی کو دیکھ کر گڑ گڑانے لگی

''مور بھیّا - ہمرے گھر والے کا پاؤں ریل گاڑی سے کٹ گوا ہے اسپتال ماں بھرتی ہے۔ ہم اوہی کو دیکھے کھاطر آئے ہیں۔ صبح ہوئی تو چلی جابے''

''اپنا ٹکٹ دکھاؤ۔ کہاں ہے'' سپاہی نے ڈانٹ بتائی

''ٹکٹ'' وہ گھبرا گئی ''ٹکٹ تو بھیّا جی ہمرے پاس نہیں نا۔ جھوٹ کاہے بولی''

''تب تو جیل خانہ چلے کا تیار ہوئے جاؤ شری متی جی - ہاں میں بھی کاہے جھوٹ بولوں''

چندا اس کے تیور دیکھ کر اور زیادہ گڑ گڑائی

ہم کا جیل مانہ ڈالو مور بھائی نہیں تو ہمار گھر والا مر جائی اُو کے پاؤں کاٹا گوا ہے۔ ہم تمہرے پاؤں پڑت ہے حولدار بھائی'' وہ بیٹھے بیٹھے زمین کو چھو کر اپنے ماتھے سے لگانے لگی

''تو تم اپنے گھر والے کی دوا درمن کرتے آئی ہو؟''

''ہاں بھیّا - ہم سیوا نہ کرب تو کون کری پھر۔ ہمری کونو اولاد بھی ناہیں۔'' وہ بولی

''دوا کرے کھاطر روپیّہ بھی لائی ہو؟''

''روپیّہ!'' چندا نے ہاں کرنے سے گریز کرنا چاہا سوچا کہیں بے ٹکٹ ہونے کے جرم میں وہ چھین نہ لے

''ہاں ہاں - تم گھبراؤ نہیں'' سپاہی بولا ''ہم تو تمہیں کا لینے کھاطر یہاں آئے ہیں تمہیں ایسے ہی ٹائم اسپتال لے چلیں گے۔ یہی لگے تو اسپتال ہے بہنی۔''

''اچھا اچھا'' چندا خوش ہوگئی ''تم ہمیں اسپتال پہونچائے دو گے تمہار بہت احسان ہے بھیّا تم ہمار مدد کئے ہو تو اللہ تمہار مدد کری'' یہ کہہ کر وہ اپنی گٹھری کھولنے لگی

''ارے تم گٹھریا کاہے کھول رہی ہو - اُٹھو چلو ہمرے ساتھ''

''پانچ سو روپیہ ہمرے پاس ہے تم رکھ لیو اپنے پاس'' وہ بولی

جب ہم مانگیں گے تب دینا'' سپاہی نے کہا ''ابھی مت نکالو اور اب چلو ہمارے ساتھ''

چندا اپنی گٹھری سمیٹ کر اس آدمی کے پیچھے ہولی۔ وہ آدمی پولیس کانسٹبل نہیں بلکہ خاکی وردی پہنے ہوئے ایک اُٹھائی گیرا تھا جو ریلوے اسٹیشن پر بھولے بھالے مسافروں کو دھوکہ دے کر اور

اُنھیں لوٹ کر چمپت ہو جاتا ہے۔ وہ چندا کو اپنے ساتھ اسٹیشن سے باہر نکال لایا وہاں سے صرف ایک فرلانگ کی دوری پر کالوین اسپتال تھا۔ اسپتال کے پھاٹک پر رات کے دو بجے بالکل سناٹا تھا وہاں پہونچ کر اس آدمی نے چندا سے روپے مانگ لئے

''بہن جی۔ رات کا ٹیم ہے ادھر اُدھر اُچکے گھوما کرتے ہیں اور پردیسیوں کے روپے پیسے لوٹ کر بھاگ جاتے ہیں اس لئے تم اپنے روپے میرے پاس رکھا دو بعد میں لے لینا۔''

چندا تو اس کام کے لئے شروع سے تیار تھی اُس نے جھٹ پٹ اپنی گٹھری کھولی اور میلے میلے مُڑے مُڑے نوٹوں کی گڈی نکال کر اس آدمی کو دے دیا۔

''اب جب تم اپنے روپے مانگو گی تو تمہیں مل جائے گا''

چندا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یہ دونوں اسپتال کے کمپاؤنڈ میں داخل ہوگئے آدمی بولا

''یہ تم نے بہت اچھا کیا بہن جی کہ گاؤں سے یہاں آگئیں۔ ارے پیر کا زخم تو بھر ہی جائے گا مگر اس بیچ ان کے سیوا کی بڑی ضرورت ہے۔''

''میں کروں گی ان کی سیوا'' وہ بولی

''ہاں سو تو ہے'' اس نے کہا ''بس آٹھ دس دن بعد جب ڈاکٹر اُن کو نقلی ٹانگ لگا دے گا تو وہ بیساکھی کے سہارے خود ہی جھما جھم چلنے پھرنے لگیں گے۔''

''چلنے لگیں گے؟'' چندا نے خوش ہو کر پوچھا ''ڈاکٹر کو بھی روپیہ دینا ہوگا''

''ہاں ہاں۔ کچھ نہ کچھ تو دینا ہی ہوگا'' وہ بولا ''میں کہوں گا کہ کچھ کم لے''

دو بجے رات میں اسپتال کے چاروں طرف بلکہ اس کے ہر وارڈ میں مکمل سنّاٹا چھایا تھا۔ ہر وارڈ میں جتنے مریض بیڈ کے اوپر تھے اتنے ہی کتّے نیچے فرش پر سو رہے تھے۔ ایک مریض کو بے حد ٹھنڈک لگ رہی تھی اس لئے وہ سر سے پاؤں تک لال رنگ کا کمبل اوڑھے دونوں پیر سکوڑے تقریباً گٹھری بنا لیٹا تھا۔ سپاہی نے چندا کے کان میں کہا ''سو رہے ہے بہن۔''

چندا اس مریض کے سرہانے پہونچ کر آبدیدہ کھڑی ہوگئی اور ناک سے سوں سوں کرنے لگی

''نہیں نہیں۔ رونا مت بہن جی۔ بس تم چپکے سے اس اسٹول پر بیٹھ جاؤ۔ تھوڑی دیر بعد جب یہ خود سے جاگیں گے تب ہی ان سے باتیں کرنا نہیں تو ڈاکٹر ناراض ہو کر بھگا دیں گے۔''

چندا اسٹول پر بیٹھ گئی اور اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھا کر قادر مطلق سے اپنے گھر والے کی صحت کے لئے چپکے چپکے دعا مانگنے لگی۔ بہتے ہوئے سچے آنسوؤں کے ساتھ بڑی صدق دلی سے دعا مانگی گئی تھی اس لئے مریض کو رحمت خداوندی سے شفایابی کی پہلی قسط اس طرح پہونچی کہ وہ کنمنانے لگا۔ سپاہی جلدی سے دروازہ کی طرف جاتے ہوئے بولا

’’شاید اب اُٹھنے والے ہیں۔ میں ڈاکٹر کو بلانے جاتا ہوں‘‘

دو ہی منٹ بعد جب مریض نے اپنے سر سے کمبل ہٹایا تو اس کا چہرہ دیکھ کر چندا اسٹول سے اچک کر کھڑی ہوگئی اور حیرت زدہ نظروں سے مریض کو دیکھنے لگی۔ وہ مریض اس کا گھر والا کرامت علی نہیں تھا بلکہ ایک جوان عورت تھی جواب بھی آنکھیں بند کئے لیٹی تھی۔ چندا کو چکّر آنے لگا وہ گھبرا کر پھر اسٹول پر بیٹھ گئی۔ چاروں طرف نظریں گھما کر اس نے پولیس کے سپاہی کو ڈھونڈھا جو ڈاکٹر کو بلانے کا بہانہ کر کے چلا گیا تھا اور کہیں اس کا نام ونشان بھی نہ تھا۔ اب تو اس کے پاس پیسوں کے نام پر ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی سب کچھ اس نے سپاہی کو دے دیا تھا۔ اُسے اپنی بے چارگی پر رونا آ گیا وہ وہاں سے ہٹ کر ایک کونے میں بیٹھ کے رونے لگی۔

اسپتال سے نکل کر وہ نخاس کنہ کی مسجد کے نیچے جا کر لیٹ رہی اب اس کی سمجھ میں یہ بات بخوبی آ گئی کہ اُسے دھوکہ دیا گیا ہے اس لئے ریل سے پیر کٹنے کی بات بھی اُسے غلط معلوم ہوئی اُس نے دل میں تہیّہ کیا کہ اب وہ ماگھ میلے میں جا کر کرامت علی کو خود ہی تلاش کر لے گی آخر وہ ہیں تو الہ آباد ہی میں۔ علی الصباح مسجد کے رحم دل نمازیوں سے دو چار روپے پانے کے بعد اس نے قریب کے ایک ڈھابے میں دو روٹیاں کھائیں اور تن بہ تقدیر میلے کی سمت چل پڑی۔

مونی اماوس کا دن تھا سنگم پر پوتر ندیوں میں اشنان کرنے والے شردھالوؤں کی زبردست بھیڑ تھی۔ میلے کے اندر باندھ کے نیچے والے میدان میں کرامت علی اپنے ساتھی مُکٹ کے ساتھ جاڑے کی دھوپ میں لیٹا تھا اور مُکٹ گانجے کی چلم پر کھینچ کھینچ کے لمبے لمبے کش لگا رہا تھا

’’چلو ای مان لیا کہ تم گانجہ چرس نہیں پیتے تو ہمیں تنک ای بتاؤ چاچا کہ پھر تمھری کمائی آ کھِر جات کہاں ہے۔ بوتل پِیَت ہو؟‘‘

’’ارے ہم کونو نشہ نہیں کرت مکٹ بیڑی سگریٹ بھی نہیں‘‘ کرامت نے کہا

’’واہ واہ‘‘ مکٹ نے مذاق اڑایا ’’پھر تمھرے بابا جی بنے سے کونو لابھ ہے۔ بتاؤ‘‘

’’ناہیں۔ کونو لابھ نہیں نا‘‘ کرامت بولا

’’پھر میلہ میلہ کاہے منڈلات پھرت ہو‘‘ مکٹ نے پوچھا ’’اچھا ای بتاؤ بھدری کے میلہ میں کتنا کمائیو‘‘

’’کچھ نہیں‘‘ کرامت علی نے کہا ’’وہاں سے تو خالی ہاتھ لوٹے ہیں‘‘

’’دھت تمہار بھلا ہوئے‘‘ مکٹ بولا ’’ہم سمجھ گئن چاچا۔ تم ایمان دھرم کے چکّر میں پڑے ہو اور ای دھندا ہے نرا بے ایمانی کا۔ بھدری کا ریل گاڑی کی دُرگھٹنا ہمیں آگے پیچھے چار ہجار کموائے دہس اور تم چاچا نیبو نمک چاٹت چلے آئیو اب یہاں ہم تم کا بلاوا ہے تو جس ہم کہی ویسے کرو پھر دیکھو مجا‘‘

’’کا مجا ہے؟‘‘ کرامت نے کہا ’’مرنے والن کی جیب نوچ کھسوٹ کے پیسہ بٹورے ما کو نو مجا ہے مکٹ۔ ارے تم کا بھگوان سے تنک بھی ڈر نہیں لگت‘‘

’’بہت اُپدیش نہ پلاؤ چاچا‘‘ مکٹ ہنس کر بولا ’’ہم اگر بھگوان سے ڈرے لاگی نا تو بھوکن مرجائی۔ کا سمجھیو۔ اب دیکھو کل رات اسٹیشن پر ایک عورت آئے گئی اپنے چنگل ما۔ ہم تو شِکرا ہیں چاچا شِکرا شکار پر جھپٹے تو کچھ نہ کچھ لے ہی لیں گے۔ اُو بے چاری سیدھے سیدھے پانچ سو کی بوہنی کرائے گئیا رے بَدّھی چاہی بدھی کمائے کھاطر۔ لیو ای کھوئے کا لڈّو جھاڑو چاچا۔‘‘

’’لڈّو پیڑا تمہیں کھاؤ۔ ہمیں گر جو مال نہ چہی‘‘ کرامت نے منہ بنایا

’’تمہار مَرجی‘‘ مکٹ بولا ’’ہم تو ای دھوپ ما جائت ہے لیٹے۔ پیٹ بھر کچر کے پوڑی ترکاری کھاوا ہے۔ رات بھرے کی جگائی اوپر سے گانجہ کے نشہ۔ اب تو ہلا نہیں جات ہم سے اگر سو جائیں تو چاچا دھوپ ڈھلے ہمیں جگائے دیہیو۔ اچھا‘‘

’’ذرا یہ تو بتا مکٹ۔ تو نے مہرارو کو کیسے ٹھگا بے چاری کو‘‘

مکٹ لیٹے لیٹے ہاتھ ٹیک کر اُٹھ بیٹھا ’’سالی پانچ سو روپیّہ لے کر اپنے گھر والے کی سیوا کرے آئی رہا۔ او کے ریل گاڑی سے پاؤں کٹ گو اسپتال ما بھرتی ہے۔ سیوا کرے آئی رہی مہرانی جی۔ اب تو اپنے ہی سیوا کرے سے رہی۔ ہہ ہہ ہہ‘‘ وہ پھر ریت پر لیٹ گیا

’’واہ بیٹا مکٹ واہ۔ شاباش‘‘ کرامت علی بولا ’’ابے ہم تیری طرح حرام کی روٹی نہیں کھاتے۔ نالت بھیجتے ہیں ایسی روٹی پر۔ اور سالے سیدھے جہنم میں جاؤ گے‘‘

’’ہہ ہہ ہہ!!!۔ جہنم ماں تم جاؤ گے۔ ہم تو نرک میں جائیں گے چچّا نرک میں۔‘‘

باندھ سے نیچے کی طرف آنے والی ڈھلوان سڑک نہانے والے شردھالوؤں کی بھیگی دھوتیوں سے اتنی سیراب ہو چکی تھی کہ پوری سڑک پر کیچڑ ہی کیچڑ ہو کر بے انتہا پھسلن ہو گئی تھی۔ ایسے راستے پر قدم جما جما کر بھی چلنا آسان کام نہیں تھا۔ چندا میلے میں کرامت علی کو ڈھونڈتی ہوئی باندھ والی سڑک پر آ گئی تھی اور اپنے گھٹنوں کے درد کی تکلیف سے ڈھلوان سڑک پر دھیرے دھیرے نیچے اُتر رہی تھی کہ اچانک میلے میں ایک قیامت آ گئی۔ ننگے سادھوؤں کے اکھاڑے کا ایک چمٹا بدست جلوس ہاتھی گھوڑوں کے ساتھ بند والی سڑک پر گذر رہا تھا کہ یک بیک ایک بدمست ہاتھی جو لال مخمل کی کارچوبی جھول پہنے سب سے آگے آگے چل رہا تھا وہ بے قابو ہو کر تماش بینوں کی بھیڑ کی طرف دوڑ پڑا۔ بے پناہ بھیڑ بھاڑ میں خوف ودہشت نے جان بچانے کے لئے بھاگتے ہوئے لوگوں میں ایسی جان لیوا بھگدڑ مچائی کہ ہجوم کا زبردست ریلا سیلاب کے مانند گیلی ڈھلوان سڑک پر اُمنڈ پڑا اور بے تحاشہ بھاگتے ہوئے لوگوں کی بھگدڑ میں کمزور وناتواں بری طرح روند ڈالے گئے۔ جو اس بھیڑ بھاڑ میں پھسل کر ایک بار گر پڑا وہ پھر نہ

اُٹھ سکااور جو کسی کو بچانے یا سہارا دینے کوایک لمحہ بھی رک گیا وہ خود موت کے منہ میں اس طرح گیا کہ ہزاروں پیر اس کی چھاتی پر سے گذر گئے۔ چندا اور اس جیسے نہ جانے کتنے اس ہنگامے میں کچل گئے۔ایک دو گھنٹے بعد جب بھاگنے والوں کا ریلا تھما تو کیچڑ بھری ڈھلوان سڑک انسانی خون سے لالہ زار بن چکی تھی۔نیم جاں زخمیوں اور کچلے ہوئے انسانی لاشوں کا کھیت پوری سڑک پر بکھرا پڑا تھا۔ پولیس کے سپاہی، اسکاؤٹس اور سیوا سمتی کے رضا کاروں کے ساتھ کچلی ہوئی لاشوں اور زخمیوں کو فرسٹ ایڈ پہونچانے کے لئے بہت سے لوگ دوڑ پڑے۔کرامت علی اور اُس کا دوست مکٹ ڈھال کے نیچے میدان میں لیٹے ہوئے یہ دلدوز منظر دیکھ رہے تھے۔ایسا بھیانک اور دل دہلا دینے والا منظر اُنھوں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔کرامت علی چیخ مار کر رو پڑا

''ہائے ہائے مکٹ۔دیکھ تو بیٹا یہ کیسا غضب ہو گیا''

''ہاں ہاں دیکھ رہا ہوں'' مکٹ اُٹھ کر بیٹھ گیا ''چچّا جلدی چلو۔بس یہی ٹیم کمائی کرنے کا ہے۔''

''کیا کہا؟'' اس نے ڈانٹا ''کہاں چلوں۔کہاں کرے گا کمائی ؟''

''تم نرے بدھو ہو۔بات بہت دیر میں سمجھتے ہو'' مکٹ اس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹنے لگا مرنے والوں کا سامان اور نقدی بٹورنے کی غرض سے مکٹ کرامت علی کو ڈھلوان والی سڑک پر گھسیٹ لے گیا۔ وہ جوان تھا تندرست تھا اس لئے بڑی پھُرتی کے ساتھ زخمیوں کو اُٹھانے اور ساتھ ہی ساتھ ان کا قیمتی مال ہتھیانے کے کام میں جُٹ گیا دراصل مدد کرنے سے زیادہ اس کا یہی مقصد تھا۔ مال غنیمت لوٹ لوٹ کر وہ کرامت علی کی لمبی جھولی میں ڈالنے لگا۔

ذرا ہی دیر بعد کرامت علی کو کراہیت محسوس ہوئی

''دیکھو مکٹ۔مجھ سے یہ پاپ نہیں ہوگا''

''نہیں ہوگا؟'' مکٹ دانت پیس کر بولا ''تو جان لے کہ یہیں ٹپک کر تیرا ٹیٹوا دبا دوں گا سالے ہاں۔''

لوگوں کے ہجوم اور زخمیوں کی چیخ پکار کے باعث اس قدر شور وغل تھا کہ ان دونوں کی باتیں کوئی تیسرا نہیں سن سکتا تھا۔مکٹ کی ڈانٹ سن کر وہ خاموش ہو گیا اور چپ چاپ اس کے ساتھ لگ گیا دونوں پھر زخمیوں کو اُٹھانے اور مال چُرانے میں لگ گئے۔اچانک کرامت علی کو چندا خون میں لتھڑی زمین پر دکھائی دی خون اور کیچڑ میں سوندی ہوئی چندا کے چہرے کو اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر حیرت سے دیکھا اُسے یقین نہیں آیا کہ چندا یہاں کیسے آجائے گی مگر جب اُس کے بائیں ہاتھ کی کلائی پر اُس نے کیکڑے اور سورج کا گودنا بھی دیکھ لیا تو اُسے پکّا یقین ہو گیا کہ وہ چندا ہے۔وہی چندا جو اس کے ساتھ پچھلے بیس برس سے تھی۔مگر اس نے سوچا کہ وہ اکیلے ماگھ میلے میں کیسے آگئی۔کیوں آئی۔کہیں یہ اس کی نظروں کا دھوکہ تو نہیں۔اُس نے مکٹ کو آواز دے کر پکارا جو اس سے تھوڑی دور پر گرے ہوؤں کی

جیبیں ٹٹول رہا تھا۔

''بیٹا مکٹ۔یہ تو میری گھر والی معلوم ہوتی ہے''

کرامت کے آنسو نہیں نکلے اس نے رونا چاہا تب بھی آنسوؤں نے ساتھ نہیں دیا۔چندا کو اس دردناک حالت میں دیکھ کر اس کے اوسان جاتے رہے مگر اس حواس باختگی میں اُسے فوراً ہی اس بات کا خیال آیا کہ روشن کو بھی اس کے ساتھ ہونا چاہئے تھا چندا نے اُسے گھر پر اکیلے تو نہ چھوڑا ہوگا۔پھر وہ کہاں گئی۔کہیں وہ بھی اس بھیڑ میں کچل نہ گئی ہو۔اس کا ذہن اسی اُدھیڑ بن میں تھا کہ مکٹ نے اس کا کندھا ہلا کر پوچھا

''کون ہے چچا یہ؟''

''یہ میری گھر والی ہے'' کرامت علی کا جواب سننے سے پہلے ہی مکٹ چندا کی صورت دیکھتے ہی اپنی جگہ پر سن ہو گیا۔یہ تو وہی عورت تھی جسے پچھلی رات اس نے دھوکہ دے کر پانچ سو روپے اینٹھ لئے تھے مگر فوراً ہی مطمئن بھی ہو گیا کیوں کہ یہ لاش اب اس کو پہچان نہیں سکتی تھی اس نے دل میں سوچا کہ چلو اچھا ہوا کہ کچل کر مر گئی۔اگر صرف زخمی ہوتی تو مکٹ خود اپنے ہاتھوں سے اس کا گلا گھونٹ کر مار ڈالتا۔

''مکٹ بیٹا۔یہ تو جدائی کا داغ دے گئی مگر اس کے ساتھ میری بیٹی بھی تھی وہ کہاں ہے۔اُسے کہاں ڈھونڈھوں''

''بیٹی اس کے ساتھ نہیں تھی۔یہ تو اکیلی تھی'' مکٹ جلدی سے بول پڑا

''یہ تو کیسے جانتا ہے۔تجھے کیا معلوم کہ یہ اکیلی تھی''

مکٹ کو اپنے جواب کی غلطی کا فوراً احساس ہو گیا ''ارے میں نے تو ایسے ہی کہا تھا۔چچّا تم گھبراؤ نہیں۔ہمت اور سمجھداری سے کام لو۔''

''کیا کروں'' وہ رونے لگا

''یہ رونے دھونے کا سمے نہیں ہے'' مکٹ نے سمجھایا ''تم چاچی کی مٹی یہیں رہنے دو میں یہیں بیٹھا رہوں گا تب تک تم بیٹا کو ڈھونڈھ لو۔آگے پیچھے کہیں ہوگی۔میں تو اس کو پہچانتا نہیں''

''اگر پولیس والے لاش اٹھوا لے گئے تو پھونکوا دیں گے'' کرامت نے چنتا ظاہر کی

''میں یہیں موجود رہوں گا چچا۔تم چنتا نہ کرو۔جاؤ میں بیٹھا ہوں''

مکٹ کی بات مان لینے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کرامت وہاں سے اُٹھ کر میلے میں چاروں طرف روشن کو ڈھونڈھتا پھرا مگر وہ کہیں نہ ملی یہاں تک کہ شام ہونے کو آگئی تو وہ نا اُمید ہو کر پھر باندھ والی ڈھلوان سڑک پر لوٹ آیا۔اس جگہ نہ تو اُسے مکٹ ملا اور نہ چندا کی لاش کیوں کہ حادثہ کے دو ہی گھنٹہ کے اندر اسپتال اور سیوا سمتی کے والینٹیر مرنے والوں اور زخمیوں کو اُٹھا کر اسپتال لے گئے

تھے۔مکٹ کو تلاش کرتے کرتے رات ہوگئی اور کرامت علی پریشان ہوگیا۔جب اسپتال اور میلے کی کوتوالی میں بھی چندا کی لاش نہ ملی تو وہ نا اُمید ہوکر بیٹھ رہا اور دوسرے دن اپنے گھر جائس لوٹ گیا

★★★

جب کرامت علی اپنے گھر پہونچا تو دروازے پر تالا لگا پایا۔سب سے پہلے بٹّن اپنے گھر سے نکل کر آئی اور کرامت علی کو بھلا چنگا پیروں والا دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی اُس نے کرامت کو بتایا کہ چندا پرسوں روشن کو لے کر ایک شاہ صاحب کے ساتھ الہ آباد گئی ہے کیونکہ شاہ صاحب نے بتایا تھا کہ کرامت علی ریل گاڑی سے گر پڑا ہے جس کی وجہ سے اس کا ایک پاؤں کٹ گیا ہے۔کرامت علی دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا اور رو رو کر اس نے محلّہ والوں کو چندا کے سانحہ اور اس کی المناک جدائی کی روداد سنائی۔پڑوسیوں نے افسوس اور ہمدردی ظاہر کی دو ایک نرم دل عورتیں اس کے ساتھ روئیں بھی۔ابراہیم اپنے گھر سے کھانا اور عیدو ایک پیالہ دودھ لایا۔بٹّن نے چائے پلائی۔خیراتی نے آبدیدہ ہوکر پوچھا ''اور روشن کہاں گئی خالو؟''

کرامت علی پھر دھاڑیں مار کر رویا ''بیٹا اس کا کچھ پتہ نہیں چلا۔سارے میلے میں ڈھونڈھا لیکن وہ نہیں ملی۔مجھے تو صرف چندا کی لاش ملی تھی۔''

''چچّا۔ہوسکتا ہے وہ بھی....''ابراہیم نے پوری بات نہیں کہی

''ہاں'' کرامت بولا ''اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جو آدمی شاہ صاحب بن کر آیا تھا اور میرے بارے میں جھوٹ بول کر چندا اور روشن کو اپنے ساتھ لے گیا تھا روشن اُسی کے پاس ہو۔''

''کون ہوسکتا ہے وہ آدمی''عیدو نے پوچھا

''کون ہوسکتا ہے۔یہ سوچنا پڑے گا''

رات میں کرامت علی سونے کے لئے لیٹا تو بڑی دیر تک چندا کی یاد میں آنسوؤں سے روتا رہا اُسے دیوا شریف کے میلے والا وہ نجومی بھی یاد آیا جس نے بتایا تھا کہ چندا بہت دن جئے گی اور اس کے پیر کٹنے کے بعد بھی بہت دنوں زندہ رہے گی اُس نجومی بزرگ کو کرامت علی نے دل ہی دل میں سو گالیاں دیں کیوں کہ نہ تو اس کا پیر کٹا تھا اور نہ چندا ہی زندہ رہی۔پھر اس نے سوچا وہ آدمی کون ہوسکتا ہے جو چندا اور روشن کو بہکا کر اپنے ساتھ لے گیا تھا لیکن بہت سوچنے کے بعد بھی وہ کسی نتیجے پر نہیں پہونچا۔

دوسرے دن کرامت علی نے اپنی خاندانی عبا قبا پہنی جھولی اٹھائی اور پہاڑی جریب زیتونی لے کر جمعرات کی خیرات بٹورنے نکل پڑا۔پشتینی تکیہ دار کو عام فقیروں کی طرح بھیک مانگنا ورثہ میں نہیں

ملا تھا مگر آج نوچندی جمعرات تھی بہت دنوں کے بعد وہ سیّدوں کے محلّہ میں سائل بن کر نکل گیا پتلی پتلی گلیوں میں لکھوری اینٹوں سے بنی دو دو تین تین منزلہ خستہ حال اجڑی حویلیاں جن میں روشنی اور صاف ہوا کم اور گندگی زیادہ تھی پنڈول مٹی سے لپی پُتی سیلن زدہ دیواریں۔چیختی دھنّیوں اور ٹوٹے پھوٹے دروازوں والے ان محلّات میں نیک چلن و پاک نہاد سیدانیاں اپنے پُرکھوں کی نسبی برتری اور نسلی نجابت کو کلیجے سے لگائے بیٹھی تھیں انھیں اپنے مجازی خداوندوں سے صرف جمعرات جمعرات کالی چکنی مٹّی سے سر دھونے اور ایک پَری کڑوے تیل کے عطائے کرم پر ''آرائش خم کاکُل'' کی اجازت تھی البتہ ان کی بہو بیٹیوں کو پردے کے پورے التزام کے ساتھ صرف نوچندی جمعرات کی مجلسوں میں گھر سے باہر جانے اور بلند سے بلند آواز میں حسین مظلوم کا نوحہ و ماتم کرنے کی اجازت تھی۔اس محلّہ میں بڑی حویلی نام کی سچ مچ ایک بڑی حویلی تھی مگر خاتمہ زمینداری کے بعد اس میں نہ تو پہلی جیسی رونق رہ گئی تھی اور نہ پہلے والی شان و شوکت البتہ سائلوں کو اس ڈیوڑھی سے بھیک اب بھی مل جاتی تھی وہ بھی صرف جمعرات جمعرات کیوں کہ سیدانی بی یعنی زہرا بی بی پنج وقتہ نماز کے بعد پروردگار عالم سے اپنے شوہر میر فدا حسین کی رفاقت اور اپنی بیماری دور ہونے کی دعا مانگنے کے ساتھ جمعرات کے دن فقیر فقرا کو بڑے خلوص کے ساتھ خیرات باٹتی تھیں۔

بڑی حویلی کی ڈیوڑھی پر پہونچ کر کرامت علی نے صدا لگائی ''دل میں علی علی وجگر میں علی علی''

اس وقت زہرا بی اپنے پورے پنڈے میں لگےسن لائیٹ صابون کے جھاگ کو کھارے پانی سے دھو دھو کر نہا رہی تھیں اور بوڑھی ملازمہ مریم بوا مٹّی کی ہانڈی میں کڑوے تیل اور سل بٹّے پر پسے مصالحہ کا سالن بھون رہی تھیں۔دو مٹھی آٹا ہی تو دینا تھا لاڈلی المونیم کی رکابی میں آٹا لے کر فقیر کو دینے کی غرض سے لمبی دہلیز سے ہوکر پھاٹک پر آئی تو سامنے اپنے خالو کرامت علی کو کھڑا دیکھ کر گھبرا گئی اُسے یہ بات تو اپنی ماں سے معلوم تھی کہ جائس کا کرامت علی درویش اس کا حقیقی خالو ہے مگر اس نے خالو کو ایک دو بار بہت سرسری طور پر دیکھا تھا آج اچانک اُسے اپنی ڈیوڑھی پر کھڑا دیکھ کر لاڈو کو بڑی حیرت ہوئی اُس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا ''شاہ جی آپ کا نام کیا ہے؟''

''مجھے کرامت علی کہتے ہیں بیٹی''

''کیوں کہتے ہیں؟'' وہ جھٹ بولی ''جب آپ کے اندر بھیک مانگنے کے سوا اور کوئی کرامت ہے ہی نہیں تو ایسا نام رکھنے سے کیا فائدہ۔''

کرامت علی کوئی جواب دینے کے بجائے چپ چپ سر جھکا کر وہیں زمین پر بیٹھ گیا

''ٹھیک کہتی ہو بیٹی'' وہ مری مری آواز میں بولا ''مگر میں ہمیشہ بھیک نہیں مانگتا ایک ہی دن کی بدبختی نے گھر والی اور بیٹی کو مجھ سے جدا کر دیا۔اب تو اکیلی جان ہوں۔''

لاڈلی اس کی مصیبت کو سن کر نرم پڑ گئی ''مجھے بہت افسوس ہے خالو'' وہ بولی

''خالو!'' سیدانی بی کی حویلی سے اپنے لئے خالو کی آواز سن کر کرامت علی بھوچکّا رہ گیا

''میرا نام لاڈلی ہے'' وہ بولی ''میں زرّیں کی بیٹی ہوں''

''ارے تو زرّو کی بیٹی ہے۔ قدیر کی بہن؟''

''ہاں خالو'' وہ بولی ''مجھے یہاں آئے ایک مہینہ ہو گیا تب سے امّاں کی کوئی خیریت نہیں ملی بھیّا نے بھی کوئی خط نہیں بھیجا۔''

لاڈلی کو دہلیز میں بہت دیر ہوئی تو زہرابی بی نے حمام سے آواز دے کر اُسے بلایا۔ لاڈلی جلدی سے کرامت کی جھولی میں آٹا ڈال کر اندر چلی گئی۔

بڑی حویلی والی زہرابی بی کے دور و قریب کے رشتہ دار شروع شروع میں لاڈلی کو ایک شجر ممنوعہ ہی سمجھتے رہے مگر رفتہ رفتہ جب سیدانی بی اُسے اپنے ساتھ لے کر ہر چھوٹی بڑی تقریب اور مجالس میں آنے جانے لگیں اور خود لاڈلی کی میدے گلاب جیسی رنگت پر دلکش ناک نقشے اور بات چیت میں سنجیدگی کا دبدبہ اُس کی ہم سِن لڑکیوں نے قبول کر لیا تو دھیرے دھیرے سب ہی اس کی طرف ملتفت ہونے لگے۔ زہرابی بی کے سگے بھتیجے ماجد عرف مِلّی میاں تو لاڈلی کو اپنے گھر کے پنجڑے میں بند ایک خوبصورت چڑیا تصوّر کرتے تھے اس لئے صبح شام خوب بن سنور کر اور کپڑوں پر عطر وغیرہ چھڑک کر اپنی پھوپھی زہرابی بی کی خدمت میں بلا ناغہ حاضر ہو کر آداب بجالانے لگے مگر اصلِ مقصد لاڈلی کو دیکھنے کا ہوتا تھا اور جب تک گھر بھر میں گھوم گھوم کر لاڈلی کے دیدار سے اپنی آنکھیں سینکتے تب تک برابر اپنی بے ہنگم مونچھوں کو یا تو چٹکی سے مروڑتے یا لبوں کے کنارے سے دبا کر خوامخواہ چُوستے رہتے۔ لاڈلی کو ان کی ذات اور خصوصاً ان کی اس حرکت سے بڑی گھن لگتی تھی۔ کبھی کبھی تو وہ پوچھ بیٹھتی ''یہ آپ اپنی مونچھوں میں ہر وقت جھاڑو کیوں لگایا کرتے ہیں؟'' یا ''کیا آپ کی مونچھوں میں چیونگ گم چپکی ہے۔'' مگر چونکہ وہ زہرابی کے اکلوتے بھتیجے تھے اور اُنھیں زہرابی نے لاڈلی کو اردو اور انگریزی پڑھانے کا من پسند کام دے رکھا تھا اس لئے وہ ماجد سے اظہار بیزاری بھی نہیں کر سکتی تھی۔ جتنی دیر وہ لاڈلی کو انگریزی پڑھاتے اتنی دیر کسی نہ کسی بہانے اور کسی نہ کسی غلطی پر لاڈلی کو کبھی ہاتھوں پر کبھی گالوں پر میٹھی میٹھی چٹکیاں کاٹ کر تنبیہ بھی فرماتے تھے۔ لاڈلی بھی باز نہ آتی پوچھتی ''ماسٹر صاحب بندر کو انگریزی میں کیا کہتے ہیں'' یا ''ماسٹر صاحب بھالو کے بدن سے بدبو کیوں آتی ہے؟'' یا ''لکڑ بگھّا کا منہ کالا کیوں ہوتا ہے؟''

مِلّی صاحب زیادہ تر ان سوالوں کا جواب بڑی سنجیدگی سے دیتے تھے مگر کبھی کبھی جز بز ہو کر لاڈلی سے پوچھ بیٹھتے ''تم نے لکڑ بگھّا کہاں دیکھا ہے؟ - تمہیں کیسے پتہ چلا کہ بھالو گندھاتا ہے''

تو لاڈلی جواب دیتی ''مجھے نہیں معلوم - میں نے تو اندازے سے کہا تھا''

''سچ سچ بتاؤ - تمہیں نہیں معلوم کہ بندر کو انگریزی میں کیا کہتے ہیں؟'' وہ پوچھتے

''شاید مِلّی کہتے ہیں''

''غلط - منکی کہتے ہیں'' پھر اس غلطی پر جب وہ لاڈلی کے گال میں بکوٹا مارتے تو وہ بڑی ناپسندیدگی سے کہتی ''ہٹ''

اور وہ جلدی سے بول اُٹھتے ''اچھا اچھا - چلو آگے پڑھو''

لاڈلی اُن کے شترغمزوں کو جبراً و قہراً برداشت کر رہی تھی

بڑی حویلی کے پڑوس میں درمیانی درجہ کے ایک سابق زمیندار اور مقامی ٹاؤن ایریا کمیٹی کی ممبری کے لئے ہر بار الیکشن ہار جانے والے سیّد ہادی صاحب کا مکان تھا جو ان کے خلد آشیانی دادا جان مرحوم نے نواب ''نصیرالدین حیدر شاہ کے زمانہ میں تعمیر کروایا تھا۔ جس کی تیسری منزل ان کے ابّا حضور نے اور دوسری منزل خود ہادی صاحب نے ختم کر کے سیلن لگی دیواروں اور چھتوں کی دیمک خوردہ دھنیوں کو عہد ماضی کی رئیسانہ شان اور زمیندارانہ ٹھاٹ باٹ کی اُجڑی ہوئی نشانیوں کے بطور محفوظ رکھنے کی سعی میں گُمّا اینٹوں اور بانس بلّیوں کے اُڑانے سے روک رکھا تھا۔ چوڑی چوڑی دالانوں میں سُتلی سے بُنی ہوئی بڑی بڑی پلنگیں بے رنگ و روغن کی کار چوبی مسہریاں، بڑے بڑے تخت، کرسیاں تپائیاں، آفتابے، سلفچیاں اور دنیا بھر کا بے کار کباڑ - اب تو یہی کچھ ان حویلیوں میں باقی رہ گیا تھا کیوں کہ ان فضول اور بے مقصد چیزوں کو ساہوکار نے رہن و بیع کے لائق نہیں سمجھا تھا۔

پچاس سے کچھ اوپر کے ہٹّے کٹّے سید ہادی اپنی رفیقۂ حیات کے مرنے کے بعد سے اپنے سرخ و سفید چہرے پر کھچڑی مونچھوں کو خضاب پلا پلا کر سینگ کٹے بچھڑوں میں شامل ہونے کی ہمہ تن کوششوں میں لگے رہتے تھے۔ گھر میں شادی شدہ بیٹی سکینہ کے علاوہ ایک بڑی پُر بہار ہستی سیّد ہادی کے اکلوتے بیٹے وقار کی ذات تھی جس نے خاندان کے بے رنگ و بے مزہ ماحول میں اُمیدوں اور تمنّاؤں کے ڈھیروں چراغ سے گھر بھر میں اُجالا کر رکھا تھا۔ سیّد ہادی کا یہ جوان خوش رو اور خوش وضع مگر بے حد سیدھا بیٹا وقار حسین جو لکھنؤ یونیورسٹی سے بی۔ اے (آنرز) کرنے کے بعد قصبے کے اور بہت سے پڑھے لکھے بے روزگار جوانوں کی طرح بیکاری کے دن گذارنے کے بجائے نوکری کے لئے مختلف مقابلہ کے امتحانوں میں بڑی تندہی سے قسمت آزما رہا تھا مگر ابھی تک کسی مقابلہ میں اس کا چناؤ نہیں ہوا تھا۔ ہادی نے اس پر ایک ستم یہ توڑا کہ اس کی شادی دو سال پہلے سلطان پور ضلع کے ایک سابق تعلقہ دار کی اُس بیٹی سے کر دی جو خوبصورت تو بہت تھی مگر جو فطری طور پر دماغی نا بالغی کا شکار اور عقل و شعور کی بالیدگی سے یکسر مبرّا تھی۔ اس وجہ سے اچھے اور بُرے کی تمیز بھی اس میں نہ تھی نہ ہی جسمانی بلوغیت اور شرم و حیا کا کوئی فطری احساس اس میں تھا۔ اس کا بڑا بھائی ایک چھوٹا موٹا رئیس زادہ تھا اُس نے بہن کی خانہ آبادی

کے لئے اس کی خوبصورتی کے ساتھ جہیز اور روپوں کی ریل پیل سے ہادی کی آنکھوں میں بھر پور چکا چوندھ کردیا۔ دولہن رخصت کرا کے گھر لائے تو جلد ہی اس کی دماغی کم زوری کی حقیقت سب پر ظاہر ہوگئی۔ حجلۂ عروسی میں بیٹھ تو گئی مگر جب وقار نے بھاری اور جڑاؤ زیورات سے لدے پھندے اس کے نرم ونازک بدن کو چھوا تو وہ اچک کر کھڑی ہوگئی۔ وقار نے پوچھا

''کہاں جارہی ہو؟''

''باجہ بجانے'' وہ بڑی سنجیدگی سے بولی

''کیا؟'' وقار حیرت زدہ رہ گیا

وہ ہی ہی کر کے ہنسی ''ہمیں لیمن چوس کھلاؤ گے؟'' اس نے پوچھا

''تم بیٹھو تو سہی'' وقار نے اس کا ہاتھ تھاما ''تمہیں حلوہ سوہن کھلاؤں گا''

''بھگ'' کہہ کر وہ پھر بیوقوفوں کی طرح ہنسی ساتھ ہی فرش پر رکھے ہوئے چھوٹے سے نقشین مرادآبادی اُگالدان کو اُٹھا کر وقار کی شیروانی کے جیب میں گھسیڑ نے لگی

''اِسے چُرالے جاؤ۔ میں کسی کو نہیں بتاؤں گی''

''یار تم تو بڑی دلچسپ ہو'' وقار نے کہا ''اچھا مذاق کرلیتی ہو۔ مجھے یہ بے تکلفی پسند ہے۔''

یہ کہہ کر وقار نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھالیا۔ شاید قدرت کو اس رات یہی منظور تھا کہ وہ اس قابل رحم لڑکی کو اپنے رفیق زندگی کی قُربتوں سے روشناس کرادے اس لئے تھوڑی دیر کے لئے اس کا دماغ اس حد تک مائل بہ سکون ہوگیا کہ وقار کو کچھ پتہ نہ چلا۔ پھر رات ہی میں کسی وقت وہ کمرے سے نکل کر دالان میں سوئی ہوئی ایک مہمان خاتون کے سرہانے بیٹھ کر پنجابی زبان میں نوحہ پڑھنے لگی ''اُٹھو مُنڈ و بی کہتی تھیں سیدانیاں''

مائیکے سے ساتھ میں آئی ہوئی جہاندیدہ خاتون نے جیسے تیسے اس کو پھر کمرہ میں پہونچادیا۔ دوسرے دن سویرے ہی مائیکے سے چوتھیا رُسے وداع کرانے آپہونچے۔ دو دن بعد جب وقار دلھن کو پھر رخصت کرالایا تو اس بار ہادی سمیت گھر کے سب ہی لوگوں پر اس کی ذہنی بیماری آشکار ہوگئی۔ پہلے ہی دن ہادی نے از راہ تحکّم خُسرانہ کھانا کھانے کے بعد دولھن سے پان کی فرمائش کردی تو اس نے ایک بہت بڑے پان کے بیڑے میں پسی ہوئی ہلدی دھنیا دنت منجن کا پیسٹ اور نہ جانے کیا الا بلا ڈال کر اپنے ہاتھ سے خُسر معظم کے منہ میں گھسیڑ نا چاہا

''ارے پان کھائیں سیّاں ہمارو'' ہادی نے پان چبایا تو قیامت آگئی۔

اسی طرح کے دو ایک اور واقعات سے سبھوں کو اس کی حقیقت معلوم ہوگئی۔

ہادی نے بہت جلد اس نیم پاگل بہو سے چھٹکارا پانے کی ترکیب سوچ لی شادی کے تین ماہ

بعد اپنی بیٹی سکینہ اور بہو کو لے کر وہ نجف ہند جوگی رمپوری (بجنور) کی درگاہ پر منّت براری کے لئے گئے۔ مقصد یہ تھا کہ سکینہ اپنے گم شدہ شوہر کی واپسی کے لئے منت مانے اور ہادی پاگل بہو کی اچھائی کے لئے۔ مگر جب وہ جوگی رمپوری کی درگاہ سے گھر واپس آئے تو بہو کے کچھ کپڑے ہی لے کر لوٹے اور لوگوں کو اس کے اچانک مرنے کی دردناک خبر یہ سُنائی کہ اُسے درگاہ کے باغ میں کالے سانپ نے ڈس لیا تھا اور وہ اُسے مولا مشکل کشا کی درگاہ جوگی رمپوری میں سپرد خاک کر آئے ہیں۔ پاگل بہو کی موت اس پر تدفین کے لئے مولا علی کی درگاہ میں زمین پانا۔ کسی نے کُھل کر افسوس نہ کیا۔ لڑکی کے رشتے دار بھی رو پیٹ کر چپ ہو گئے اور ہادی نے اس کی موت کے سارے رسوم ایک ایک کر کے ادا کر دیئے۔

وقار نے جس روز لاڈلی کو بڑی حویلی کی چھت پر دیکھا تھا اسی روز سے اس کی چاہت میں مضطرب رہنے لگا۔ دن میں کئی کئی بار اپنے مکان کی چھت پر آتے جاتے وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے۔ نظریں چار ہوئیں مگر بولنے یا بات کرنے کی ہمت بہت دنوں تک کسی کو نہ ہوئی۔ محبت بھرے دلوں میں ایک دوسرے کی طرف جو فطری کشش ہوتی ہے آخر اس نے ایک دن ان دونوں کو بہت قریب کردیا۔ وقار نے ہمت کر کے پوچھا

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''کیوں؟'' لاڈلی نے تیوری چڑھائی ''کیوں نام بتاؤں۔ کیا کام ہے آپ کو؟''

''ارے ارے ارے'' – وہ گھبرا گیا ''بھائی میرے پڑوس میں رہتی ہو نا تو تمہارا نام جان لینے میں کیا حرج ہے۔ شاید یہ جانکاری کسی دن کام آجائے۔ ویسے کیا تمہیں میرا نام معلوم ہے؟''

''ہاں معلوم ہے'' وہ بولی ''سب لوگ آپ کو وقّن کہتے ہیں''

''اور تمہیں سب لوگ کیا کہتے ہیں؟''

''بتاؤں کیا کہتے ہیں؟ –'' اس نے ڈانٹ کر آنکھیں تروریں۔

''ارے نہیں نہیں۔ جانے دو۔ میں نے تو ویسے ہی پوچھا تھا''

''کیوں پوچھا تھا؟'' اُس نے پھر ڈانٹا

''باپ رے – بھئی غلطی ہوئی مجھ سے'' وقار ڈر گیا

''غلطی ہوئی'' وہ قدرے نرمی سے بولی ''اچھا ہوا کہ آپ کو غلطی کا جلد ہی احساس ہوگیا اور آپ نے معافی مانگ لی ورنہ میں اپنا نام کبھی نہ بتاتی۔ میرا نام لاڈلی ہے۔ سن لیجئے''

''سن لیا۔ سن لیا'' وہ بولا ''تو اب میں جاؤں؟''

''ٹھہریئے'' اُس نے سختی سے کہا ''جب تک میں نہ کہوں یہاں سے مت ہلیئے گا''

''ارے واہ – چلیئے بھائی نہیں ہلوں گا بس'' وہ بولا

''اب یہ بتایئے کہ آپ کے ابّا میاں اس وقت کہاں ہیں۔ جلدی بتایئے مجھے کچھ بتانا ہے ان کو''

''کیوں؟ - دیکھو اب میں تم سے کچھ نہ پوچھوں گا مجھے جانے دو اور خدا کے لئے ابّا میاں سے کچھ نہ کہنا نہیں تو غضب ہو جائے گا''

''خیر جایئے'' وہ نرم لہجہ میں بولی ''اس وقت میں نے چھوڑ دیا مگر کل اسی وقت آپ یہاں پھر آئیں گے نا - آئیں گے کہ نہیں؟''

''ہاں ہاں - آ جاؤں گا - آداب عرض'' وہ سلام کر کے جلدی میں بھاگنے لگا

''رکیئے رکیئے - کل کتنے بجے آیئے گا؟''

''گیارہ بج کر تیس منٹ پر''

''جی نہیں - پچیس منٹ پر'' وہ بولی

''بہت اچھا''

دوسرے دن مقررہ وقت پر وہ پھر اپنی چھت پر آیا۔ لاڈلی نے کہا

''آپ سات منٹ دیر سے کیوں آئے؟''

''سات منٹ - نہیں تو - میں ٹھیک وقت پر آیا ہوں'' وقار نے کہا

''تو کیا میں جھوٹ بولتی ہوں'' لاڈلی نے ڈانٹا ''دکھایئے اپنی گھڑی۔ کہاں ہے۔''

''گھڑی - گھڑی تو نہیں لایا - ہو سکتا ہے دیر ہو گئی ہو۔ ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے''

''میں نے سنا ہے آپ اپنے ابّا سے بہت ڈرتے ہیں'' لاڈلی نے کہا

''ہاں - ڈرتا ہوں''

''مجھ سے بھی آپ کو ڈر لگتا ہے؟''

''جی - آپ سے بھی ڈر لگتا ہے''

''آپ سب ہی سے ڈرتے ہیں کیا؟''

''نہیں - نہیں ابّا سے ڈرتا ہوں بس''

''کیوں ڈرتے ہیں'' لاڈلی نے پوچھا ''کیا آپ کوئی غلط کام کرتے ہیں؟''

''نہیں۔ غلط کام تو نہیں کرتا۔ ویسے اُن سے سب ہی لوگ ڈرتے ہیں۔''

''اچھا میں آپ کے گھر کسی روز آؤں گی''

''سکینہ آپا سے ملنے؟'' وقار خوش ہو کر بولا

''اونہک۔ مجھے آپ کے ابّا جان سے ملنا ہے'' لاڈلی نے سنجیدگی سے کہا

''ابّا جان سے ملنے؟ - کیوں کیوں؟''

''آپ کے بارے میں اُن سے کچھ پوچھنا ہے''

''کیا پوچھنا ہے'' وقار گھبرایا ''جو پوچھنا ہے مجھ سے پوچھ لو''

''میں نے سنا ہے آپ نے ایک پاگل لڑکی سے شادی کی تھی جو بعد میں مر بھی گئی''

''ہاں'' وقار نے سر جھکا کر مری آواز میں جواب دیا

''کیسے مری؟''

''اُسے سانپ نے ڈس لیا تھا'' وقار نے کہا

''اس بات کو کتنا عرصہ ہوا؟''

''دو سال ہو گئے''

''مگر ایک پاگل لڑکی کو آپ نے شادی کے لئے پسند کیسے کیا - کیا وہ بہت خوبصورت تھی؟''

''شادی ابّا جان نے طے کی تھی'' وقار نے جواب دیا

''اور آپ نے جھٹ سے کر لی - کیوں کر لی؟ - خوبصورت تھی - پڑھی لکھی تھی۔ جہیز زیادہ ملا تھا۔ یا بس ابّا جان نے حکم دیا اور آپ نے ایک لائق فرزند کی طرح قبول کر لیا''

''ارے صاحب - اب تو وہ مر چکی ہے۔ کیا فائدہ ہے اس کے ذکر سے'' وقار بولا

''وہ لڑکی آپ کے ساتھ کتنے دنوں رہی؟''

''بس دو مہینے''

''کبھی اس کی یاد آتی ہے؟''

''نہیں''

''نہیں؟'' لاڈلی نے دھیرے سے کہا ''یعنی آپ اوّل درجہ کے بے مروّت انسان ہیں''

''ایں!''

''اچھا میرے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے'' لاڈلی نے پوچھا ''سچ سچ بتایئے گا''

''سکینہ آپا کہتی ہیں کہ - لاڈلی یعنی کہ تم - اور میرا یعنی کہ میں - جوڑ بہت اچھا......''

''میں نے آپ کا خیال پوچھا تھا'' لاڈلی نے ڈانٹا ''سکینہ آپا کا نہیں''

''میرا خیال معلوم کر کے آپ کو غصہ تو نہ آئے گا''

''ہو سکتا ہے۔ مگر آپ کچھ کہیئے بھی تو'' وہ بولی

''آپ چاندی کی طرح حسین - گلاب کی طرح نازک - اور بجلی کی طرح.....''

''کیا؟'' لاڈلی کے ڈانٹتے ہی وقار وہاں سے نو دو گیارہ ہو گیا۔

★ ★ ★

سیّد ہادی اپنے طرز کے بڑے انوکھے اور بے مثل انسان تھے۔ زندگی میں ایسے ایسے حیرت انگیز کارنمایاں انجام دیئے تھے جو ریکارڈ رکھنے کے لائق تھے۔ مزاج سنگدلانہ حد تک ایذا رساں

تھا۔ غصّہ گھٹّی میں پڑا تھا شاید غصّہ ہی کی حالت میں پیدا ہوئے تھے۔ بے حد ضدّی اور حد درجہ جھگڑالو انسان تھے۔ ایک انوکھا کام اُنھوں نے یہ کیا تھا کہ اپنے داماد کے کسی ناپسندیدہ فعل پر طیش میں آ کر اس کے سر کے بال داڑھی مونچھیں اور بھویں تک اُسترے سے مونڈوا کر اُسے اتنا شرمندہ کیا کہ بے چارہ مارے شرم دیس بدر ہو گیا اور چھ برس ہو جانے پر بھی واپس نہیں آیا تھا۔ اپنی الھڑ جوانی میں ہادی میاں نے ایک کام یہ کیا تھا کہ ۱۹۳۵ء میں جب ٹاؤن ایریا کمیٹی کا پہلا الیکشن ہوا تو اس میں ان کے والد گرامی میر الطاف حسین نے چیرمین کے امیدواروں میں اپنا پرچہ داخل کر دیا عین ووٹنگ کے روز ہادی کو پتہ چلا کہ عیدو کے باپ کریم گھوسی نے ان کے مخالف کو اپنا ووٹ دیا ہے پھر کیا تھا بھرے مجمع میں کریم کی داڑھی دونوں مٹھیوں میں پکڑ کر بھرپور لٹک گئے اور منٹوں میں کھال سمیٹ پوری داڑھی جڑ سے اکھاڑ لی۔ دوسری جنگِ عظیم کے زمانہ میں حکمراں فرنگیوں کی طرف سے زمینداروں کو من مانی کرنے کی پوری چھوٹ تھی تو اپنے کسی کاشتکار کے بروقت لگان نہ ادا کرنے پر ہادی نے بیچ بازار میں اس کے گوبھی اور مولیوں کے ڈھیر پر کھڑے کھڑے پیشاب کر دیا اور جب اُس نے احتجاج کیا تو اپنے کارندوں کی مدد سے اُس کو چڑسے کے پُڑ میں بٹھا کر کنویں میں لٹکا دیا۔ غرض کہ ان کا مطمحِ نظر یہ تھا کہ کام ایسا کیا جائے جو کم ہی لوگوں نے کیا ہو اور اس سے کوئی نہ کوئی ریکارڈ بھی قائم ہو سکے۔

ایک دن سکینہ نے باپ کا مزاج کچھ ہموار پا کر ایک تجویز رکھی

''ابّا - اب تو کافی دن ہو گئے وقّن کی شادی کے لئے کچھ سوچئے''

''وقّن نے کہلایا ہے کیا؟'' اُنھوں نے جھٹ سوال کیا

''نہیں نہیں - یہ تو میں اپنی طرف سے کہہ رہی ہوں''

تو پھر ضرور تم نے کوئی لڑکی وقّن کے لئے پسند کی ہوگی''

''ہاں ابّا'' سکینہ ہنس کر بولی ''ایک لڑکی سچ مچ پسند کر لی ہے''

''اور وقّن بھی راضی ہے اس بات پر''

''ہاں ابّا'' وہ جلدی سے بولی

''تب تو نہیں کروں گا'' وہ فیصلہ کن لہجہ میں بولے ''اُسے دیکھنے اور پسند کرنے کا کیا حق ہے''

''نہیں نہیں - اُسے کوئی حق نہیں ابّا۔ لڑکی تو آپ ہی پسند کریں گے'' سکینہ نے اطمینان دلایا

ہادی اس بات پر چپ ہو گئے اور آگے کوئی اعتراض والی بات نہ پا کر پوچھا

''اچھا - کون ہے وہ لڑکی - کس کی بیٹی ہے۔ کہاں رہتی ہے؟''

''وہ زہرا پھوپھی کے یہاں رہتی ہے گاؤں سے آئی ہے۔ بہت اچھی لڑکی ہے ابّا'' سکینہ نے کہا

''ٹھیک ہے تم کسی دن اس کو یہاں بلا کر مجھے دکھاؤ - اور وہاں اس کے بارے میں اور

ضروری باتیں اچھی طرح معلوم کرو۔ میرا مطلب ہے اس کے حسب و نسب کے بارے میں''

سکینہ نے ابّا سے کی ہوئی بات چیت کی پوری تفصیل اسی رات میں وقار کے گوش گذار کر دی۔ وقار یہ معلوم کر کے مارے خوشی کے ناچ اُٹھا کہ ابّا اس بات پر راضی ہو گئے ہیں کہ لڑکی کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ کر پسند کریں گے۔ وہ اپنی جگہ بالکل مطمئن تھا کہ لاڈلی کو دیکھ کر کوئی آدمی اُسے ناپسند کر ہی نہیں سکتا۔ رہ گئے لاڈلی کے گھر والے تو بھلا وہ وقار جیسے ہونہار تعلیم یافتہ اور مردانہ وجاہت والے لڑکے سے اپنی بیٹی کا رشتہ کیسے نہ کریں گے۔ دوسرے دن وقار نے یہ خوش خبری لاڈلی کو بھی سنا دی

''ابّا تمہیں میرے لئے پسند کرنے والے ہیں''

''اچھا؟'' لاڈلی نے کہا ''مگر ان کی پسند کے بارے میں آپ اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہیں''

''کہہ سکتا ہوں۔ وہ میرے باپ ہیں''

''خیر دیکھنے اور پسند کرنے کی بات تو الگ رکھئے۔ شادی آپ کو کرنی ہے اور آپ کو میرے کہنے پر چلنا ہوگا - کہئے ہاں چلوں گا''

''ہاں چلوں گا''

''اور ابّا کے کہنے پر نہیں چلوں گا''

''ٹھیک ہے''

''ٹھیک نہیں ہے۔ کہئے ہاں ابّا کے کہنے پر نہیں چلوں گا''

''ہاں'' ابّا کے کہنے پر نہیں چلوں گا''

☆☆☆

میر فدا حسین سے سونے کے بسکٹوں کے بارے میں جو بات چیت ہوئی تھی اس کا معمّہ سلجھانے میں قدیر دیر رات تک نہیں سویا تھا مگر صبح ہوتے ہی وہ میر صاحب کو کچھ بتائے بغیر سونے کے بسکٹوں کی تلاش میں بھدری کے لئے روانہ ہو گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ میر صاحب کو اس کے بھدری جانے کی بھنک نہ ملے مگر میر صاحب تو بڑے دور اندیش اور جہاندیدہ آدمی تھے وہ عزیز بیگ سے اس بارے میں ساری باتیں اچھی طرح معلوم کر چکے تھے اس لئے قدیر کے اچانک غائب ہو جانے سے وہ سمجھ گئے کہ قدیر ہو نہ ہو بھدری گیا ہے۔ ایک دن تو اُنھیں داروغہ شیر علی کی دعوت کے لئے مدنی پور میں رکنا پڑا مگر دوسرے روز وہ بھی بھدری کے لئے روانہ ہو گئے۔

بھدری پہونچ کر قدیر پورا ایک دن اِدھر اُدھر بے مقصد چکر لگاتا رہا تا کہ ایک اجنبی کی وہاں

پرموجودگی سے کسی کو شک نہ ہو۔ دوسرے دن اس نے اس جگہ کا بغور معائنہ کیا جہاں پر شہزادی تمبو لگا کر رُکی تھی۔ یہ جگہ اُسے آسانی سے مل گئی کیوں کہ اس جگہ پر مہوے کا ایک بڑا درخت تھا مگر چونکہ اس واقعہ کو کئی مہینے گذر چکے تھے اس لئے پہلی نظر میں دیکھنے سے یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ پیڑ کے آس پاس گڈھا کھود کر کوئی چیز دفن کی گئی ہے۔ اس نے پیڑ کے چاروں طرف پانچ سات گز زمین کو خوب ٹھونک بجا کر اور پیروں سے زمین کو اچھی طرح دبا دبا کر دیکھا مگر کسی گڈھے کے کوئی آثار آس پاس نہ دکھائی دیئے۔ اس تفتیش کو بھی وہ رازداری کے ساتھ کرنا چاہتا تھا کیوں کہ دن میں پیڑ کے آس پاس زمین کی کھدائی کرتے دیکھ کر آتے جاتے لوگوں کو شک ہوتا اسی خیال سے یہ کام اس نے رات کے لئے اُٹھا رکھا مگر رات ہونے سے پہلے پہلے وہ اس نتیجہ پر پہونچا کہ اگر زمین کھود کر بسکٹ چھپائے گئے ہوتے تو زمین کی کھُدائی کے لئے پھاوڑے یا کدال کی ضرورت پڑتی اور شہزادی یہ چیزیں کہاں سے لاتی اس لئے یہ بات یقینی تھی کہ بسکٹ زمین میں نہیں چھپائے گئے تھے تو پھر وہ کہاں گئے۔ ایک خیال یہ بھی اس کے ذہن میں آیا کہ ہوسکتا ہے بسکٹوں والی کہانی فرضی اور عزیز بیگ کی من گڑھنت ہو مگر شہزادی کے پاس بسکٹ کی موجودگی بھی مستحکم تھی جب ہی تو ایک بسکٹ اس نے قدیر کو دیا تھا اور آگے مزید دینے کا وعدہ کیا تھا۔ دوسرے روز اس نے پھر مہوہ کے پیڑ کی پُرتجسّس چھان بین کی اور ایک گھنٹہ کی محنت کے بعد وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا۔ درخت کے سوکھے تنے پر ایک کھوبے میں اُسے بہت سی سوکھی پتّیوں والی ٹہنیاں دکھائی دیں پھر بغور دیکھنے پر ان سوکھی پتیوں کے نیچے اخباری کاغذ کی جھلک دکھائی دی۔ درخت کے تنے میں یہ کھوبا زمین سے انسانی پہونچ کے باہر تھا اس لئے قدیر کو پیڑ پر چڑھنا پڑا۔ پھر اس کھوبے میں اخبار کی بہت سی تہوں میں لپٹا پلاسٹک کا ایک مضبوط تھیلا دکھائی دیا۔

اس تھیلے کو ہاتھ لگاتے ہی قدیر کے دماغ کا کونہ کونہ روشن ہوگیا۔ ہاتھوں میں سونے کے بسکٹوں کا لمس بڑا خوش آئند لگا۔ اس نے پیڑ پر بیٹھے بیٹھے چاروں طرف نظر دوڑائی یہ جاننے کے لئے کہ کوئی اس کو دیکھ تو نہیں رہا ہے کیوں کہ اگر کسی نے اُسے پیڑ کے تنے پر بیٹھا دیکھ لیا تو ضرور شک کرے گا اور ساری دولت ہاتھ سے نکل سکتی ہے۔ یہ سوچ کر وہ پیڑ پر سے زمین پر کودا اور اس تھیلے کو رات کے وقت یا پھر کسی مناسب موقع سے نکالنے کے بارے میں سوچ کر باغ سے باہر چلا گیا۔

بھدری میں آنے کے بعد شہزادی کی قبر پر نہ جانا اس کے نزدیک بڑی بیوفائی اور خودغرضی کی بات تھی اس لئے وہ شہزادی کی قبر پر گیا وہاں اُس کا دل سچ مچ بھر آیا دونوں کے بیچ ایک مختصر سے وقفہ میں کتنی اپنائیت آ گئی تھی اور کیسے کیسے عہد و پیمان ہوئے تھے۔ وہ شہزادی کو اپنے گاؤں مدنی پور لانا چاہتا تھا۔ اپنی ماں اور بہن سے ملانا چاہتا تھا۔ شہزادی بھی اس کے ساتھ گاؤں چلنے پر کتنی خوش و رضامند تھی۔ مگر یہ پُرمسرّت خواب کتنی جلدی ختم ہوگیا۔ شہزادی کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے بعد قدیر وہیں لیٹ کر سو گیا۔ پھر

شام کو بازار کی ایک چھوٹی سی دوکان میں چائے پینے کے لئے چلا گیا۔

''بھیّا - ذرا ایک پیالی گرم چائے دینا'' اس نے چائے والے سے کہا

''ابھی دیا جناب'' چائے والا بولا ''بسکٹ بھی دوں؟''

''ایں!'' اس سوال پر وہ گھبرا گیا ''نہیں نہیں بسکٹ نہیں چاہئے''

اُسی دکان پر لمبی لمبی سیاہ زلفوں اور بھبھّو داڑھی والے ایک بزرگ پہلے سے بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ قدیر کا جواب سن کر وہ چائے والے سے بولے

''اے چائے والے بھیّا جی تم مجھے ایک بسکٹ دے دو انھیں تو سونے کے بسکٹ چاہئیں۔''

جس بنچ پر قدیر بیٹھا چائے پی رہا تھا اس سے اُچک کر ایک دم کھڑا ہوگیا اور ان بزرگوار کی بات سن کر وہ بڑی دیر تک اُنھیں ڈری ڈری نظروں سے دیکھتا رہا

''کیوں بیٹا۔ کیا میں نے کوئی بہت بری بات کہہ دی ہے جو اس طرح مجھے گھور رہے ہو؟''

انھوں نے پوچھا بزرگ کی بات کا جواب دیئے بغیر اور بلا چائے پئے دوکان دار کو پیسے دے کر وہ دوکان سے باہر نکل آیا اور وہاں سے سیدھا میلے والے باغ کی طرف چل پڑا مگر تھوڑی دور چلنے کے بعد اس نے دیکھا کہ وہ ''گیسو دارز'' بزرگ بھی دوکان سے نکل پڑے تھے اور اس کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ اس لئے قدیر باغ کی طرف جانے کے بجائے اپنی جگہ پر کھڑا ہو کر ان بزرگوار کا انتظار کرنے لگا

''آیئے ملاّ جی - میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا'' ان کے قریب آتے ہی قدیر نے کہا

''کیوں بچّہ - میرا انتظار کیوں کر رہے تھے؟ اُنھوں نے بڑی متانت سے پوچھا

قدیر ان کے پاس منہ لے جا کر بولا ''آپ کی داڑھی میں آگ لگانے کے لئے''

ملاّ جی نے بڑا لمبا قہقہہ لگایا پھر اپنی داڑھی اور نقلی زلفوں کا وِھیگ اتار کر قدیر سے کہا

''تو یہ لو - لگاؤ آگ داڑھی میں''

''عزیز بیگ صاحب'' قدیر نے کہا ''میں پوچھتا ہوں آپ میرے پیچھے کیوں پڑے ہیں۔ آپ کو پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ مجھے آپ کے سونے کے بسکٹوں کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔''

''سب کچھ پتہ ہے پیارے'' وہ بولے ''اگر نہیں معلوم تو یہاں کیا کرنے آئے ہو۔ شہزادی کی قبر پر فاتحہ پڑھنے؟ خیر - اگر تمہیں ان بسکٹوں کے بارے میں نہیں معلوم تو میں بتاتا ہوں۔ سنو - وہ بسکٹ کل تک جس جگہ رکھے تھے اب وہاں پر نہیں ہیں۔''

''کیا؟'' قدیر نے حیرت سے کہا ''یعنی آپ کو پتہ تھا کہ وہ بسکٹ کہاں رکھے ہیں''

''رکھے ہیں نہیں۔ رکھے تھے'' عزیز بیگ نے کہا ''کل تک وہ بسکٹ مہوے کے ایک درخت کے کھوبے میں رکھے تھے۔ مگر اب وہاں نہیں ہیں کیوں کہ تم اُنھیں نکال لے گئے ہو''

''ارے واہ - میں نکال لے گیا؟'' قدیر چڑھ کر بولا ''قبلہ ذرا سمجھداری کی باتیں کیجئے اگر آپ کو ان بسکٹوں کے بارے میں پہلے سے معلوم تھا تو آپ مجھ سے پوچھنے مدنی پور کیوں گئے تھے پہلے ہی نکال لیتے۔''

''ہا!!!!اں - یہ ہوئی وکیلوں جیسی جرح'' وہ بولے ''مگر یہ بات میں تمہیں ابھی نہیں بتا سکتا۔ پہلے میرا مال میرے حوالے کردو پھر یہ راز بھی میں تمہیں بتادوں گا۔''

''آپ کے کہنے کے مطابق کل تک بسکٹ وہیں تھے اور اب وہاں نہیں ہیں تو آپ کو یہ بات معلوم کیسے ہوئی کیا آپ نے ابھی ابھی وہاں جا کر خود دیکھا ہے؟''

''ہاں ہاں دیکھا ہے'' عزیز بیگ کرخت آواز میں بولے ''بس اب زیادہ سوال جواب مت کرو اور چپ چاپ وہ سارے بسکٹ میرے حوالے کردو۔ وہ مال تمہیں ہضم نہ ہوگا۔''

''ارے ارے ٹھہرو بھائی'' قدیر نے کہا ''آپ نے کتنی دیر پہلے ان بسکٹوں کو دیکھا تھا''

''صبح کو وہیں تھے اور اب سے ایک گھنٹہ پہلے دیکھا تو غائب تھے'' عزیز بیگ نے بتایا

''بس بات صاف ہوگئی'' قدیر بولا ''آپ نکال لے گئے''

''قدیر پیارے - سنو میں اُڑتی چڑیا کے پر گن سکتا ہوں مجھے چرانے کی کوشش بیکار ہے اگر تم سیدھی بات نہیں سمجھتے تو مجھے ٹیڑھی انگلی سے گھی نکالنا پڑے گا۔ سمجھ گئے؟''

''بیگ صاحب - اگر آپ سچ بول رہے ہیں تو سمجھ لیجئے مال کوئی تیسرا آدمی لے گیا اور ہم دونوں کو مل کر اس بارے میں سوچنا چاہئے کہ وہ آدمی کون ہوسکتا ہے'' قدیر نے سمجھایا

''تم ہو وہ آدمی'' عزیز بیگ غصہ میں بولے ''اور اب میرے غیض و غضب سے بچ کر نہیں جاسکتے۔''

''برادر آپ کوئی جادوگر ہیں کیا؟'' قدیر نے پوچھا

''میں کیا ہوں یہ بعد میں پتہ چلے گا۔ پہلے تم وہاں چل کر دیکھ لو کہ بسکٹ اب وہاں نہیں ہیں۔''

''اچھا مان لیا نہیں ہیں'' قدیر نے کہا ''مگر یہ کیسے مان لوں کہ وہ آپ نے نہیں نکالے''

''اور میں کیسے یقین کرلوں کہ وہ تم نے نہیں نکالے؟''

اس درمیان وہ دونوں مہوے کے پیڑ کے پاس پہونچ گئے قدیر نے نیچے ہی سے دیکھ لیا کہ اس کھوبے میں سوکھی پتّیوں والی ٹہنیاں اور ان کے نیچے اخباری کاغذ کچھ بھی نہیں تھا جب کہ وہ ان چیزوں کو بالکل پہلے ہی کی طرح رکھ کر درخت سے نیچے اترا تھا۔

''آپ نے اوپر چڑھ کر دیکھا ہے؟'' قدیر نے پوچھا

''دیکھا ہے - اب وہاں کچھ نہیں ہے'' وہ بولے

''اور آپ کہتے ہیں کہ بسکٹ آپ نے نہیں نکالے''

''ہاں - کتنی بار کہوں۔''

''اور میں نے بھی نہیں نکالے'' قدیر نے کہا ''کہئے تو قسم کھالوں''

اب اس کی ضرورت نہیں'' عزیز بیگ نے کہا'' میں سمجھ گیا یہ کام کس نے کیا ہے''

''کس نے کیا ہے؟''

''وہی لال کھوپڑی والا انسان جس کے سر کے بال مہندی سے رنگے ہیں''

''کون؟ - میر صاحب؟''

''ہاں میر صاحب'' عزیز بیگ نے کہا؟ ''دراصل میں نے بسکٹوں کے بارے میں اس سے پوچھ کر بہت بڑی غلطی کی مجھے اس سے نہیں پوچھنا تھا۔ خیر میں چھوڑوں گا نہیں اُسے۔''

عزیز بیگ کے جانے کے بعد قدیر اس شش و پنج میں پڑ گیا کہ اب وہ کیا کرے یہ بات اب اس کی سمجھ میں آئی کہ ضرور کوئی اس کے پیچھے سائے کی طرح لگا تھا اور پلک جھپکتے میں وہ بسکٹ نکال لے گیا۔ عزیز بیگ کی بات بھی کسی حد تک درست تھی کہ یہ میر صاحب کا کام ہے کیوں کہ اس رات وہ اس سے بسکٹوں کے بارے میں دریافت کررہے تھے۔ ایک خیال اس کے دل میں یہ بھی آیا کہ کہیں یہ کام اس بدمعاش کا تو نہیں جو میلے میں شہزادی کو چاقو سے دھمکا رہا تھا مگر وہ کسی نتیجے پر نہیں پہونچا اور کان پور جانے والی بس میں بیٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔ مگر عزیز بیگ وہاں سے سیدھا اُس چائے والے کی دوکان پر پہونچا جہاں قدیر ملا تھا۔ عزیز بیگ اپنے ساتھ روشن کو بھی لایا تھا مگر اُسے چائے والے کے پاس چھوڑ دیا تھا۔ اُنھوں نے چائے والے سے کہا

''بھیّا جی - میری بیٹی کہاں ہے بلادو - میں اب جاؤں گا''

چائے والا ان کی صورت دیکھ کر بڑی دیر تک پہچاننے میں تامل کرتا رہا تو عزیز بیگ ہنس کر بولا ''آپ میری داڑھی مونچھ اور سر کے بالوں کو ڈھونڈھ رہے ہوں گے۔ وہ اس جھولی میں ہیں۔'' چائے والا بھی ان کے ساتھ ہنس پڑا۔

قدیر کے تعاقب میں میر فدا حسین بڑے ٹھیک وقت سے بھدری پہونچے تھے۔ جس وقت قدیر مہوے کے پیڑ پر چڑھا اُس کے کھوبے میں بسکٹ تلاش کررہا تھا اس وقت میر صاحب بھی قریب کے ایک درخت کی آڑ میں چھپے قدیر کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھے تھے۔ جیسے ہی قدیر پیڑ سے اُتر کر باغ سے باہر گیا میر صاحب نے جھٹ پٹ پیڑ پر چڑھ کر کھوبے سے بسکٹوں کا تھیلا نکال لیا اور اُسے اپنے سفری بیگ میں احتیاط سے رکھ کر وہ لمبے لمبے قدموں سے بس اسٹاپ کی طرف روانہ ہوگئے۔ سونے کے بسکٹوں کی ہلکی سی جھلک نے اُن کے پیروں میں جوانوں جیسی طاقت اور پھرتیلا پن پیدا کردیا تھا بس

اسٹاپ پر اُنھیں کان پور جانے والی بس بھی ذرا ہی دیر بعد مل گئی۔ ان کے بس سے جانے کے ایک گھنٹے بعد عزیز بیگ روشن کو لے کر اس باغ میں مہوے کے پیڑ کے پاس پہونچے مگر مال تو میر صاحب پہلے ہی لے جا چکے تھے اور اس درمیان قدیر شہزادی کی قبر پر فاتحہ پڑھ رہا تھا اور جب شام کے قریب وہاں سے لوٹا تو چائے کی دوکان پر عزیز بیگ سے ملاقات ہوئی۔

جس روز میر فدا حسین بسکٹ تلاش کرنے بھدری گئے تھے اسی دن کرامت علی اپنے گھر کے اُجڑنے کی دکھ بھری داستان زرّیں کو سنانے اور اپنے زخم ہائے دل پر زرّیں کے نازک ہاتھوں سے مرہم تسکیں لگوانے کی غرض سے مدنی پور گیا تھا اتنے دنوں بعد آج پھر اُسے زرّیں کی یاد اور اس کی رفاقت کی آرزو نے تڑپایا تھا۔ چندا کے بچھڑنے اور گھر کے اچانک اُجڑ جانے کا غم اُسے ایک بار پھر زرّیں کی چوکھٹ پر کھینچ لایا تھا۔ مگر آج وہ ستّرہ اٹھارہ سال پہلے والا فقیر کرامت علی نہیں تھا آج وہ اپنی الجھی گندی داڑھی مونچھوں کو مونڈوا کر آیا تھا۔ بدن پر شاہ صاحب والے کپڑوں کی جگہ جائس کے کسی رئیس کے چالیسویں میں ملے ہوئے عاقبتی جوڑے کی گرم شیروانی پیروں میں چمک دار نئے پمپ جوتے اور پتلی کمانی والے نئے چشمہ کے ساتھ وہ مدنی پور گیا تھا۔ ان کپڑوں نے سچ مچ اُس کی وجاہت میں اضافہ کر دیا تھا۔ اس روز گھر پر نہ تو میر صاھب تھے اور نہ قدیر۔ اس لئے کرامت علی کی مہمانداری اور دلجوئی کے لئے زرّیں بالکل آزاد تھی۔ صبح کو انڈے پراٹھے کا لذیذ ناشتہ کرنے کے بعد کرامت علی نے اپنی رودادِ غم زرّیں کو سنائی بیچ بیچ میں وہ افسوس ظاہر کرتی رہی۔ پھر اس نے اپنی کایا پلٹ پر روشنی ڈالی۔

''اب تو درویشی والا پشتینی کام بھی میں نے چھوڑ دیا ہے۔'' اس نے بتایا ''بات یہ ہے زرّو کہ بزنس میں اوپر والا عزّت کے ساتھ چار پیسے دے دیتا ہے تو کیا ضرورت ہے قبر کی مجاوری کرنے کی''

''یہ تو اچھی بات ہے'' زرّیں ہنس کر بولی ''اب تو ان کپڑوں میں دولھا بھائی آپ سچ مچ کوئی اونچے نواب معلوم ہوتے ہیں۔ کلین شیو میں بہت جچ رہے ہیں''

''اچھا!'' وہ دل ہی دل میں خوش ہو گیا ''کہیں تم مجھ سے مذاق تو نہیں کر رہی ہو زرّو۔ ویسے اب خیر تیری پسند یہی ہے تو میں آگے بھی کلین شیو رہوں گا اس لئے کہ اب تو مجھے تیرے ہی کہنے پر چلنا پڑے گا''

''کیوں۔ کیوں؟ - میرے کہنے پر کیوں چلنا پڑے گا؟''

''دیکھ زرّو'' کرامت نے سمجھایا ''میں تجھ سے یہی کہنے تو آیا ہوں۔ اب تو اتنی نا سمجھ نہیں ہے کہ میرے دل کی بات نہ سمجھ پائے۔ منہ سے نہ کہوں تو بھی تجھے سمجھ لینا چاہئے کہ اس غریب کے اُجڑے گھر میں تیرے ہی دم سے بہار آسکتی ہے۔ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچ تو۔ پگلی تو نے اس بوڑھے کھوسٹ میر صاحب کے پیچھے کیسے اپنی بھرپور جوانی کا ستیاناس کیا ہے۔''

''سمجھی'' وہ بولی ''شاید آج پھر آپ کو میری محبت نے گدگدایا ہے۔ اچھا تو کیا کروں میں بولئے''

''دو بول پڑھا لے میرے ساتھ'' وہ بولا ''تیرے سر کی قسم ہتھیلی کے پھپھولے کی طرح رکھوں گا تجھے''

''ہاں ہاں کیوں نہیں'' اس نے طنزیہ لہجہ میں کہا ''میری خاطر آپ ایک ہی گھڑکی کھا کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں محبت دل سے ہوتی ہے دو بول پڑھا لینے سے بودا پن دور نہیں ہو جاتا۔ اور اس سے پہلے میں نے یہی تو کہا تھا کہ میر صاحب سے پوچھ لو تو میر صاحب کی ایک ہی ڈانٹ سن کر آپ چپ چاپ لوٹ گئے۔ تو پھر مجھے دوش کیوں دے رہے ہو''

''چپ چاپ چلا نہ جاتا تو کیا کرتا۔ بولو۔''

''تو کیا یہ بھی میں بتاتی کہ کیا کرو۔ ہونہہ'' وہ بولی ''ارے مجھے بھگا لے جاتے۔ میرے لئے مارتے مر رہتے۔ واہ رے آپ کی چاہت۔ چپ چاپ سر جھکا کر چلے گئے یہ بھی نہ سوچا کہ زرّیں اپنے دن کیسے بتائے گی اس کا غم کیسے دور ہوگا۔ اس کی جوانی کیسے کٹے گی۔ یہی آپ کی مردانگی تھی کہ خود تو گھر میں رکھیل ڈال کر بیٹھ گئے اور میری طرف اتنے دنوں میں ایک بار بھی پلٹ کر نہ دیکھا کہ کس حال میں جی رہی ہوں۔ اب گھر والی چل بسی ہے تو پھر آ گئے میرے زخموں کو کریدنے۔''

''سُن تو سہی زرّو'' وہ روندھا ہو کر بولا

''نہیں پہلے میری سنو'' وہ بولی ''بتاؤ اب کیا رکھا ہے مجھ میں؟ - کیا پاؤ گے مجھ سے؟۔ کیا مزہ ملے گا اس عاشقی میں؟۔ ایک ٹوٹے کھلونے سے زیادہ میری کیا حیثیت ہے۔'' وہ اپنے آنسو پونچھنے لگی زرّیں کی باتوں کو سن کر وہ لاجواب ہو گیا اور اس کے پیر پکڑ لئے

''بس کر زرّو - اب اور شرمندہ نہ کر مجھے'' - وہ تڑپ کر بولا ''لے یہ جوتی اُٹھا اور مار میرے سر پر دھڑا دھڑ۔ یہی ہے میری سزا۔ مگر زرّو - تو جو بھی ہے جیسی بھی ہے۔ اب بھی میرے لئے جنّت کی حور سے کم نہیں۔ سچ کہتا ہوں تو میرے لئے وہی ہے جو بیس سال پہلے تھی۔ میں تجھے اتنا پیار دوں گا۔ اتنا پیار دوں گا کہ تو سب کچھ بھول جائے گی۔ بس مجھے اپنا لے میرا گھر آباد کر دے''

''جوان بیٹی بیٹا کے ہوتے ہوئے ان کے گھر بسانے کی جگہ تمہارے ساتھ چل کر گل چھرّے اُڑاؤں۔ کیوں؟ - کیسے مطلبی ہو دولھا بھائی۔ سوچو تو دنیا میرے بارے میں کیا کہے گی''

''دنیا تو کہتی ہی رہتی ہے'' وہ بولا ''چار دن کہہ کر چپ ہو جائے گی''

پھر وہ زرّیں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر جذباتی لہجے میں بولا ''مگر میں تو اب تیرے بغیر نہیں جی سکتا۔ دیکھ زرّو اب اور ظلم نہ کر مجھ پر۔ تجھے ایک سچے چاہنے والے کی ضرورت ہے۔ مجھے اپنا لے۔''

اتنا کہہ کر کرامت نے اپنی گٹھری سے پھر وہی سونے کی پنچ لڑی نکال کر زرّیں کو دی

''آج وہی پرانی پنچ لڑی میں پھر تجھے دے رہا ہوں۔ یہ تیری مرحومہ بہن کی نشانی ہے اسے لے لے کیوں کہ اس پر تیرا ہی حق ہے۔''

زرّیں نے اس بار یہ تحفہ قبول کر لیا

''ٹھیک ہے۔ لے لیتی ہوں'' وہ بولی ''مگر میں کوئی وعدہ نہیں کرتی۔ تم خوشی سے دیتے ہو تو پہن بھی لوں گی۔ بس''

کرامت نے بڑے پیار سے زرّیں کے گلے میں وہ پنچ لڑی پہنا دی

''اللہ پاک کی قسم آج مجھے بڑی خوشی ہوئی'' اس نے کہا ''اب جس طرح تو نے میرا یہ نذرانہ قبول کیا ہے اسی طرح اس پیار بھرے دل کو قبول کر لے''

''میر صاحب کان پور گئے ہیں۔ لوٹ کر آئیں تو ان سے باتیں کر لینا'' زرّیں آئینے میں اپنا حسن دیکھنے لگی

''پھر وہی پرانی ضد'' کرامت جل کر بولا ''کیا باتیں کروں میر صاحب سے۔ کون ہیں وہ تیرے۔ میں پوچھتا ہوں کیا کر لیں گے وہ تیرا۔''

''کچھ نہیں'' وہ بولی ''تم اُن سے کہو تو سہی کھا نہ جائیں گے''

''اچھا اب تیری یہی شرط ہے۔ یہی ضد ہے تو پھر کہوں گا میر صاحب سے لیکن سن لے زرّو اگر اس بار اس حرامی میر صاحب کے بچّے نے دھتکارا تو سینے پر چڑھ کر سالے کی زبان کھینچ لوں گا'' وہ دانت پیس کر بولا

''جھگڑا کرو گے ان سے؟'' زرّیں نے پوچھا

''جھگڑا نہیں کروں گا'' وہ بولا ''مار ڈالوں گا یا مر رہوں گا۔ بس سوچ لیا ہے''

''ہاں ہاں کیوں نہیں'' زرّیں نے مذاق اُڑایا ''میرے لئے اتنے دیوانے ہوتے نا تو اب تک جانے کب کا کچھ نہ کچھ کر چکے ہوتے۔ بیوی مر جاتی ہے تو میں یاد آتی ہوں۔ ہونہہ۔''

''خیر۔ اب دیکھ لینا۔ مرد کی زبان ہے''

دوپہر کے کھانے پر زرّیں نے گوشت پلاؤ اور کباب سے کرامت علی کی تواضع کی تو یہ دل داری دیکھ کر اُسے یقین ہو گیا کہ زرّیں ضرور اس کی طرف مائل ہو گئی ہے۔ کھانا کھا کر وہ چارپائی پر ٹانگیں پھیلا کر لیٹ گیا۔ زرّیں نے اُسے پان لگا کر دیا۔

''یہ تو نے اپنی بیٹی کو جائس کیوں بھیج دیا ہے زرّو؟'' کرامت نے پوچھا

''کیا کروں میر صاحب کی یہی مرضی تھی'' اس نے جواب دیا

''میر صاحب! ہونہہ'' وہ بولا ''میر صاحب سالا جموگا ہے جموگا۔ خیر۔ تو میرے ساتھ چل کر

وہاں رہے گی تو ہم اُسے اپنے یہاں بلا لیں گے۔ کیا کر لے گا میر صاحب''

''اُفوّہ'' زرّیں نے کہا ''پہلے تم ان سے باتیں تو کرو۔ دیکھو آخر وہ کہتے کیا ہیں۔''

زرّیں اس بات کو یہیں پر ختم کرنا چاہتی تھی اس لئے وہ کرامت کو پان کا بیڑا دے کر جانے لگی تو کرامت نے اس کا ہاتھ تھام لیا

''ابھی تو میر صاحب کے آنے میں دیر ہوگی زرّو'' اُس نے زرّیں کو اپنے پاس بٹھانا چاہا

''کون جانے۔ وہ کبھی بھی آ سکتے ہیں''

زرّیں چارپائی پر بیٹھ تو گئی مگر عین اسی وقت کسی نے باہر سے آواز دی ''جناب میر صاحب''

یہ داروغہ شیر علی کی آواز تھی۔ اگرچہ اُنھیں یہ بات بخوبی معلوم تھی کہ میر صاحب کسی ضروری کام سے باہر گئے ہیں اور شام سے پہلے نہ لوٹیں گے پھر بھی وہ انجانا بن کر میر صاحب سے ملاقات کے بہانے دو بجے دن میں اُن کے گھر آ پہونچے تھے۔ زرّیں نے اندر سے جواب دیا

''وہ گھر پر نہیں ہیں۔ باہر گئے ہیں۔''

یہ خوش کن اطلاع پاتے ہی داروغہ شیر علی مسکراتے ہوئے ڈیوڑھی میں داخل ہو گئے اور صحن میں آئے تو وہاں چارپائی پر کرامت علی کو لیٹا دیکھ کر اُنھیں غور سے دیکھا۔ کرامت علی نے جھٹ چارپائی سے اُٹھ کر اُنھیں بڑا مودبانہ سلام عرض کیا

''وعلیکم السلام'' شیر علی نے جواب دیا ''آپ کی تعریف؟''

زرّیں ان کے جواب دینے سے پہلے بولی ''یہ میرے بہنوئی شیخ کرامت علی ہیں۔ اور آپ ہیں مدنی پور تھانہ کے داروغہ شیر علی صاحب۔''

شیر علی نے اخلاقاً مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ کرامت کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ ایک داروغہ نے اس کے ساتھ مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا تھا۔ وہ دل میں بہت خوش ہوا۔ داروغہ جب اس کی چارپائی پر بیٹھ گئے تو وہ پھر مودبانہ سلام کر کے چارپائی کے نیچے زمین پر بیٹھنے ہی والا تھا کہ شیر علی نے کہا ''ارے ارے یہ کیا۔ قبلہ آپ یہاں تشریف رکھئے۔ زمین پر کیوں بیٹھ گئے۔''

پھر فوراً ہی زرّیں سے مخاطب ہو گئے ''بھائی میں اس طرف سے گذرا تو تمہارے ہاتھ کی بنی پان کی گلوریوں کی طلب یہاں لے آئی۔ کیوں کرامت علی صاحب۔ آپ نے اپنی سالی کے ہاتھ کا بیڑا کھایا ہے؟''

کرامت علی کو داروغہ کے انداز گفتگو اور زرّیں سے اتنی غیر پسندیدہ بے تکلفی پر غصہ ضرور آیا مگر وہ صرف ''ہی ہی ہی'' کر کے چپ ہو گیا

''اس ہی ہی سے تو میں یہی سمجھوں گا کہ آپ نے نہیں کھایا'' شیر علی خود بھی ہنسے ''اس لئے

آج آپ میرے سامنے دو بیڑے ایک ساتھ کھائیے پھر دیکھئے مزہ - قبلہ شیخ صاحب سالی تو اللہ کی طرف بڑی حسین نعمت ہوتی ہے بڑے مقدر والوں کو سالی ملتی ہے۔ اب آپ مجھ ہی کو لے لیجئے واللہ اگر میری کوئی سالی ہوتی نا تو پانچ سال سے رنڈوا کیوں بیٹھا رہتا۔''

کرامت علی کے منہ تک یہ بات آتے آتے رہ گئی کہ وہ بھی بے عورت کا ہوگیا ہے مگر سالی اس کی طرف آنے سے کترا رہی ہے۔ وہ مارے لحاظ کے صرف اتنا ہی کہہ پایا

''صحیح فرماتے ہیں آپ'' پھر وہ آنگن کے برآمدے سے ہوکر کمرے میں چلا گیا

زرّیں اندر سے پان کی گلوریاں بنا کر لائی تو شیر علی نے پان لیتے وقت ایک نظر زرّیں کے چہرے پر ڈالی تو اس کے گلے میں چمپا کلی کی جگہ سونے کی پنچ لڑی دکھائی دی تو اس پر اُنھیں بڑی حیرت ہوئی

''یہ تمہارے گلے میں پنچ لڑی کہاں سے آ گئی۔ میں نے تو چمپا کلی پہنائی تھی''

''کیوں؟'' زرّیں نے پوچھا ''نہیں آسکتی کیا؟''

''ہاں ہاں۔ کیوں نہیں آسکتی'' شیر علی بولے ''بہت کچھ آسکتا ہے تمہارے پاس۔ مگر......''

''تو پھر یہ بھی آ گئی''

''اچھا اچھا'' شیر علی نے کہا ''مگر اب اسے اتار کر ذرا دیر کے لئے چمپا کلی پہن لو تو اس وقت دن کے اُجالے میں تمہاری سج دھج دیکھوں''

شیر علی کی فرمائش سن کر اُن کا دل رکھنے کو زرّیں جلدی سے اندر گئی اور گلے میں چمپا کلی پہن کر آ گئی۔ شیر علی نے تحسین آمیز نظروں سے اُسے دیکھا۔ مسکرائے اور بولے ''ماشاء اللہ۔ ماشاء اللہ۔ ذرا اپنے دولھا بھائی کو بھی تو دکھا دو اپنی سجاوٹ۔ بے چارے کمرے میں اکیلے بیٹھے ہیں۔''

''رہنے دیجئے'' زرّیں نے کہا

''اچھا اچھا'' شیر علی بولے ''تم ڈرتی ہوگی کہیں مولانا نظر نہ لگا دیں''

بلانے کی ضرورت ہی نہ پڑی کیوں کہ کرامت علی خود بخود کمرے سے نکل کر اس طرف آ رہے تھے۔

شیر علی نے اُنھیں دور ہی سے دیکھ کر کہا

''آیئے آیئے قبلہ۔ شیخ جی''

پھر زیر لب گنگنانے لگے۔ شیخ جی حسینوں میں پھرتے ہیں دیوانے سے''

کرامت علی مسکراتا ہوا صحن میں آیا تو زرّیں کے گلے میں سونے کی چمپا کلی دیکھ کر اُسے ذرا دیر کو حیرت ضرور ہوئی کیوں کہ اُس نے کچھ ہی دیر پہلے پنچ لڑی پہنائی تھی اس کی جگہ چمپا کلی دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ یہ تو وہی ہار ہے جو اس نے بھدری کے میلے میں شہزادی کے گلے سے اتاری تھی اور جسے بعد میں اُس نے قدیر کو دیا تھا

''کیوں جناب۔ خیریت تو ہے'' شیر علی نے پوچھا ''کس خیال میں کھو گئے آپ؟''

''دولھا بھائی میری چمپا کلی دیکھ رہے ہیں۔'' وہ بولی ''کیسی ہے دولھا بھائی؟''

''ارے مجھ سے کیا پوچھتی ہو'' کرامت نے کہا ''یہ تو میں نے ہی قدیر کو دیا تھا'' اس بات کو سن کر شیر علی اور زرّیں دونوں نے ایک ساتھ قہقہہ لگایا یہ سوچ کر کہ ضرور اُس کو اس معاملہ میں غلط فہمی ہوئی ہے۔

''واہ شیخ صاحب - آپ تو کمال کے آدمی نکلے''

شیر علی ہنستے ہوئے باہر جانے لگے تو کرامت کو بھی ہاتھ پکڑ کر ساتھ لیتے گئے اور باہر نکل کر بڑے رازدارانہ لہجے میں ان سے پوچھا

''تو یہ چمپا کلی آپ نے دی تھی انھیں؟''

''مگر - آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟'' کرامت علی نے کہا

''خیر چھوڑیئے'' شیر علی بولے ''یہ بتایئے کچھ کامیابی ہوئی؟''

''جی! کیسی کامیابی؟'' کرامت نے پوچھا

''میرا مطلب ہے گاڑی پٹری پر آ رہی ہے یا نہیں'' شیر علی نے زہر خند کیا

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا'' کرامت نے کہا ''صاف صاف بتایئے۔''

''اب صاف صاف کیا بتاؤں'' وہ بولے ''میر صاحب تو گاؤں سے باہر ہیں۔ میدان صاف ہے۔ موقع غنیمت ہے۔ اور پھر سالی تو ویسے بھی آدھی جورو ہوتی ہے۔ ہاتھ لگا اور باجہ بجا''

کرامت علی کی سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ یہ داروغہ ضرور زرّیں پر بری نیّت رکھتا ہے مگر وہ صرف اتنا ہی کہہ سکا

''خیر آپ جو بھی کہیں۔ لیکن داروغہ صاحب آپ کا خیال صحیح نہیں ہے''

''ارے بھائی شیخ کرامت علی صاحب۔ بھلا میں نے کیا بری بات کہہ دی۔ جناب ہنسی مذاق تو سالی ہی سے کیا جاتا ہے یہ کم بخت رشتہ ہی ایسا پیارا ہے اور پھر اس لپ جھپ میں اگر سالی صاحبہ پکے آم کی طرح گود میں ٹپک پڑیں تو کون آپ جیسا پارسا پرہیزگار ہوگا جو - خیر جانے دیجئے۔'' کرامت علی صرف رال گھونٹ کر خاموش ہو گیا

''اچھا جناب میں تو چلا۔ خدا حافظ'' شیر علی بولے ''آپ کی کامیابی کے لئے دعا کروں گا''

شیر علی ہاتھ ہلاتا اور مسکراتا چلا گیا اور کرامت علی بڑی دیر تک اُس کی جیپ سے اُڑی گرد کو دیکھتا اور اس انجانے خوف سے دل میں کھٹک محسوس کرتا رہا کہ اگر داروغہ کا زرّیں سے اتنا یارانہ نہ ہوتا تو وہ ایسی باتیں کیسے کرتا۔

شام ہوتے ہوئے میر صاحب تو گھر لوٹ کر نہ آئے مگر قدیر واپس آ گیا اور گھر میں آتے ہی

اُس نے ایک اجنبی مہمان کو بڑی بے تکلّفی کے ساتھ بستر پر لیٹے دیکھا

آؤ آؤ — قدیر بیٹے — کیسے ہو؟"

قدیر کو اس اندازِ تخاطب پر اور بھی حیرت ہوئی کیوں کہ وہ اُنھیں جانتا بھی نہیں تھا وہ اُنھیں دیکھنے لگا

"کیوں — نہیں پہچانا مجھے؟" کرامت نے کہا "میں ہوں تیرا خالو — کرامت علی"

"ارے واہ خالو!" قدیر ہنس کر بولا "یہ — یہ — آپ کو کیا ہو گیا — سر اور داڑھی مونچھوں کے بال۔"

"بیٹا — گھر والی گذر گئی نا"

"اچھا اچھا — تو پنڈا پارا ہے آپ نے" قدیر نے کہا

کرامت علی نے اس سوال کا جواب دینے کی جگہ نیا سوال کر دیا

"یہ بتاؤ کہ وہ لونڈیا روشن کہاں ہے۔ اُسے بہانہ بازی سے یہاں کیوں لے آئے ہو؟"

"کیا!" قدیر نے قدرے سخت لہجے میں کہا "کیا کہتے ہو خالو — میں اس لڑکی کو بہانہ سے یہاں لے آیا؟ کیا وہ تمہیں یہاں دکھائی دی ہے؟"

"اگر تم اُسے نہیں لائے تو پھر کون لے گیا" کرامت بولا

"میں کیا جانوں کون لے گیا" قدیر نے تڑ سے جواب دیا مگر دل ہی دل میں سوچنے لگا کون ہو سکتا ہے وہ آدمی جو روشن کو بہانے سے لے گیا اور بہت جلد اس نتیجے پر پہونچا کہ ضرور وہ آدمی عزیز بیگ ہو گا کیونکہ وہ اس لڑکی کے لئے بھی پریشان تھا اور قدیر سے اس کے بارے میں پوچھ رہا تھا مگر اپنے اس شبہ کا اظہار اس نے خالو سے نہیں کیا اُنھیں وہیں لیٹا چھوڑ کر قدیر ماں کے پاس آ کر بولا

"بہت زور کی بھوک لگی ہے ماں — مجھے کچھ کھانے کو دو"

قدیر کی نظر ماں کے گلے میں چمکتی ہوئی سونے کی چمپا کلی پر پڑی تو وہ ایکدم حیرت میں پڑ گیا اور سوچنے لگا کہ یہ چمپا کلی ماں کے گلے میں کیسے آ گئی اسے تو وہ ثریّا کو دے آیا تھا۔ کبھی وہ ماں کی صورت کو دیکھتا کبھی چمپا کلی کو۔ اُس کا دل تو یہی چاہتا تھا کہ ماں سے پوچھے کہ یہ چمپا کلی اسے کہاں سے ملی مگر یہ سوچ کر خاموش رہا کہ یہ پوچھنا تو ماں کے کردار پر نادانستہ شک کرنا ہو گا اور اس سے اس کی آبرو کو ٹھیس پہونچ سکتی ہے۔ کھانا کھاتے وقت اس نے ماں سے صرف ایک سوال کیا

"امّاں — میاں کہاں ہیں؟"

"وہ تو صبح ہی سے کہیں باہر گئے ہیں — اب تک تو اُنھیں لوٹ آنا چاہیئے تھا" ماں نے بتایا

رات ہو گئی تب تک میر صاحب واپس نہ آئے تو قدیر ثریّا سے ملنے کی غرض سے تھانہ چلا گیا۔

تھانیدار شیر علی کسی معاملہ کی تفتیش میں قریب کے ایک گاؤں میں گئے تھے اس وقت ان کی جگہ سپاہی گنپت رام کرسی پر بیٹھا اپنی ہتھیلی پر چونا سُرتی مل رہا تھا قدیر کو دیکھتے ہی بڑے تپاک سے بولا

"آؤ آؤ مہراج" پھر چونا سرتی والی ہتھیلی پر دوسرے ہاتھ سے پھٹ پھٹ کر کے تمباکو کو منھ میں ڈالا

"بڑے ٹھیک سمے پر آئے ہو میاں — جاؤ جاؤ میدان کلیر ہے"

"گنپت رام جی — یہ بھی تو بتاؤ کہ کیسے کلیر ہے۔" قدیر نے کہا

"تمہارے "ابّا جان" تفتیش کے لئے کودئی کا پورہ گئے ہیں ایک گھنٹہ سے پہلے نہیں لوٹیں گے"

"تھینک یو گنپت رام جی — بہت بہت دھنیہ واد"

"خالی خولی دھنیہ واد" گنپت رام نے کہا "ارے ہمارے لئے کچھ لائے بھی ہو؟"

ثریّا تھوڑی دیر تک قدیر سے روٹھی رہی۔ کافی خوشامدیں کرا لینے کے بعد قدیر سے بولی "یہ بتاؤ تم کل رات میں کہاں تھے۔ میں اسی کھڑکی پر بیٹھی گھنٹوں تمہاری راہ دیکھتی رہی مگر تم نہیں آئے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے تمہارے دل میں میرے سوا کوئی اور بھی ہے۔ آٹھ آٹھ دن بعد آتے ہو اور جھوٹی محبتیں جتا کر چلے جاتے ہو"

"کیوں بیکار میں شک کرتی ہو ثریّا۔ اگر کہو تو کلیجہ چیر کر دکھا دوں کہ اس دل میں تمہارے سوا کوئی نہیں ہے"

"بس کرو یہ جھوٹی تسلّیاں" وہ بولی "میں پوچھتی ہوں ابھی تک ابّا سے کیوں نہیں ملے"

"یہ الزام بھی غلط ہے — میں تو ان سے روزانہ ملتا ہوں"

"مگر مطلب کی بات ابھی تک زبان سے ادا نہیں ہوئی — آخر اُنھیں کیسے معلوم ہو گا — اُنھیں کوئی علم غیب تو نہیں کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو اور شادی کرنا چاہتے ہو۔"

"بہت ڈر لگتا ہے ان سے" قدیر بولا "اور اگر میں نے تمہاری محبت کا اظہار ان پر کر دیا تو سمجھ لو کہ مجھے گرفتار کر کے قید با مشقت میں ڈال دیں گے — اور تم دیکھتی ہی رہ جاؤ گی"

"جی نہیں" ثریّا بولی "تم سمجھتے ہو میں ایسی ہی چپ چاپ بیٹھی رہوں گی"

"اور کر بھی کیا سکتی ہو" قدیر نے کہا "صنف نازک ہو — شریف اور پردہ دار ہو — بدنامی کے ڈر اور ابّا جان کے خوف سے چپ چاپ بیٹھ جاؤ گی اور میں جیل میں چکّی پیستا رہوں گا"

"ابّا مجھے بہت چاہتے ہیں — وہ میری خواہش اور پسند کو کبھی نہ ٹھکرائیں گے۔"

"اچھا یہ بتاؤ کہ میں داروغہ جی تک بات کیسے پہونچاؤں"

"اپنے گھر سے کسی کو بھجوا ان کے پاس" ثریّا نے کہا

"گھر میں میری ماں ہیں یا پھر میر صاحب ہیں — کسے بھیجوں؟"

"یہ میں کیسے بتاؤں — اُسی کو بھیجو جو ابّا سے اچھی طرح باتیں کر سکے۔" ثریّا نے جواب دیا

"ہاں ایک بات تو میں پوچھنے کو بھول ہی گیا" قدیر نے کہا "یہ بتاؤ کہ وہ چمپا کلی جو تمہیں دی

تھی وہ کیا ہوئی''

''میں نے بتایا تو تھا کہ وہ ابّا کے ہاتھ لگ گئی اور اُنھوں نے اُسے اپنے پاس رکھ لیا۔''

قدیر چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر بولا ''کیا وہ اب بھی اُنھیں کے پاس ہے؟''

''یہ میں کیا جانوں'' ثریّا بولی ''مگر یہ تم کس لئے پوچھ رہے ہو۔ اُس روز تم نے یہی تو کہا تھا کہ لے جانے دو میں تمھیں سونے کے زیورات سے لاد دوں گا''

''ہاں ہاں کہا تھا۔ اب بھی کہتا ہوں۔ یہ تو میں نے ویسے ہی پوچھا تھا'' قدیر نے بات ٹال دی

ابھی یہ دونوں باتیں کر رہے تھے کہ دروازے پر سپاہی گنپت رام کی آواز سنائی دی

''بٹیا رانی۔ داروغہ جی آ گئے ہیں ان کے لئے پان لگا دو''

قدیر کے لئے یہ ایک اشارہ تھا کہ وہ کوارٹر کے عقبی دروازے سے نکل جائے اس لئے اس نے جاتے جاتے ثریّا سے کہا ''میں کسی روز اپنی والدہ کو تم سے ملنے کے لئے بھیجوں گا۔''

''نہیں نہیں۔ میرے پاس نہیں'' وہ بولی ''تم اُنھیں ابّا جی کے پاس بھیجنا۔''

قدیر کوارٹر کے پچھلے دروازے سے نکل کر تھانہ میں چلا گیا۔ شیر علی میز پر بڑا سا لیمپ جلائے بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ قدیر کو دیکھتے ہی چہک اُٹھے

''آؤ آؤ بیٹے'' وہ خوش اخلاقی سے بولے ''بڑے موقع سے آئے ہو۔ دیکھو اس رات کو تو تم بھاگ نکلے تھے مگر آج میری ستّرہ نئی غزلیں تمھیں سننی پڑیں گی''

''جی!'' قدیر گھبرا گیا ''ستّرہ غزلیں؟''

اس بیچ شیر علی اپنی میز کی دراز سے موٹی بیاض نکال چکے تھے۔ اُنھوں نے بلا انتظار اپنا پروگرام شروع کر دیا ''عرض کیا ہے۔ پھر بہار آئی چلے ہیں گھر سے دامن پھاڑ کر۔ شیرِ غم نے پھر دبوچا اپنے پنجے جھاڑ کر''

''سنئے'' قدیر بولا ''میں اس وقت ایک بہت ضروری کام سے آپ کے پاس آیا ہوں۔''

''ضروری کام؟'' وہ بولے ''ایسا ضروری کام۔ یعنی کہ میری غزلوں سے زیادہ ضروری کوئی کام ہے؟''

''جی۔ بات یہ ہے کہ میری والدہ آپ سے.....''

''ہاں ہاں بولو بولو۔ تمہاری والدہ مجھ سے...'' اُنھوں نے اپنی بیاض بند کر دی

''آپ سے مل کر وہ کچھ رشتے وغیرہ کی باتیں کرنا چاہتی ہیں'' قدیر نے کچھ کچھ شرماتے ہوئے کہا

یہ سنتے ہی داروغہ شیر علی ایسا کھل اُٹھے جیسے مُژدۂ جاں فزا مل گیا ہو۔ دل ہی دل میں غالبؔ کا

شعر گنگنانے لگے۔ ارے وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے۔ پھر قدیر سے مخاطب ہو کر بولے

''ارے بھائی۔ قدیر میاں۔ چلو غزلوں کا پروگرام پھر کبھی سہی۔ پہلے تمہارا ہی کام ہو جائے کیوں کہ یہ رشتوں والی بات سب سے افضل ہوتی ہے''

پھر اُنھوں نے قدیر کی ٹھڈی پکڑ کر بڑے پیار سے کہا ''تمہارے شرمانے سے میں سب کچھ سمجھ گیا''

ان کی اس بات پر قدیر دل ہی دل خوش ہو کر نہال ہو گیا۔ یہ بات اُس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ شیر علی اپنی بیٹی کی شادی اس کے ساتھ کرنے پر اتنی جلدی راضی ہو جائیں گے وہ اس غیر متوقع کامیابی پر غور کر رہا تھا کہ شیر علی بولے

''دیکھو قدیر میاں۔ اس وقت تو کافی رات ہو گئی ہے اس لئے تمہاری والدہ کا اس وقت یہاں آنا مناسب نہ ہوگا اگر تمہاری رائے ہو تو میں خود تمہارے ساتھ چلا چلوں تا کہ اسی وقت باتیں ہو جائیں بھائی نیک کام میں دیر کیوں کی جائے جب فریقین راضی ہیں تو پھر اس میں دیر کیسی... کہ غلط کہتا ہوں؟''

''صحیح کہتے ہیں آپ'' قدیر نے کہا ''تو میں سمجھوں کہ آپ کو کوئی اعتراض نہیں اس رشتے پر''

''بالکل سمجھو'' وہ جھٹ سے بولے ''ارے بھائی جب میں نے فریقین کہہ دیا تو پھر کیا پوچھنا۔ تم ماں بیٹے کی رضامندی تو تمہاری باتوں سے معلوم ہو گئی۔ میں بھی ساڑھے پندرہ آنے راضی ہوں۔ ہاں ذرا اپنی بیٹی سے ایک بار پوچھنا ہے۔ وہ بے ماں کی بچّی ہے نا؟''

''بے شک بے شک'' قدیر بولا ''پوچھنا ضروری ہے''

''ویسے جس طرح تم نے اپنی والدہ کی مرضی پر اپنی سعادت مندی دکھائی ہے اسی طرح میری بیٹی بھی راضی ہو جائے گی۔ اب تم گھر جاؤ اور اپنی والدہ کو بتا دو کہ میں بالکل تیار ہوں اور یہ بھی چاہتا ہوں کہ جتنی جلدی یہ نیک کام ہو جائے بہتر ہے۔ کوئی زیادہ دھوم دھام کی ضرورت بھی نہیں''

جانے سے پہلے قدیر نے جھک کر بڑا مودبانہ سلام کیا۔

★★★

میر فدا حسین سونے کے بسکٹوں کا تھیلا پا جانے کے بعد آندھی طوفان کی طرح بھدرکؔ سے بھاگے اور کان پور جانے والی بس میں بیٹھ گئے۔ بسکٹوں کا تھیلا تو اُنھوں نے اپنے سفری بیگ میں پہلے ہی رکھ لیا تھا مگر جس احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ وہ اپنے بیگ کو دبوچے بیٹھے تھے اس سے یہ صاف ظاہر تھا کہ اس میں کوئی بہت قیمتی چیز ہے۔ میر صاحب کے اس دور اندیشی میں بھی احتیاط کو دخل تھا کہ بس میں کھڑکی سے چپک کر بیٹھے تھے اور اپنے اردگرد کے مسافروں کو جانچنے والی نظروں سے پرکھ کر یہ

بھی معلوم کرلیا تھا کہ ان میں کوئی چور یا رہزن تو نہیں ہے۔اتنی احتیاط کے باوجود اُنھیں اپنے پیچھے والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ایک نوجوان لڑکے پر شک ہو رہا تھا کہ وہ ضرور کوئی بدمعاش یا اُچکّا ہے۔ وہ راستے بھر فلمی گانے گاتا اور بیچ بیچ میں سگریٹ پیتے ہوئے اس کا دھواں میر صاحب کے منہ پر پھینک رہا تھا۔ راستے میں کسی مقام پر میر صاحب کے بازو والی سیٹ خالی ہوگئی تو بڑی دیر تک اس پر کوئی دوسرا مسافر نہیں بیٹھا۔ دو ایک بار اس لونڈے نے میر صاحب سے کہا ''بابا۔سیٹ تو خالی ہے اس پر لیٹ جایئے۔'' مگر میر صاحب نے اس کے مشورے پر دھیان نہیں دیا۔ اونچاہار میں ایک برقع پوش خاتون بس میں سوار ہوئیں تو پہلے اُنھوں نے بس کے اندر اپنے لئے کسی مناسب سیٹ پانے کی خاطر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ میر صاحب نے خوشی خوشی اُنھیں اپنے بغل والی سیٹ پر بیٹھنے کے لئے ہاتھ سے اشارہ کیا تو وہ اپنا ہلکا پُھلکا بریف کیس فرش پر رکھ کر میر صاحب کے بغل میں بیٹھ گئیں۔ باہر سے ایک لڑکے نے پلاسٹک کی باسکٹ ان خاتون کو دیتے ہوئے کہا ''لیلیٰ ممانی اس ٹوکری میں آپ کا ناشتہ ہے'' ایک اجنبی مگر جوان صنف نازک کو اپنے پہلو میں بٹھانے کے بعد میر صاحب پر کوئی رومانس نہیں طاری ہوا کیونکہ اول تو وہ اس جذبہ ہی سے یکسر عاری تھے دوسرے اس لئے بھی کہ ہاتھوں اور چہرے کی جھلک نے ان خاتون کی آبنوسی رنگت کو میر صاحب پر پوری طرح عیاں کردیا تھا اس لئے وہ خاموشی سے بیٹھے تو رہے مگر اپنے ہم سفر کے حرکات وسکنات سے غافل نہیں ہوئے اُنھوں نے اس بات کو نوٹ کیا کہ خاتون ہر دس پندرہ منٹ کے بعد اپنی مراد آبادی پان کی ڈبیہ سے پان کے بیڑے نکال کر کھاتی تھیں اور میر صاحب کی بے چارگی اس وقت اپنے عروج پر ہوتی جب محترمہ بڑے اعلیٰ درجہ کی قوامی تمبا کو چاٹ کر اس کی خوشبو بکھیرتی تھیں۔ رائے بریلی پہونچنے تک میر صاحب کا پیمانۂ ضبط یکسر لبریز ہو چکا تھا اس لئے رائے بریلی میں وہ بس سے اُترے بغیر ایک مسافر سے بولے

''بھیا ذرا سامنے والی پنواڑی کی دوکان سے چار بیڑے پان لے لیجئے''

مسافر میر صاحب سے روپیہ لے کر چلا گیا تو ہمسفر خاتون نے معذرت کی

''چچا جان میرے پاس پان ہیں مگر افسوس ہے کہ میں نے پہلے آپ کو نہیں پیش کئے اگر کوئی حرج نہ ہو تو آپ ان پانوں سے شوق فرمایئے۔''

''ارے نہیں حرج کیا ہے۔مگر میں نے تو منگوا لئے ہیں۔'' وہ بولے

''تو وہ آگے کام آئیں گے تب تک آپ ان میں سے کھائیں'' خاتون نے دو بیڑے ڈبیہ سے نکال کر میر صاحب کی طرف بڑھائے میر صاحب نے مزید انکار نہیں کیا

''جیتی رہو'' وہ بولے ''مگر ہم آپ کا قوام بھی کھائیں گے''

خاتون نے اپنے پرس میں سے قوام کی شیشی نکالی اور اس میں سے دو بار ماچس کی تیلی سے

تھوڑا تھوڑا خوشبو دار قوام نکال کر میر صاحب کو عنایت کیا اور جب بس رائے بریلی سے چلی تو دس ہی منٹ بعد میر صاحب بس کی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے سو گئے پھر اس وقت ہوش میں آئے جب کان پور کے بس اسٹیشن پر اُنھیں جھنجھوڑ کر جگایا گیا۔ میر صاحب کا سفری بیگ برقع پوش محترمہ لے کر کسی اسٹیشن پر اُتر گئی تھیں۔ میر صاحب نے جب ہوش میں آکر آنکھیں کھولیں تو بس مسافروں سے خالی ہوچکی تھی اور ان کا سفری بیگ غائب تھا۔ اس ہوش ربا حادثہ کا لازمی نتیجہ تھا کہ پیروں تلے سے زمین کھسکتی کیوں کہ اتنی احتیاط کے باوجود وہ چرکہ کھا گئے تھے۔ اپنے نقصان کا اندازہ لگاتے ہی وہ پاگلوں کی طرح اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ کلکٹر گنج کے بس اسٹینڈ پر وہ بوکھلائے ہوئے ایک کے بعد ایک بس میں گھستے اور پھر اُتر پڑتے۔ بڑی دیر تک وہ یہی کرتے رہے پھر تھک ہار کر بغیر کچھ کھائے پیئے ایک دوکان کے تختے پر لیٹ کر سو گئے۔

عزیز بیگ بھی میر صاحب کے تعاقب میں رات کے وقت مدنی پور پہونچ گئے مگر میر صاحب تو مدنی پور کے بجائے کان پور میں بے یار و مددگار لُٹے مسافر کی طرح ایک دوکان کے تختے پر پڑے تھے۔ قدیر بھی اس وقت تھانہ میں داروغہ شیر علی کے ساتھ شادی کی بات چیت میں مصروف تھا۔ کرامت علی کو زرّیں نے سمجھا بجھا کر گھر سے روانہ کردیا تھا کہ دو چار دن بعد جب میر صاحب آجائیں گے تب ہی وہ ان سے شادی کے مسئلے پر بات چیت کرنے آئے۔ دراصل زرّیں کو یہ ڈر تھا کہ اگر کرامت علی رات کے وقت گھر پر رک گیا تو ہوسکتا ہے کہ وہ تنہائی کا فائدہ اٹھا کر پیش دستی کرے جس کی چھوٹ اس نے کرامت کو پہلے بھی دے رکھی تھی۔

رات کا کھانا کھا کر کرامت علی نے شیروانی پہنی سر پر مفلر لپیٹا اور زرّیں سے بولا ''اچھا زرّو۔ میں جا رہا ہوں ہوسکتا ہے دو تین دن بعد پھر آؤں کیونکہ میں اب زیادہ دنوں تک انتظار نہیں کرسکتا۔ اچھا تو یہ ہے کہ میر صاحب کے آنے پر تم بھی ان سے میرے بارے میں کہہ سن لینا۔''

''ارے واہ!'' زرّیں نے کہا ''میں ان سے کیسے کہوں گی''

''ٹھیک ہے۔تو میں ہی بات چیت کرلوں گا'' اس نے کہا

''ہاں ہاں'' زرّیں بولی ''اور اب تم جاؤ تمہاری گاڑی دس بجے اسٹیشن پر آجاتی ہے۔''

کرامت علی تھوڑی دور گیا تھا کہ سامنے سے عزیز بیگ روشن کو ساتھ لئے آتے دکھائی دیئے۔ نہ تو عزیز بیگ کرامت علی کو پہچانتے تھے اور نہ کرامت علی عزیز بیگ کو۔ خود روشن بھی کرامت علی کو اُس کے موجودہ حلئے میں یعنی بلا داڑھی مونچھ کے نہ پہچان سکی البتہ کرامت نے روشن کو فوراً پہچان لیا مگر اس نے ہوشیاری یہ کی کہ منہ سے کچھ نہیں بولا۔ وہ تو روشن کو اس آدمی کے ساتھ دیکھ کر اس نتیجے پر پہونچ گیا تھا کہ یہی وہ آدمی ہے جو چندا اور روشن کو بہکا کر گھر سے لے گیا ہے اور یہی وہ آدمی ہے جس کی وجہ سے چندا موت کا شکار ہوئی ہے۔ عزیز بیگ نے کرامت علی کے قریب پہونچ کر پوچھا ''کیوں جناب۔

میر فدا حسین کا مکان کتنی دور ہے؟''

''میر فدا حسین؟'' کرامت بولا ''ان کا مکان تو یہاں سے زیادہ دور نہیں لیکن آپ پردیسی معلوم ہوتے ہیں رات کے وقت مکان ڈھونڈنے میں آپ کو زحمت ہوگی۔ آیئے میں تو اسی طرف جا رہا ہوں آپ کو ان کے مکان تک پہونچا دوں گا۔''

''آپ کا بہت بہت شکریہ'' بیگ نے کہا اور کرامت کے ساتھ ہولیا۔

''کہاں سے تشریف لا رہے ہیں آپ'' کرامت نے راستے میں پوچھا ''میر صاحب سے کوئی رشتہ داری ہے؟''

''جی ہاں'' عزیز بیگ نے مختصر جواب دیا

''معاف کیجئے گا - کیا میں آپ کا نام معلوم کرسکتا ہوں؟'' کرامت نے دوسرا سوال کیا

''مجھے عزیز بیگ کہتے ہیں'' پھر فوراً ہی بولے ''اور یہ میری بھتیجی ہے - روشن''

''اچھا اچھا''

کرامت علی عزیز بیگ کو میر صاحب کے گھر کی طرف لے جانے کے بجائے اس طرف لے چلا جدھر بالکل سنّاٹا تھا۔ آم اور مہوے کے گھنے درختوں کے آگے دریائے گنگا کا ریتل تاریکی اور سنّاٹا تھا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد کرامت علی نے پھر ایک سوال کیا ''اس وقت گاؤں میں آپ کو کوئی اور بھی ملا تھا؟''

''نہیں - مگر آپ مجھے کدھر لے چل رہے ہیں اس طرف تو کوئی آبادی نہیں ہے'' عزیز بیگ نے کہا

''آبادی!'' کرامت ہنس کر بولا ''بھائی صاحب یہ آگے آبادی ہی آبادی تو ہے۔ اسے کہتے ہیں شہر خموشاں یعنی قبرستان۔ گورستان اور اس کے آگے ہے میر صاحب کا نخلستان۔ آیئے آیئے''

''جی نہیں'' وہ بولے ''اب میں آگے نہیں جاؤں گا - مجھے قبرستان سے ڈر لگتا ہے۔''

''ہاں ضرور لگتا ہوگا'' کرامت نے کہا ''اگر آپ کے پاس پستول ہو تو نکال لیجئے، ویسے اندھیرے قبرستان میں پستول وغیرہ سب بیکار ہے یہاں تو بس چاقو قرولی گنڈاسہ کام دیتا ہے''

قبرستان کی سرحد سے پہلے ہی عزیز بیگ وہیں رک گئے کیونکہ ایک باتونی اجنبی کے ساتھ وہ اندھیرے قبرستان میں نہیں جانا چاہتے تھے۔ اُنھیں اب خود کرامت علی سے بھی ڈر لگنے لگا کیونکہ وہ باتوں کے علاوہ اپنے چہرے مُہرے سے بھی خوفناک لگتا تھا۔

''سنئے - اب آپ جاسکتے ہیں - بہت بہت شکریہ، میں میر صاحب کے گھر پہونچ جاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے مگر کیا آپ یہیں بیٹھے رہیں گے - ارے چلئے میرے ساتھ۔ آپ کے ساتھ

چھوٹی سی بچّی ہے۔ جب آپ کو قبرستان سے ڈر لگتا ہے تو یہ بے چاری تو ابھی بچّی ہے''

''میں پوچھتا ہوں کوئی دوسرا راستہ ان کے مکان تک جانے کا نہیں ہے؟''

''ہاں ہاں - بالکل ہے'' کرامت نے دھیرے سے کہا ''مگر اس میں آپ کی جان کو خطرہ ہے''

''کیا خطرہ ہے؟'' عزیز بیگ نے پوچھا

عزیز بیگ کے منھ سے صرف اتنا ہی نکلا تھا کہ کرامت نے یا علی کہہ کر اس کے اوپر زبردست چھلانگ لگائی اور پلک جھپکتے میں اُسے زمین پر گرا کر سینے پر سوار ہوگیا۔ وہ عزیز بیگ سے کافی طاقت ور تھا اس لئے اسے زمین پر گرا کر کرامت علی کے مضبوط ہاتھوں نے اس کا گلا تھام لیا۔ بیگ بہت اُچھلا کودا اور اس کی پکڑ سے نکل جانا چاہا مگر کرامت کی گرفت سے آزاد نہ ہو پایا۔ کرامت پر یک بیک خون سوار ہوگیا تھا وہ چندا کی جان لینے والے کا بدلہ لینے کے لئے دانت پر دانت بٹھائے اس کا گلا گھونٹتا رہا۔ عزیز بیگ دس منٹ کی جدوجہد کے بعد تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہوگیا۔ روشن خوف زدہ سہمی ہوئی یہ سب دیکھ رہی تھی۔ عزیز بیگ کو ختم کر کے کرامت نے روشن سے کہا

''روشن - میری بچّی - میں تیرا ابا ہوں - کرامت علی۔ تو مجھ سے ڈر نہیں میں تجھے اپنے ساتھ گھر لے چلوں گا''

رات کے اندھیرے میں کرامت نے عزیز بیگ کی لاش لے جا کر گنگا ندی میں پھینک دی اور روشن کو اپنے ساتھ لے کر اسی وقت مدنی پور سے چل دیا۔

★ ★ ★

رات میں قدیر سے بخیال خود اپنی شادی کا مژدۂ جانفزا سننے کے بعد شیر علی نے حولدار گنپت رام کو قدیر کے ساتھ کر دیا کہ وہ حفاظت کے ساتھ اُسے گھر تک پہونچا دے۔ گنپت رام راستے بھر اس بات سے لطف اندوز ہوتا رہا کہ قدیر کا معاملہ طے ہوگیا اور جلد ہی ثریا کے ساتھ اس کی شادی ہوجائے گی۔ اس نے قدیر کو چھیڑتے ہوئے مزاحاً کہا۔

''واہ میرے شیر - تم نے تو بہت بڑے شیر کو زیر کیا - مگر بیٹے رام میری بدّھی میں یہ بات نہیں آئی کہ آخر کون سا جادو منتر تم نے مارا کہ داروغہ جی جھٹ پٹ رام ہو گئے۔''

''وہی پرانا منتر گنپت رام جی جس نے تمھیں رام کیا تھا'' قدیر نے کہا

''اچھا!'' گنپت رام بولا ''بس پیارے اتنی ڈینگیں نہ مارو - ہم تو آدھے رام پہلے ہی سے تھے سو اب بھی ہیں وہ بٹیا رانی کی وجہ سے - ورنہ پیارے تمھیں پریم ناٹک رچانے کی ڈھیل دینے کی جگہ

حوالات میں بند کر دیتا۔‘‘

’’محبت اگر سچّی ہو تو اس کی گرمی سے زنجیر و ہتھکڑیاں سب پگھل کر پانی ہو جاتی ہیں۔ آپ نے سنا نہیں۔ جو ہو سچّی محبت تو پگھل جاتی ہیں ہتھکڑیاں‘‘

’’ارے واہ رے میرے شیر‘‘ گنپت رام بولا ’’جواب نہیں تمہارے شعر کا۔ مگر بیٹا یہ شعر تم داروغہ جی کو مت سنانا نہیں تو ہمارے تھانے کی ساری ہتھکڑیاں بیڑیاں پگھل کر پانی ہو جائیں گی۔ بیٹا تمہاری محبت کی آنچ کو گنپت رام خوب سمجھتے ہیں‘‘

’’تم ہماری محبت کا مذاق اُڑا رہے ہو گنپت رام جی‘‘ قدیر نے کہا

’’نہیں نہیں بیٹا ہم تو اس کی سراہنا کر رہے ہیں۔ زندہ باد۔ اے محبت زندہ باد، یہ گانا فلم مغل اعظم کا ہے۔ اور پیارے شہزادۂ سلیم۔ جاؤ دیکھو وہ سامنے تمہارا خیمہ دکھائی دیتا ہے۔ رات کے اندھیرے میں چپکے سے کھسک لو ورنہ اگر مہابلی نے مجھے تمہارے ساتھ دیکھ لیا تو بغاوت کے جرم میں میری گردن قلم ہو جائے گی۔ اور تمہاری ماتا مہارانی جودھا بائی۔۔‘‘

’’اب چاچا مجھے گھر کے دروازے تک تو پہونچا دو مجھے اندھیرے میں ڈر لگ رہا ہے۔‘‘

’’ارے واہ رے بہادر۔ ابھی تو ہتھکڑیاں پگھلائے دیتے تھے اب لومڑیوں سے ڈر لگنے لگا‘‘

’’اچھا گھر چل کے کچھ جل پان تو کر لو۔ مہراج‘‘ قدیر نے کہا

’’نہ جل نہ پان۔ کل بازار کا دن ہے گرما گرم امرتیاں کھاؤں گا‘‘ گنپت رام بولے

اُسی رات میں جب قدیر سونے کے لئے بستر پر لیٹا تو ماں سے بولا

’’امّاں۔ اب تو میں شادی کر سکتا ہوں نا؟‘‘

’’ہاں ہاں۔ کیوں نہیں‘‘ زرّیں نے جواب دیا ’’مگر پہلے اپنی پہلی بیوی کا سرکار سے معاوضہ تو مل جانے دو۔ اگر پہلے ہی شادی کر لو گے تو روپے ملنے میں اڑچن نہ پڑ جائے گی‘‘

’’اڑچن کیوں پڑے گی‘‘ قدیر بولا ’’وہ بات تو اپنی جگہ پر ہے ملتے ملتے کافی وقت لگ جائے گا۔‘‘

’’میں سمجھ گئی‘‘ وہ ہنس کر بولی ’’تو نے ضرور کوئی لڑکی پسند کر لی ہے۔ کر لی ہے نا؟‘‘

’’امّاں۔ تم بڑی سمجھدار ہو‘‘ قدیر شرما کر اس سے لپٹ گیا

’’بتا تو سہی۔ کون ہے وہ؟‘‘

’’وہ۔ داروغہ شیر علی ہیں نا۔ اُنھیں کی بیٹی ہے ثریا۔ بہت اچھی ہے امّاں‘‘ قدیر نے کہا

’’یا اللہ!‘‘ زرّیں نے اپنا ماتھا پیٹا ’’پڑ گیا نا عاشقی میں۔ ارے یہ تو سوچا ہوتا کہ وہ داروغہ ہیں اور ہم معمولی غریب لوگ۔ شادی کی بات سنتے ہی وہ غصّہ میں لال پیلے ہو جائیں گے۔‘‘

’’نہیں نہیں امّاں‘‘ قدیر نے کہا ’’وہ راضی ہیں۔ بالکل راضی ہیں۔‘‘

’’تو نے ان سے بات کی تھی کیا؟‘‘ زرّیں نے پوچھا

’’ارے وہ تو ابھی اور اسی وقت میرے ساتھ آ رہے تھے۔ وہ چاہتے ہیں کہ جلد سے جلد بہت سادہ طریقے سے شادی ہو جائے۔‘‘

’’مجھے تو یقین نہیں آتا‘‘ وہ بولی ’’خیر۔ اس بارے میں پہلے میر صاحب سے باتیں کرنی ہوں گی‘‘

’’میر صاحب۔ ہونہہ!‘‘ قدیر نے کہا ’’وہ بھلا اس رشتے پر کب تیار ہوں گے۔ تمہیں معلوم نہیں کہ میاں کے تعلقات داروغہ جی سے اچھے نہیں وہ سنتے ہی بھینگ مار دیں گے۔‘‘

’’نہیں نہیں‘‘ زرّیں نے ہنس کر کہا ’’میں انھیں راضی کر لوں گی‘‘

’’لیکن وہ ہیں کہاں۔ کہاں غائب ہیں صبح سے۔ کون سا ضروری کام نکل آیا تھا؟‘‘ قدیر نے پوچھا

پھر وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ اگر میر صاحب بسکٹوں کا تھیلا پا گئے ہیں تو اب تک گھر کیوں نہیں پہونچے۔ کیا ان کی نیت یہ ہے کہ وہ ان بسکٹوں کے بارے میں کسی کو ہوا نہ لگنے دیں خود اس کو بھی نہ بتائیں اور چپ چاپ سارا مال ہضم کر جائیں۔ ان کے ابھی تک واپس نہ آنے سے یہ بھی ممکن ہے کہ راستے میں وہ کسی مصیبت میں پھنس گئے ہوں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بسکٹ کوئی اور لے گیا ہو۔ یہ سوچ کر وہ فکر مند ہو گیا۔

’’ارے وہ صبح تک آ ہی جائیں گے‘‘ زرّیں نے کہا

’’مجھے بتاؤ امّاں‘‘ قدیر بولا ’’داروغہ جی شادی کی بات چلائیں گے تو کیا کہو گی؟‘‘

’’توبہ ہے۔ آخر اتنی تڑپن کیوں ہے؟‘‘ وہ بولی ’’اچھا تو ہی بتا۔ میں کیا کہوں گی؟‘‘

’’امّاں۔ آپ جھٹ پٹ راضی ہو جایئے گا‘‘ وہ بولا ’’کہئے گا۔ ٹھیک ہے جیسا آپ چاہیں ہمیں منظور ہے۔‘‘

’’واہ‘‘ زرّیں نے کہا ’’یہ میں کیوں کہوں۔ یہ بھی کوئی بات ہے کہ جو وہ چاہیں جیسا وہ چاہیں مجھے سب منظور ہے‘‘

’’اُفّوہ‘‘ وہ بولا ’’بات صرف رشتے کی ہو رہی ہے۔ دان دہیج اور لین دین کی نہیں‘‘

’’پھر بھی ساری باتیں ٹھونک بجا کر پہلے سے طے کر لینی چاہئے۔ رشتہ طے کرنا منھ کا نوالہ ہے کیا؟‘‘

’’تب تم ضرور گڑبڑ کر دو گی امّاں‘‘ قدیر نے کہا ’’میں کہتا ہوں تم صرف ہاں کر دینا بس۔‘‘

’’صرف ہاں کر دوں؟‘‘ وہ بولی ’’اچھا بھائی تیری ہی بات اونچی۔ کر دوں گی ہاں۔‘‘

دوسرے دن جب عزیز بیگ کی لاش گنگا ندی میں ملی تو آس پاس کے گاؤں میں چرچا ہو گیا۔ قدیر کو معلوم ہوا تو وہ بھی تماشائی بن کر موقع پر گیا۔ عزیز بیگ کی لاش دیکھتے ہی اُسے پہچان گیا۔

تماشائیوں کی بھیڑ میں لوگ اس اجنبی کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے مگر قدیر کے ہوش وحواس گم تھے وہ دل ہی دل میں یہ سوچ رہا تھا کہ عزیز بیگ کو قتل کرنے والا کون ہوسکتا ہے۔ سونے کے بسکٹوں کا معاملہ میر صاحب کی ذات کو پوری طرح مشکوک کر رہا تھا۔ اُن کا بغیر کسی کے علم واطلاع کے اچانک گھر سے غائب ہوجانا بھی قتل میں ملوث ہونے کا شبہ بڑھاتا تھا۔ لیکن سونے کے بسکٹ اگر میر صاحب لے گئے تھے تو قتل اُن کا ہونا چاہئے تھا نہ کہ عزیز بیگ کا پھر میر صاحب اتنے طاقتور تو نہ تھے کہ وہ اکیلے اپنے سے زیادہ مضبوط آدمی کو مار سکتے۔ اُس نے سوچا یہ کام خالو کرامت علی کا بھی تو ہوسکتا ہے کیونکہ ان کے کہنے کے بموجب کوئی آدمی روشن اور چندا کو بہکا کر گھر سے لے گیا تھا تو وہ آدمی عزیز بیگ کے سوا اور کون ہوسکتا ہے وہی تو اس کی تلاش میں مدنی پور آیا تھا اور اس کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔

موقعۂ واردات پر حلقہ کے داروغہ کے آنے سے پہلے ہی وہ اپنے گھر لوٹ آیا مگر دوپہر کے قریب شیر علی سرکاری جیپ اور سرکاری وردی کے ساتھ اس کے گھر آپہونچے۔ زرّیں تو صبح سویرے ہی سے شیر علی کے آنے کا انتظار کر رہی تھی قدیر نے بتایا تھا کہ شیر علی کل کسی وقت رشتے کی بات طے کرنے آئیں گے اس لئے جب زرّیں کو معلوم ہوا کہ شیر علی آئے ہیں تو وہ بہت خوش ہوئی۔ داروغہ شیر علی کمرہ میں آکر بیٹھ گئے تو زرّیں نے ساڑی کا پلّو سر پر ٹھیک کیا اور دروازے کی آڑ سے بولی

''بندی آداب عرض کرتی ہے داروغہ صاحب''

''آداب عرض ہے'' پھر فوراً ہی اُنھوں نے اپنا مقصد ظاہر کیا ''بھائی میں اس وقت میر صاحب سے ملنے کے لئے یہاں آیا ہوں- کیا وہ گھر پر ہیں؟''

''جی نہیں'' زرّیں نے جواب دیا ''وہ تو کل صبح سے گھر پر نہیں ہیں شاید کسی ضروری کام سے کان پور گئے ہیں اور کل شام تک اُنھیں واپس بھی آجانا چاہئے تھا۔''

یہ سن کر شیر علی قدیر سے مخاطب ہوئے ''سنا تم نے- عزیز بیگ کا مرڈر ہوگیا''

''عزیز بیگ؟- کون عزیز بیگ؟'' قدیر نے پوچھا

''وہی جو تمہارے پاس اپنی بیوی اور بیٹی کے بارے میں پوچھنے آئے تھے- یاد آیا؟''

''میں نے سنا ہے کہ لاش دریا سے برآمد ہوئی ہے تو پھر آپ اسے مرڈر کیوں کہتے ہیں خود کشی کہئے۔''

''بتاتا ہوں'' شیر علی بولے ''عزیز بیگ کو یہاں گاؤں میں کوئی نہیں پہچانتا- مگر میں جانتا ہوں وہ ایک بار تم سے اپنی بیوی اور بیٹی کے بارے میں کچھ پوچھنے آئے تھے- اور تمہارے ہی کہنے کے مطابق اُس رات کو ان پر کسی نے گولی چلائی تھی- خیر اس دن تو میں نے زیادہ پوچھ گچھ نہیں کی تھی لیکن آج جاننا چاہتا ہوں کہ وہ گولی عزیز بیگ پر کس نے چلائی تھی''

''جی!'' قدیر گھبرا گیا ''مجھے نہیں معلوم- میں کیا بتا سکتا ہوں۔''

''ہوں- دیکھو قدیر میاں'' وہ بولے ''اب مجھے نہیں معلوم سے کام نہ چلے گا- یہ بات اچھی طرح سن اور سمجھ لو کہ تم اگر اسی طرح انکار کرتے رہے تو قتل کا سارا شبہ تمہاری طرف جائے گا''

''مگر جناب والا'' قدیر رال گھونٹ کر بولا ''آپ کو یہ بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ نو بجے رات تک میں آپ کے ساتھ تھا اس کے بعد گنپت رام مجھے گھر چھوڑنے گئے۔ پھر میں کھانا کھا کر سو گیا گھر سے نکلا بھی نہیں تو پھر مجھ پر شک کیوں ہے''

''وہ سب میں نہیں جانتا'' شیر علی نے کہا ''لیکن عزیز بیگ پر گولی چلانے والے کا نام اگر تم خود نہیں بتا سکتے تو مجبوراً مجھے زبان کھولنی پڑے گی اور اگر میں نے کسی کا نام لیا تو تمہیں بھی وہی کہنا پڑے گا جو میں کہوں گا''

''اچھا'' قدیر بڑی نقاہت سے بولا

''تو سنو'' شیر علی بولے ''گولی میر صاحب نے چلائی تھی- کہو ہاں''

''جناب- یہ میں کیسے کہہ دوں کہ گولی اُنھوں نے چلائی تھی'' قدیر نے کہا ''سچ کہتا ہوں مجھے تو معلوم بھی نہیں ہوا کہ کس نے گولی چلائی تھی۔ پھر میں اُن کا نام لے کر اُنھیں کیسے پھنسا دوں''

''اچھا!- تو تم لٹک جاؤ پھانسی پر'' شیر علی نے کہا ''ویسے برخوردار تم پر بھی شک کرنے کے کافی وجوہ اور ثبوت میرے پاس موجود ہیں اور چاہوں تو ابھی تمہیں ہتھکڑی لگا دوں۔''

قدیر ڈر کر خاموش ہوگیا اور شیر علی کے چہرے پر ان کے تاثرات کو ناپ تول کر یہ اندازہ کرنے لگا کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں اس میں کہاں تک سچائی ہے۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ کل رات تک وہ جس آدمی کے ساتھ اپنی بیٹی بیاہنے کی بات کر رہے تھے آج اُسی کو بلا سبب قتل کے الزام میں پھنسا دیں گے۔ قدیر کی خاموشی دیکھ کر شیر علی کرسی سے اُٹھ کھڑے ہوئے ''کیا سوچا؟''

''ٹھیک ہے- جیسا آپ کا حکم ہو'' قدیر نے کہا

''اچھا- تم ابھی باہر رکو'' وہ بولے ''پہلے میں تمہاری والدہ سے باتیں کر کے آتا ہوں''

شیر علی نے کمرے کے دروازے پر زرّیں کو پہلے ہی کھڑی دیکھ لیا تھا۔ قدیر کو باہر روک کر وہ برآمدے میں آئے زرّیں ابھی وہیں کھڑی تھی۔ قریب پہونچ کر وہ دھیرے سے بولے

''قدیر نے بتایا ہے کہ تم عقد کے لئے راضی ہو۔ یہ جان کر مجھے بڑی خوشی ہوئی''

''ہاں داروغہ صاحب- ہم دونوں تو راضی ہیں- ایک ذرا میر صاحب سے بھی رائے لے لوں۔''

''کیا؟'' وہ چمک کر بولے ''دیکھو میر صاحب کا نام تو اب میرے سامنے لینا نہیں۔ رات جو قتل ہوا ہے اس میں یقینی طور سے وہ پھنس چکے ہیں۔ میں تو بھائی اپنے کار منصبی کو ایمان داری کے ساتھ

انجام دینے کا عادی ہوں۔اس لئے اب ان کا خیال اپنے دل ودماغ سے نکال دو پھر تمہارا اوران کا رشتہ ہی کیا ہے چھوڑو اُنھیں۔جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ویسے اب تو تمہیں بھی نئے رشتے کی چھاؤں میں زندگی بسر کرنی ہے''

''میں سمجھ نہیں پائی کہ آپ کیا چاہتے ہیں''زرّیں نے کہا''صاف صاف کہئے''

''تو سنو''شیر علی نے راز داری سے کہا''میں چاہتا ہوں کہ آج رات ہی میں نکاح پڑھا کے تمہیں اپنے گھر لے چلوں''

''کیا؟زرّیں نے ہنس کر پوچھا''مجھے کہاں لے چلئے گا؟''

''اپنے گھر جان من''شیر علی جذباتی ہوگئے''اپنی شریک حیات بنا کر۔سچ تو یہ ہے کہ جس دن سے تمہیں دیکھا ہے میری راتوں کی نیند غائب ہوگئی ہے تم میری مرحومہ بیوی کی بالکل ہم شکل ہو،تم چاہو تو میرے اُجڑے کاشانے میں پھر سے بہار لاسکتی ہو''

''تو کیا–آپ–مجھ سے نکاح پڑھانے کی بات کررہے ہیں؟''زرّیں نے تلخ لہجہ میں پوچھا

''ہاں ہاں''وہ بولے''یہ تو نیک کام ہے–ایک صالح عمل ہے۔ہم دونوں میاں بیوی ہوجائیں گے۔''

''ارے واہ!''وہ چمک کر بولی''ذرا سوچ سمجھ کر بولئے۔کیا کہہ رہے ہیں آپ''

''کیا کہہ رہا ہوں؟''شیر علی کا لہجہ بھی سخت ہوگیا''کیا کوئی انوکھی بات کہہ دی میں نے؟''تم سے نکاح کی بات کہی ہے کوئی بری بات تو نہیں کہی۔تمہارے بیٹے نے بھی تو مجھ سے یہی بتایا تھا کہ تم راضی ہو''

''بس بس''وہ اور تیز ہوگئی''یہ نکاح وکاح کی بات اپنے ہی پاس رکھئے۔ہونہہ!بڑے آئے ہیں نکاح کرنے والے۔مجھ سے نکاح کریں گے یہ''

''دیکھو جان من''شیر علی تھوڑا نرم ہوئے''ذرا سمجھ داری اور دور اندیشی سے کام لو میں نے تو دل ہی دل میں تمہیں اپنی رفیقۂ حیات مان لیا ہے اور تمہیں حاصل بھی کرلوں گا مگر یہ عہد بھی کرچکا ہوں کہ بغیر نکاح کے تمہیں ہاتھ نہ لگاؤں گا کیونکہ نہ تو میں میر صاحب ہوں اور نہ میرے بزرگوں نے مجھے جنّت میں جانے کی بشارت دے رکھی ہے۔بس اگر تھوڑی سمجھ بھی تم میں ہے تو میری بات پر دھیان دو زندگی کے راستے بڑے کٹھن ہیں جب ہم دونوں کو شریک حیات کی ضرورت ہے تو پھر کیوں نہ ہنسی خوشی سے رہیں''

''بس بہت سن چکی–اب آپ تشریف لے جائیے،یہاں سے''

''اس انکار کا انجام بھی معلوم ہے؟''داروغہ جی دانت پیس کر بولے

''معلوم ہے۔توپ دم کرادیجئے گا۔یہی نا''وہ بولی

شیر علی ذرا دیر کو خاموش رہے پھر نرم لہجے میں بولے

''دیکھو–ایک بار پھر سمجھا دوں–شریف زادیوں کی طرح چل کر میرے ساتھ رہو۔سمجھ لو تمہارے سکھ چین کے دن اب شروع ہوئے ہیں اور اگر میرا نیک مشورہ تمہیں پسند نہیں اور تمہیں اس کھڈّوس کی رکھیل ہی بن کر رہنے میں مزہ ہے تو سن لو تمہارے بیٹے اور بڈّھے یار کو سات سات سال کے لئے جیل کی ہوا نہ کھلوادی تو مجھے شیر علی نہ کہنا۔''

''میں ان دھمکیوں میں آنے والی نہیں ہوں آپ کا جو جی چاہے کیجئے۔''یہ کہہ کر زرّیں اندر چلی گئی

''ٹھیک ہے–میں بھی دیکھوں گا کتنی پاک وپاکیزہ ہو–ہونہہ!''

شیر علی بڑے طیش میں اپنی بید کی چھڑی ہلاتے ہوئے نکلے اور قدیر سے کچھ بولے بغیر اپنی جیب میں بیٹھ کر مقتول کی لاش اُٹھوانے اور ضروری لکھا پڑھی کرنے کے لئے وہاں سے چلے گئے۔

عزیز بیگ کی لاش کو گنگا کے ریتل میں گھسیٹ کر لے جانے کی غلطی کرامت نے نہیں کی بلکہ اُسے ایک کوئنٹل بورے کا وزن بنا کر اُس نے اپنی پیٹھ پر لادا اور دریا کنارے ایک اونچے کگار سے نیچے دریا میں پھینک دیا۔لاش ندی کے بیچوں بیچ تیز دھارا میں نہیں گری تھی بلکہ بالکل کنارے چھچھلے پانی میں گری تھی پھر بھی اس کے گرنے سے جو ہلکی آواز پیدا ہوئی تھی اُسے سن کر ندی کے دوسری طرف کچھار میں تربوز کی کھیتی کرنے والوں کی جھونپڑی میں ایک بڈّھا چونکّا ہوکر زور سے کھنکھارا پھر مزید کوئی آہٹ نہ پاکر وہ بھی خاموش ہوگیا۔

لاش کو اپنے حساب سے ٹھکانے لگا کر کرامت علی نے اطمینان کی سانس لی پھر روشن کے پاس آیا جو ابھی تک ڈری ڈری سی باغ کے کنارے چپ چاپ بیٹھی تھی اُس کی آنکھوں کے سامنے جو خونیں ڈراما ہوا تھا اُس نے اُسے بے حد خوف زدہ کردیا تھا۔کرامت نے پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا''روشن بٹی–تو ڈر نہیں میں تیرا ابا ہوں–کرامت علی''

روشن نے یہ سننے کے بعد بھی دہشت کے مارے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ حیرت سے اُس کی طرف دیکھا''ہاں تو نے نہ پہچانا ہوگا''کرامت بولا''میں نے تو اپنی داڑھی مونچھیں منڈادی ہیں،بٹی۔تیری نانی کنبھ میلے کی بھگدڑ میں کچل کر مرگئی۔''

روشن اس اطلاع پر بھی منھ سے کچھ نہ بولی بس کرامت کو یک ٹک دیکھتی رہی۔وہ پھر پیار سے بولا''تو کچھ بولتی کیوں نہیں؟–روشن–تو مجھ سے بول نا۔میں تیرا ابا ہوں۔''

روشن کو خاموش پاکر کرامت نے اس کا ہاتھ پکڑا''اچھا چل۔ہم لوگ یہاں سے نکل چلیں۔''

رات کی تاریکی اور سنّاٹے میں کرامت روشن کو ساتھ لئے اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔رات

کے گیارہ بج رہے تھے گاڑی ڈیڑھ گھنٹہ لیٹ تھی۔ اسٹیشن پہونچ کر روشن نے کہا ''تم میرے جائس والے بابا ہونا؟''

''ہاں بیٹی - میں ہی ہوں - میں تجھے میلے سے جائس لے گیا تھا۔''

مگر چچّا نے ہم لوگوں کو بتایا تھا کہ ریل گاڑی سے گر کر تمہارا پیر کٹ گیا ہے۔''

''کون چچا؟ - وہی جس کے ساتھ تو یہاں آئی ہے''

''ہاں'' روشن نے کہا

''بیٹی وہ تیرا چچا تھا؟'' کرامت بولا ''میں نے تو اُسے ختم کر ڈالا''

''میرا چچا بہت خراب آدمی تھا وہ امّاں کو بہت ستاتا تھا آپ نے اُسے مار ڈالا بہت اچھا کیا''

ٹرین پر کرامت نے روشن کو مونگ پھلیاں اور سموسے خرید کر دیئے وہ بہت بھوکی تھی۔ راستے میں اس نے یہ بھی بتایا کہ اس کا چچا سونے کے بسکٹوں کے بارے میں امّاں سے پوچھ پوچھ کر پریشان کرتا تھا امّاں اس سے بہت ڈرتی تھی۔

''یہ سونے کے بسکٹ کیسے ہیں؟'' کرامت نے تعجب ظاہر کیا ''تمہارا چچا ان بسکٹوں کے لئے تیری ماں کو کیوں ستاتا تھا - کیا تجھے سونے کے بسکٹوں کے بارے میں کچھ معلوم ہے؟''

اتنے سارے سوالوں پر روشن افسردہ سی ہوگئی اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے کرامت کو بتایا کہ اس کا باپ بمبئ میں ٹیکسی چلاتا تھا ایک روز اس کی ٹیکسی میں ایک بدمعاش آدمی آ کر بیٹھا جس کے پاس بہت سے سونے کے بسکٹ تھے۔ تھوڑی دور جانے کے بعد ایک جگہ پولیس والوں نے ٹیکسی رکوائی مگر اس سے پہلے ہی وہ بدمعاش سونے کے بسکٹ ٹیکسی کے اندر کسی جگہ چھپا کر اُتر گیا تھا اس لئے پولیس والوں کو ٹیکسی کے اندر کچھ نہ ملا۔ ابّا نے دیکھ لیا تھا کہ بسکٹ کہاں چھپائے ہیں گھر آ کر ابّا نے وہ پیکٹ جس میں سونے کے سو بسکٹ تھے ٹیکسی سے نکال کر امّاں کو دے کر ہم دونوں کو ریل گاڑی میں بٹھا کر بھیج دیا۔ بعد میں امّاں کو پتہ چلا کہ بدمعاش اور اس کے ساتھیوں نے ابّا کو جان سے مار ڈالا۔ بنارس میں لالچی چچا کو سونے کے بسکٹوں کے بارے میں معلوم ہوا تو اس نے خود بسکٹوں کو امّاں سے چھین کر ہضم کرنا چاہا مگر امّاں نہ جانے کہاں چھپا کر رکھے تھیں کہ چچا کو وہ بسکٹ نہیں مل پائے اُس نے امّاں کو ستانا شروع کیا اور جب حد سے زیادہ تنگ کیا تو امّاں وہ سارے بسکٹ لے کر میلے میں چلی گئیں وہاں اُنھوں نے وہ پیکٹ ایک پیڑ میں چھپا دیا۔

''پھر کیا ہوا؟'' کرامت نے اتنی جلدی پوچھا جیسے وہ بسکٹ اب بھی وہیں ہوں۔

''چچا نے مجھ سے وہ جگہ پوچھ لی مگر جب وہاں گئے تو کچھ نہ ملا''

''کوئی پہلے ہی نکال لے گیا؟'' کرامت نے سوال کیا

''ہاں'' روشن بولی ''چچا کہتے تھے وہ ایک بڈّھا ہے جس کے سر کے بال لال ہیں''

''اچھا - لال بالوں والا بڈّھا؟'' کرامت نے حیرت سے کہا ''اوہو - یہ تو - یہ میر صاحب ہیں۔ کیا اسی لئے تیرا چچا اس بڈّھے کی تلاش میں مدنی پور آیا تھا؟''

''ہاں''

کرامت رات ہی میں روشن کو اپنے ساتھ لے کر کانپور آ گیا۔

★★★

کانپور میں (کلکٹر گنج) کے بس اسٹیشن پر کرامت نے میر صاحب کو ایک دوکان کے تختے پر بہت خاموش مضمحل اور کسی گہری سوچ میں بیٹھا دیکھا مگر اُسے حیرت اس بات پر تھی کہ اگر میر صاحب واقعی سونے کے بسکٹ پا گئے ہیں تو پھر اس اُداسی اور فکرمندی کے ساتھ چپ چاپ یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہیں اُنھیں تو سیدھا اپنے گھر کا رخ کرنا چاہئے تھا۔ وہ میر صاحب کی طرف بڑھا ہی تھا کہ روشن نے دور ہی سے دیکھ کر کہا

''بابا - دیکھو دیکھو - یہ ہے لال بالوں والا بڈّھا۔ یہی تو نہیں لے گیا بسکٹ''

کوئی جواب دینے کے بجائے کرامت میر صاحب کے پاس پہونچ کر بڑے ہمدردانہ لہجہ میں بولا

''السلام علیم میر صاحب - کیا بات ہے۔ آپ کچھ پریشان سے دکھائی دیتے ہیں۔''

میر صاحب اس بے چارگی و غربت میں اپنے لئے محبت بھرا اسلام پا کر متعجب ضرور ہوئے مگر منھ سے کچھ بولے نہیں صرف سر اُٹھا کر کرامت کی طرف دیکھا اور اُسے پہچان کر پھر سر جھکا لیا

''کچھ بولئے نا میر صاحب۔ کیا بات ہے۔ کوئی تکلیف ہے۔ طبیعت خراب ہے۔ دیکھئے میں آپ کا تابع دار کرامت علی ہوں - جائس والا - مجھے بتایئے شاید میں آپ کی مدد کر سکوں''

میر صاحب نے اس بار بھی سر اُٹھا کر اُس کو دیکھا مگر پھر خاموش رہے

''آپ کا کچھ کھو گیا ہے میر صاحب؟'' کرامت نے پوچھا

''ہوں'' وہ جلدی سے بولے

اس بار کرامت نے اُن کے کان کے پاس منھ لے جا کر پوچھا ''سونے کے بسکٹ تو نہیں؟''

''کیا کہا؟'' میر صاحب تڑپ کر اُٹھے اور لپک کر کرامت کا گریبان تھام لیا

"بتاؤ کہاں ہیں بسکٹ" وہ برابر بولتے گئے "جلدی بول- کہاں رکھے ہیں- میں تجھے چھوڑوں گا نہیں- بتاؤ تم کیسے جانتے ہو بسکٹوں کے بارے میں؟ قدیر نے بتایا ہے؟"

"ہاں میر صاحب- قدیر نے مجھے بتایا ہے" کرامت نے کہا "مگر ٹھہریئے- آپ پریشان نہ ہوں، میں آپ کا دشمن نہیں ہوں- آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں- اچھا چلئے پہلے میرے ساتھ سامنے والی دوکان پر چل کر کچھ ناشتہ پانی کر لیجئے آپ کو بھوک لگی ہوگی- پھر بتایئے گا کیا ماجرا ہے- آیئے اُٹھیئے-"

وہ تینوں چائے کی دوکان پر گئے وہاں پیٹ بھر کر پوریاں ترکاری جلیبیاں وغیرہ کھائیں- ملائی دار چائے پی کر جب میر صاحب کے حواس درست ہوئے تو انھوں نے کرامت کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بڑی محبت سے کہا

"تم نے ابھی تھوڑی دیر پہلے کہا تھا کہ تم میرے ہمدرد ہو- میری مدد کرنا چاہتے ہو"

"ہاں ہاں میر صاحب کہا نہیں تھا کروں گا بھی" وہ بولا

"مجھے دھوکہ تو نہ دو گے؟"

"میر صاحب" کرامت نے اُن کے پیروں کو چھوا "یہ آپ کے گھر کا پالک ذات ہی کا فقیر ہے- دل کا نہیں- آپ نے اب تک مجھے نہ آزمایا ہو تو اب آزما لیجئے اپنی جان آپ کے قدموں پر نچھاور نہ کر دیا تو درویش کا بچّہ نہ سمجھئے گا-"

میر صاحب نے بڑی رازداری کے ساتھ بتایا کہ وہ بھدری سے بس کے ذریعہ واپس آ رہے تھے تو راستے میں ایک برقع پوش عورت نے اُنھیں پان کے اندر کوئی نشہ والی چیز کھلا دی اور اُن کا ایک بریف کیس چُرا کر راستے میں کسی جگہ اُتر گئی- پھر اُنھوں نے ایک سیاہ رنگ کا بریف کیس اپنے کمبل سے نکال کر دکھایا "اور وہ منحوس عورت اپنا یہ بیگ میرے لئے چھوڑ گئی ہے- دیکھو"

"کیا آپ والا بھی اسی طرح کا تھا؟" کرامت نے پوچھا

"کیا بتاؤں- ہاں ایسا ہی تھا- بالکل اسی رنگ و جسامت کا" وہ بولے

"میر صاحب" کرامت بولا "ہو سکتا ہے وہ غلطی سے اُسے اپنا سمجھ کر لے گئی ہو"

"بھاڑ میں گئی- میں اُس حرامزادی کو اب ڈھونڈھوں کیسے؟"

"اِسے کھول کر دیکھا؟- شاید اُس کے سامان سے کچھ اَتا پتہ چلے"

"یار میرے اتا پتہ چل بھی جائے تو بھی میرا سامان تو ملنے سے رہا" میر صاحب نے کہا

"کیوں کیوں- کیا بہت قیمتی سامان تھا؟"

میر صاحب نے پھر مغموم وملول ہو کر سر جھکایا "ہاں بہت قیمتی سامان تھا سمجھ لو جس کے ہاتھ لگا ہوگا وہ اب اُسے واپس کرنے سے رہا"

کرامت نے بڑی رازداری سے پوچھا "سونے کے بسکٹ تھے؟"

میر صاحب نے سر اُٹھا کر کرامت کی آنکھوں میں جھانکا پُرخلوص کی ہلکی جھلک پا کر بولے

"ہاں- سو بسکٹ تھے"

"تب تو آپ پولیس میں رَپٹ بھی نہیں لکھا سکتے پولیس پوچھے گی نا کہاں سے پایا" کرامت بولا

"یہی تو پریشانی ہے" وہ بولے

کرامت نے میر صاحب کے ہاتھ سے وہ بریف کیس لے کر کھولا تو اس میں کچھ کپڑے، چوڑیاں، سنگھار کے لوازمات، ایک بٹوے میں کچھ ریزگاریاں، دفتی کے ایک ڈبے میں چند پوریاں اور انڈوں کا آملیٹ اور لکڑی کے ایک چھوٹے پیک میں لکھنوی قوام کی چھوٹی چھوٹی آٹھ دس شیشیاں رکھی تھیں- ان کے علاوہ اور بھی کچھ فضول چیزیں رکھی تھیں جنھیں کرامت ٹھیک سے نہیں دیکھ سکا

میر صاحب بولے "دیکھ لیا؟- بس اب بند کر وان چیزوں سے کوئی پتہ نہیں چلے گا"

کرامت نے کوئی جواب نہیں دیا مگر تھوڑی ہی دیر میں اس نے یہ دیکھ لیا تھا کہ دفتی کے جس ڈبّے میں ناشتہ رکھا تھا وہ ایک کلو مٹھائی کا ڈبّہ تھا اور اس کے ڈھکن پر ایک فینسی لیبل لگا تھا جس پر "لیلیٰ سوئیٹ ہاؤس اُنّاؤ" کا پتہ چھپا تھا اور قوام کی شیشیوں والا پیکٹ لیلیٰ سوئیٹ ہاؤس، کھڑکی، انّاؤ کے پتہ پر بذریعہ ڈاک بھیجا گیا تھا

"ایک بات اور بتا دیجئے میر صاحب" کرامت نے کہا "جو عورت آپ کا ہینڈ بیگ لے گئی ہے اس کا حُلیہ کیا تھا"

"اس چڑیل کا حُلیہ!" میر صاحب نے ناپسندیدہ نظروں سے کرامت کی طرف دیکھا "تو اس کا حلیہ معلوم کر کے تم جاسوسی کرو گے؟ کرو کرو- وہ حرامزادی چورنی تیس بتیس سال کی سانولی چکنی چپڑی چھوٹے قد اور گداز بدن والی تھی اونچاہار میں بس پر سوار ہوئی تھی اور رائے بریلی سے چلتے وقت تک میرے بغل والی سیٹ پر بیٹھی تھی- پھر آگے مجھے نہیں معلوم-"

یہ کہہ کر میر صاحب یکبارگی اُٹھے اور بریف کیس کرامت کے پاس ہی چھوڑ کر بس اسٹیشن کی طرف چل دیئے کیونکہ اُنھیں مدنی پور کی بس پکڑنا تھی-

کرامت بڑی سنجیدگی سے اس بات پر غور کر رہا تھا کہ رائے بریلی تک تو میر صاحب اپنے ہوش وحواس میں تھے- کان پور سے پہلے بیچ میں انّاؤ آتا ہے- جس مٹھائی کے ڈبّے میں انڈا پوری کا ناشتہ تھا وہ انّاؤ کے دوکان "لیلیٰ سوئیٹ ہاؤس" کا تھا اور لکھنوی قوام کی شیشیاں بھی انّاؤ کے اُسی مٹھائی والے کے پتہ پر بھیجی گئی تھیں- ان باتوں سے اس نے یہ نتیجہ نکالا کہ اگر اِس عورت کو لیلیٰ سوئیٹ ہاؤس

سے متعلق مان لیا جائے تو ضرور وہ عورت انّاؤ کی کوئی حلوائین ہوگی اور ایسی ہی ایک سانولی سلونی چھوٹے قد والی گداز بدن کی ایک حلوائین کو وہ پرشدے پور کے میلے میں کئی سال سے برابر دیکھ رہا تھا۔ یہ سوچ کر کرامت علی روشن کے ساتھ اناؤ جانے والی بس میں بیٹھ گیا۔

اُنّاؤ میں اُسے لیلیٰ سوئٹ ہاؤس تلاش کرنے میں کوئی دقّت نہیں ہوئی۔ یہ مٹھائی کی دوکان لیلیٰ نام کی ایک حلوائین کے نام سے مشہور تھی جس نے تین سال پہلے اپنے شوہر کے مرنے کے بعد ایک نوجوان نائی سلامت سے دل لگا کر اُسے اپنے گھر بٹھا لیا تھا۔ بے چارا سلامت دن بھر اپنی لیلیٰ کی دوکان کی بھٹّی سلگاتا تھا اور رات میں اُس کے کلیجے کی بھٹّی کو ٹھنڈا کرتا تھا پھر وہ بھی اپنے محبوب سے برابر چوکنّا رہتی تھی کہ کہیں وہ لونڈا اُسے چھوڑ کر کسی اور سے پینگ نہ بڑھالے اور خود اپنی دوکان پر بن ٹھن کر اور بال و پر کو خوب نکھار کے بیٹھتی تھی۔ لکھنؤ کے کسی حکیم صاحب سے کوئی کراماتی معجون لے آئی تھی جنھیں عیش کوشی کی غرض سے وقتاً فوقتاً خود بھی کھاتی تھی اور سلامت کو بھی کھلاتی تھی پھر دونوں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے تھے شاید ایسا ہی کوئی معجون اُس نے میر صاحب کو قوام کے ساتھ کھلا دیا تھا تو وہ بس پر بیٹھے بیٹھے بے سُدھ ہو گئے۔ اس روز لیلیٰ اپنی نند کے یہاں کسی گھریلو تقریب میں او نچا ہار گئی تھی واپسی پر میر صاحب کا بریف کیس لے کر اُنّاؤ میں اُتر گئی اور گھر پہونچی تو وہاں ایک نیا ہنگامہ برپا تھا۔ اس کا محبوب سلامت گھی کا کھولتا ہوا کڑاہ بھٹّی پر سے اُتار رہا تھا کہ وزن پا کر مٹّی کی بھٹّی نیچے سے بھسک گئی اور سلامت اپنا اور کڑاہ کا بیلنس اچانک نہ سنبھال سکنے پر لڑکھڑا کر کڑاہ کے اوپر گر پڑا۔ سینہ دونوں ہاتھ اور چہرہ کھولتے گھی سے بری طرح جھلس گئے تھے۔ لوگ بے ہوشی کی حالت میں اُسے لے کر اسپتال بھاگے۔ لیلیٰ آئی تو یہ ماجرا سن کر بے تابانہ اسپتال بھاگی۔ میر صاحب کا بریف کیس کھول کر دیکھنے کا اُسے موقع ہی نہ ملا۔ تخت پر پھینک کر اُلٹے پیروں اسپتال بھاگی جہاں ایک رات اور آدھا دن دوڑ دھوپ اور سلامت کی خیر سگالی کے لئے دعا مانگتے رہنے کے بعد لیلیٰ تھوڑی دیر کے لئے اپنے گھر آئی تا کہ سامان اور روپے پیسے لے سکے۔ اس کے گھر آنے سے کچھ دیر پہلے کرامت علی پوچھتا پاچھتا اس کے گھر آ چکا تھا جہاں لیلیٰ کی ماں اُداس اور متفکر بیٹھی تھی۔ کرامت علی نے اس سے لیلیٰ کے بارے میں پوچھا تو عورت نے اُسے اپنا ہمدرد جان کر سارا قصّہ جلدی جلدی بیان کر دیا۔

''ہائے ہائے بے چارا'' کرامت نے اظہار تاسّف کیا ''اللہ اس کو جلدی سے اچھا کرے بڑی لمبی عمر ہو اس کی۔ بہن ہم فقیر درویش جس کے حق میں اللہ پاک کی درگاہ سے فضل و کرم کی بھیک مانگتے ہیں تو اپنے پیارے حبیب کے صدقے میں اوپر والا سُن بھی لیتا ہے۔ تم غم نہ کرو بہن تمہارا داماد ضرور اچھا ہو جائے گا۔''

''مولا تمہاری زبان میں اثر دے بھیّا'' کرامت کے ایک ہی جملے سے وہ عورت متاثر ہو گئی

تھی اُسے چارپائی پر بٹھا کر خود زمین پر بیٹھ گئی

''بھائی آپ کہاں سے آ رہے ہیں- نام کیا ہے؟'' عورت نے پوچھا

''بندے کو شاہ کرامت علی کہتے ہیں- رائے بریلی ضلع میں جائس نام کا ایک قصبہ ہے فقیر وہیں کا رہنے والا ایک پیر درویش ہے۔''

''تکیہ دار ہو؟'' عورت نے دھیرے سے پوچھا

''ہوں'' وہ بولا

عورت نے تعظیماً اس کے دونوں گھٹنوں کو ہاتھ لگایا'' پاک بزرگ آدمی ہیں آپ- بتایئے میں آپ کی کیا خاطر خدمت کروں- میرا مائیکہ بھی جائس میں ہے۔''

کرامت علی نے بوڑھی حلوائین کا مائیکہ جائس میں ہونے کی بات پر زیادہ دھیان نہیں دیا صرف ''ہوں'' کہہ کر چپ ہو گیا۔

بوڑھی عورت اُٹھ کر کوٹھری میں گئی اور وہاں سے ایک تھال میں بالوشاہیاں اور پیڑے وغیرہ لے کر آ گئی اور کرامت کے آگے رکھ کر بولی

''کھایئے۔ بٹیا کو بھی دیجئے میں پانی لے کر آتی ہوں۔''

دو گلاس میں پانی لانے کے بعد اُس نے پوچھا ''ہمارے یہاں کیسے آنا ہوا شاہ جی''

کرامت نے ایک پیڑا روشن کو دیا اور ایک اپنے منھ میں ڈالا

''آپ کا میکہ جائس میں ہے تو آپ سیّدوں کے محلّہ میں بڑی حویلی والے میر فدا حسین کو جانتی ہوں گی''

''ہاں ہاں جانتی ہوں- میرا مطلب ہے ان کا نام سنا ہے میں نے''

''مجلسوں میں بانٹنے کے لئے تبرک آپ ہی کے یہاں سے جاتا ہوگا'' کرامت نے کہا

اس سوال پر عورت چند لمحوں کے لئے خاموش ہوئی پھر بولی

''میں حلوائیوں کے گھرانے کی نہیں ہوں'' پھر کچھ توقف کے بعد بولی ''اصل میں ہم بھی درویشوں کی برادری والے ہیں۔''

کرامت نے پانی کا گلاس منھ سے ہٹا کر عورت کی طرف دیکھا عورت کہہ رہی تھی وہاں میرے ایک بھائی ہیں- پیر بخش نام ہے ان کا۔''

کرامت کے حلق میں پانی کا گھونٹ اُچّھو ہو گیا

''آپ جانتے ہیں اُن کو؟'' عورت نے پوچھا

''اُو ہنک!'' غیر ارادی طور پر اس کے منھ سے نکل گیا

''میرے باپ کا نام عبداللہ تھا۔ میں بہت چھوٹی تھی تب ہی ماں مر گئی اور نانی مجھے اپنے ساتھ لے آئی۔ میں نے تو اپنے باپ اور بھائی کو دیکھا بھی نہیں صرف نام ہی سنا ہے''

جتنی دیر وہ بولتی رہی کرامت اسی کی طرف دیکھتا رہا پھر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ سر جھکائے بیٹھا رہا

''آپ رو رہے ہیں؟'' عورت نے پوچھا

''کتنی دکھی ہیں آپ'' وہ اتنا ہی بول سکا

اتنے میں لیلیٰ آ گئی اُس نے ماں کو ایک اجنبی کے ساتھ باتیں کرتا دیکھ کر پوچھا

''امّاں۔ کون ہیں یہ؟'' کرامت نے دیکھا اُس کا حلیہ وہی تھا جو میر صاحب نے بتایا تھا۔

''بیٹی یہ جائس کے شاہ کرامت علی درویش ہیں۔ میں اِن سے سلامت کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ اس کے لئے دعا کرا رہی تھی''

''بتایئے بتایئے شاہ جی۔ وہ اچھے ہو جائیں گے نا؟'' لیلیٰ نے پوچھا

''یہ تو میں بعد میں بتاؤں گا'' کرامت نے وثوق بھرے لہجے میں کہا ''پہلے تم یہ بتاؤ کہ کیا تم بس کے سفر میں کسی دوسرے آدمی کا بیگ بھولے سے اپنا جان کر اپنے ساتھ لے آئی ہو؟''

''میں۔ نن۔ نہیں تو۔'' لیلیٰ گھبرا کر جلدی سے بولی

''پیر فقیر مرشدوں سے جھوٹ نہیں بولنا چاہئے'' کرامت نے بڑی بڑی آنکھیں نکالیں

''پھر سے سوچ کر بتاؤ'' کرامت کے لہجے کی تُرشی سے لیلیٰ ڈر گئی

''ہو سکتا ہے۔ بیگ تو وہ تخت پر ویسے کا ویسا ہی پڑا ہے۔ میں نے کھول کر بھی نہیں دیکھا کہ اس میں کیا ہے۔ لیکن کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ وہ بیگ کس آدمی کا ہے اور اس کے اندر کیا ہے؟'' لیلیٰ نے کہا اور اُٹھ کر بیگ لانے چلی گئی

''ضرور تم بیگ کو کھولنا نہیں'' کرامت بولا ''میں ابھی تیری تسلّی اور اطمینان کئے دیتا ہوں۔ سنو۔ یہ بیگ اُس آدمی کا ہے جس نے اپنے سر کے بالوں کو مہندی سے لال کر رکھا ہے۔ وہ ایک بوڑھا رئیس ہے جسے تم نے پان میں قوام کھلایا تھا''

کرامت نے قوام کی بھری شیشی لیلیٰ کو دکھائی۔ شیشی دیکھ کر وہ دم بخود رہ گئی۔

''یہ شیشی۔ یہ آپ نے کہاں سے پائی؟''

''ایسی ہی آٹھ شیشیاں میرے پاس ہیں۔ تو کیا اب بھی تم انکار کرو گی کہ بیگ نہیں بدلے''

لیلیٰ نے میر صاحب کا بیگ کرامت کی طرف بڑھایا ''نہیں نہیں۔ ضرور بدل گئے ہوں گے۔ میں انکار نہیں کرتی مگر۔ میرا بیگ کہاں ہے؟''

''یہ ہے تمہارا بیگ'' کرامت نے چادر میں چھپائے لیلیٰ کا بیگ نکالا۔

''اور اپنا سارا سامان دیکھ لو۔ ایک ایک چیز ویسی ہی رکھی ہے''

اس کے بعد کرامت علی لیلیٰ کی ماں سے مخاطب ہو کر بولا ''تو بہن جی میں نے جائس کے میر فدا حسین کے بارے میں ابھی آپ سے پوچھا تھا نا۔ یہ بیگ اُنھیں کا ہے۔ اسے میں نے کھول کر نہیں دیکھا مگر جانتا ہوں کہ اس کے اندر کیا ہے۔ میں ہی نہیں بلکہ یہ بچّی بھی بتا سکتی ہے کہ اس میں کیا ہے۔''

ماں بیٹی دونوں کافی مرعوب ہوئیں۔ ماں دونوں ہاتھ جوڑ کر تعظیماً بیٹھی رہی ''اور بہن۔ آپ کا بھائی جس کا نام آپ نے پیر بخش بتایا ہے وہ بہت ہی بے غیرت اور بے مروّت انسان معلوم ہوتا ہے کہ چالیس پینتالیس سال ہو گئے مگر اب تک آپ سے ملنے نہیں آیا۔ کیا اُسے آپ کے بارے میں کچھ نہیں معلوم؟''

''پتہ نہیں'' وہ دھیرے سے بولی ''نہ معلوم ہو گا''

''پتہ نہیں'' کرامت نے دُہرایا ''تو قصوروار آپ ہوئیں نا کہ پتہ ہوتے ہوئے بھی آپ کا دل اُسے دیکھنے کو اب تک نہیں پسیجا۔ سنتے ہیں بہن بھائی سے زیادہ محبت کرتی ہے۔ تو بتایئے یہ کیسی محبت ہے۔ مجھ سے پوچھ کر کیا ملے گا آپ کو پیر بخش تو دیکھنے کو نہ ملیں گے''

عورت رونے لگی ''ٹھیک کہتے ہیں آپ''

کرامت نے دھیرے سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا ''فخرن!'' اور رونے لگا۔

عورت نے چونک کر کرامت کی طرف دیکھا جس کی آنکھیں بھیگی تھیں۔ وہ خاموش تھا مگر اس کے کانپتے ہوئے ہاتھ پیار سے اُس کے سر پر پھر رہے تھے۔ وہ تعجب سے دیکھتی رہی۔

''ہاں فخرُن۔ میں ہی ہوں تیرا گنہگار اور بے مروّت بڑا بھائی پیر بخش۔ میرے ہی باپ کا نام عبداللہ تھا۔ مجھے بچپن میں یہی بتایا گیا تھا کہ ماں کے مرنے کے بعد نانی میری تین سال کی بہن کو اپنے ساتھ لے کر پتہ نہیں کہاں اور کیوں غائب ہو گئی شاید اس خیال سے کہ باپ دوسری شادی کر لے گا اور سوتیلی ماں بچّی پر ظلم ڈھائے گی۔ آج قسمت نے ہم دونوں کو ملایا ہے۔ شکر ہے اوپر والے کا''

بے اختیار فخرن بھائی سے لپٹ کر دیر تک روئی روشن سہمی ہوئی چپ چاپ بیٹھی رہی اور لیلیٰ حیرت بھری نظروں سے دونوں کو دیکھتی رہی۔

''بس اب زیادہ مت رو فخرن'' کرامت نے تسلّی دی ''یہ بتاؤ تمہارے بچّے کتنے ہیں۔''

''ایک تو یہ ہے۔ لیلیٰ'' وہ بولی ''یہ بڑی بیٹی ہے اس سے چھوٹی شہزادی بنارس میں بیاہی تھی اس کا میاں بمبئی میں ٹیکسی چلاتا تھا۔ چھ مہینے ہوئے کسی دشمن نے مار ڈالا اُسے۔ بعد میں پتہ چلا کہ شہزادی اپنی پانچ چھ سال کی بچّی کو لے کر کہیں چلی گئی۔ تین مہینے سے اس کا کوئی پتہ نہیں۔ بس یہی دو لڑکیاں

ہیں۔اور بھیّا تمہارے بال بچے؟''

''کوئی نام لیوانہیں-اکیلا ہوں-نہ کوئی آگے نہ پیچھے۔''

''یہ بچّی؟''فخرن نے روشن کی طرف اشارہ کیا

''یہ تمہاری نواسی ہے فخرن-اور میرے پاس امانت ہے شہزادی کی جواب اس دنیا میں نہیں رہی-بے چاری ریل کے حادثہ میں ماری گئی۔''

فخرن اور لیلیٰ دونوں روشن کو لپٹا کر دیر تک روتی رہیں۔

★★★

مدنی پور میں بہت سی مصیبتیں میر صاحب کے انتظار میں چکر لگا رہی تھیں اس لئے جب وہ بھدری سے لوٹ کر اپنے گاؤں پہونچے تو بس اڈّہ سے گھر تک ان کے کانوں میں یہی آواز آتی رہی ''میر صاحب آ گئے-میر صاحب آ گئے''

''میاں آپ کہاں گئے تھے؟''قدیر نے بڑی راز داری سے پوچھا

میر صاحب اپنے دکھوں میں ابھی تک مبتلا تھے-کوئی جواب نہیں دیا۔

''آپ کی طبعیت تو ٹھیک ہے؟''زرّیں نے پوچھا''کیا ہوا ہے؟''

''کچھ نہیں-ٹھیک ہوں''وہ بولے''میرے لئے ایک پیالی چائے بنادو''

داروغہ شیر علی کے مخبروں نے اُنھیں خبر پہونچا دی تھی کہ میر صاحب گاؤں میں وارد ہو گئے ہیں اس لئے ذرا ہی دیر میں وہ اپنی پوری فورس کے ساتھ میر فدا حسین کے دروازے پر آ دھمکے۔قدیر نے ان کے آنے کی اطلاع دی تو میر صاحب نے اُن کو گھر کے اندر بلا لیا

''آیئے داروغہ جی-تشریف لایئے''وقدرے مسکرا کر بولے

''آپ میرے ساتھ آیئے''شیر علی اخلاقاً بھی نہیں مسکرائے''تنہائی میں باتیں کرنی ہیں''

میر صاحب فوراً اُٹھے اور شیر علی کو اپنے ساتھ لے کر کوٹھے پر چلے گئے

''کل رات گاؤں میں عزیز بیگ کا قتل ہو گیا ہے-آپ نے بھی سنا ہو گا''

''عزیز بیگ کا قتل؟''میر صاحب نے بڑی حیرت سے پوچھا''نہیں نہیں مجھے نہیں معلوم ہوا۔بالکل نہیں معلوم ہوا۔میں تو ابھی ابھی باہر سے واپس آیا ہوں-کب ہوا قتل-کس وقت ہوا؟''

''بتاتا ہوں-بتاتا ہوں''شیر علی بولے''مگر بتانے سے پہلے آپ سے دو باتیں پوچھوں گا اگر جواب اطمینان بخش رہا تو کوئی بات نہیں ورنہ میں تو ضابطہ کی کارروائی کروں گا''

''جناب آپ کچھ بتائیں تو سہی''میر صاحب بولے''آپ کی باتوں سے تو لگتا ہے جیسے میں نے ہی قتل کیا ہے''

''ہو سکتا ہے''شری علی نے کہا''مگر اس بارے میں پھر باتیں کروں گا پہلے میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر میں زرّیں سے عقد کرنا چاہوں تو آپ کو کوئی اعتراض ہو گا؟''

میر صاحب کے منھ میں دبے ہوئے پان کا مزہ خراب ہو گیا وہ ایک کونے میں تھوک کر بولے''سنئے-اب آپ زیادتی پر اُتر آئے ہیں جناب''میر صاحب نے کہا''میں نے ایک بار آپ کی خواہش پوری کر دی۔آپ کا دل رکھ لیا اس سے ملنے اور باتیں کرنے کا موقع فراہم کر دیا تو آپ کے حوصلے اس حد تک بڑھ گئے۔چہ خوش''

''یہ حوصلہ مکروہ ہے کیا؟''شیر علی نے کہا''جناب والا میں نے نکاح کی بات کہی ہے جو سنّت ہے اور شکر ہے کہ مجھ میں یہ حوصلہ پیدا ہوا لیکن اگر آپ اسے پسند نہیں کرتے تو جانے دیجئے۔میں کوئی زور زبردستی نہیں کروں گا آپ شوق سے اس رکھیل کو رکھ کر چومتے چاٹتے رہئے''مگر اس کے آگے کی بات بھی سن لیجئے۔میں آپ کو عزیز بیگ کے قتل کے الزام میں ابھی اور اسی وقت ہتھکڑیاں لگا سکتا ہوں''

''ارے ارے!!-کمال ہے بھائی''میر صاحب کا پارہ چڑھ گیا''یہ کیسی بے سر و پا باتیں کر رہے ہیں آپ۔میں تو کل صبح سے گاؤں میں تھا بھی نہیں ابھی ابھی ایک گھنٹہ ہوئے آیا ہوں اور تب سے آپ کی خرافات سن رہا ہوں-اخر بات کیا ہے-کس بات کی دشمنی نکال رہے ہیں آپ۔''

''کیا یہ غلط ہے کہ اس سے پہلے ایک بار آپ نے عزیز بیگ پر پستول سے فائر کیا تھا؟''

''جی-بالکل غلط بات ہے-آپ کی من گڑھنت ہے''

''من گڑھنت ہے''شیر علی بولے''اچھا-ابھی قدیر کو بلا کر پوچھتا ہوں تب تو مانئے گا''

''کیا وہ ایسا کہتا ہے؟''میر صاحب نے سوال کیا

''جی ہاں-کہتا ہے-کہہ چکا ہے-آگے بھی کہے گا''شیر علی نے ایک ایک لفظ پر زور دیا۔

یہ کہہ کر شیر علی نے قدیر کو آواز دے کر کوٹھے پر بلایا اور جب وہ آیا تو اس سے پوچھا

''اس رات عزیز بیگ پر گولی کس نے چلائی تھی؟''

''گولی؟''

''ہاں ہاں-گولی-پستول کی''شیر علی نے زور دے کر کہا

''آپ نے چلائی تھی''قدیر نے داروغہ ہی کی طرف انگلی اٹھا دی

''ابے دغا باز-جھوٹے-کمینے''شیر علی اپنا ہنٹر تان کر اس کی طرف لپکے

''بس کیجئے جناب''میر صاحب نے ڈانٹا''میں دیکھ رہا ہوں کہ بہت دنوں سے اپ لڑ کے

کے پیچھے پڑے ہیں اور بلا سبب اس کو ڈروایا دھمکایا کرتے ہیں۔ سارے قانون آپ ہی کی خوشنودیٔ طبع کے لئے تو نہیں بنائے گئے ہیں۔ بے قصور لوگوں پر زور زبردستی اور سختیاں کرنے کا زمانہ اب نہیں رہا داروغہ صاحب۔ بس چلئے - نکلئے میرے گھر سے چلئے چلئے اور جو آپ کا دل چاہے وہ کیجئے۔"

"جاتا ہوں" شیر علی گرجے "مگر اس سینہ زوری پر میں نے آپ دونوں کو تحت الثریٰ نہ پہونچا دیا تو مجھے شیر علی نہ کہنا۔"

شیر علی غصّہ میں لال پیلے پیر پٹکتے وہاں سے چلے گئے تو میر صاحب کو یہ تشویش ہوئی کہ شیر علی مفت میں اُنھیں پھنسا دے گا اس لئے اُنھیں بھی اپنے دفاع میں کچھ کرنا چاہئیے۔ وہ مسہری پر لیٹ کر سوچنے لگے۔ قدیر نے دھیرے سے پوچھا

"میاں - ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھو" وہ جلدی سے بولے

"سچ بتایئے عزیز بیگ کو کس نے قتل کیا ہے"

میر صاحب کے تن بدن میں آگ لگ گئی دانت پیستے ہوئے اُٹھ کر بیٹھ گئے

"بتاؤں؟" وہ آنکھیں لال کر کے بولے "حرام خور - نالائق - ابے واردات کرنے کے بعد اُلٹا مجھ سے سوال کر رہا ہے کہ کس نے قتل کیا - کم بخت تیرے سوا عزیز بیگ کا دشمن اور کون ہوگا اس گاؤں میں۔"

"دیکھئے دیکھئے میاں" اس نے احتجاج کیا "یہ تو الٹا چور کوتوال کو ڈانٹنے والی بات ہوئی"

"کوتوال کے بچّے" اُنھوں نے اپنا جوتا اُٹھایا "مجھ پر شک کرنے چلا ہے۔ ابے میں تو کل دن سے یہاں نہیں تھا ابھی ابھی تو گاؤں کے اندر قدم رکھا ہے۔"

"تو آپ مجھ پر شک کیوں کرتے ہیں۔ جس کی قسم کہئے کھالوں کہ میں نے نہیں مارا"

میر صاحب چند لمحے قدیر کے چہرے پر اُس کے قلبی تاثرات پڑھتے رہے پھر کچھ سوچ کر بولے

"خیر تم نے مارا ہو یا نہیں - یہ وقت ان باتوں کا نہیں۔ داروغہ کو ہم دونوں پر شک ہے اور وہ ہمیں پھنسانے کی پوری کوشش بھی کرے گا اس لئے ہمیں بھی اپنے بچاؤ کی فکر کرنی چاہئیے اس وقت ایک دوسرے سے جھگڑنے سے کوئی فائدہ نہیں"

"لیکن میاں جھگڑے کی بات تو آپ ہی نے کی ہے" قدیر نے کہا

"میں نے کیا کیا ہے؟"

"آپ بھدری گئے تھے نا - سونے کے بسکٹ لانے" قدیر بولا

"تو پھر؟"

"تو پھر لایئے مجھے دیجئے - اس پر میرا حق ہے۔" قدیر نے کہا

"حق کے بچّے" وہ غصہ میں بولے مگر پھر غم و غصہ میں ڈوب گئے "قدیر بیٹے! اب سونے کی بات بھول جا - میں کیا اپنے لئے گیا تھا۔ تمہیں لوگوں کے لئے بھدری گیا تھا۔ مگر سونا میرے ہاتھ میں آ کر نکل گیا - راستے میں ایک چڑیل عورت مجھے پان میں کوئی چیز کھلا کر بے ہوش کر گئی اور وہ سارے بسکٹ چُرا لے گئی - پتہ نہیں وہ کون تھی - کہاں کی رہنے والی تھی - کہاں گئی، پچّھل پائی"

"واہ میاں - میرے منھ کا نوالہ چھین کر آپ نے کتّے کے آگے ڈال دیا پھر بھی میں کچھ نہ کہوں - کچھ نہ بولوں - بتایئے یہ جھگڑے والی بات ہے کہ نہیں۔"

"یہ بات اس وقت نہ اُٹھاؤ" میر صاحب نے سمجھایا "پہلے شیر علی کی دھمکی پر سوچ بچار کرو - وہ ہم لوگوں کے خلاف گواہیاں بٹور رہا ہوگا۔ ہم گرفتار ہو جائیں گے"

قدیر غصّہ میں بڑبڑاتا ہوا باہر چلا گیا - میر صاحب مسہری سے اُٹھ کر زرّیں کے کمرہ میں آئے۔ وہ نہا دھو کر نکلی تھی اور چاکلیٹی رنگ کا شلوار سوٹ پہنے کچن میں کچھ پکانے میں مصروف تھی اس کے سیاہ لمبے بال جو سر پر گھونگریلے تھے اس کی پیٹھ اور شانے پر بکھرے تھے۔ میر صاحب اس کے گداز بانہوں پر آستین کی تنگی اور اس سے جھانکتے ہوئے گورے گورے بازؤں کو آنگن میں کھڑے کچھ دیر دیکھتے رہے پھر دھیرے دھیرے کچن پہونچ کر عادتاً کھنکھارے

زرّیں نے پلٹ کر اُن کی طرف دیکھا پھر مسکرا کر بولی "کافی بنا رہی ہوں آپ کے لئے"

"تم میرا کتنا خیال رکھتی ہو" میر صاحب نے آج بہت دنوں بعد اُسے لپٹا لیا۔ زرّیں نے اس التفات کو پوری طرح منظوری دی تو میر صاحب نے اس کی ٹھڈی کو چُھوا

"ایک بات پوچھوں زرّو؟"

"پوچھئے"

"تم برا نہ تو مانوں گی؟" میر صاحب نے پیار سے پوچھا

"کیوں برا مانوں گی - آپ پوچھئے"

"داروغہ شیر علی تم کو مجھ سے چھین لینا چاہتے ہیں" میر صاحب نے کہا

زرّیں ہنس کر بولی "اچھا - مگر نہ تو آپ بچّے ہیں اور نہ میں کوئی کھلونا"

"وہ تمہارے ساتھ عقد کرنا چاہتے ہیں" اُنھوں نے سمجھایا

زرّیں نے اس بات کو سُن کر نہ تو کسی حیرت کا اظہار کیا اور نہ فوراً ہی کوئی جواب دیا صرف خاموش سر جھکائے کھڑی رہی جیسے کچھ سوچ رہی ہو۔

"تم کچھ بولیں نہیں" میر صاحب نے کہا

"کیا بولوں" زرّیں نے جواب دیا "میں کہہ بھی کیا سکتی ہوں- آپ ہی بتائیے- جس عورت نے ساری جوانی آپ کی رفاقت میں کاٹ دی ہو وہ اب کیا کہہ سکتی ہے- کہاں جا سکتی ہے"

"تم ٹھیک کہتی ہو زرّو" میر صاحب بولے "میں نے تو ویسے ہی پوچھا تھا مجھے تو پہلے ہی سے یقین تھا کہ میری زرّو ہمیشہ میری رہے گی-"

اپنی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو آستین میں پونچھ کر زرّیں نے کہا

"وہ مجھ سے بھی یہی بات کہہ گیا ہے بلکہ دھمکی دے گیا ہے اگر میں نے اس کی بات نہ مانی تو وہ آپ کو اور قدیر کو قتل کے الزام میں پھنسا کر جیل بھجوا دے گا-"

"اسی لئے تو میں اس مسئلہ پر تم سے باتیں کرنا چاہتا ہوں" میر صاحب نے معاملہ کی گہرائی کو ذہن نشین کرانا چاہا "دیکھو- ایک تو پولیس کا آدمی اس پر سے وہ خود بھی کوئی اچھا آدمی نہیں ہے اس لئے اس کی حرکتوں کے ساتھ ساتھ اس کی باتوں سے بھی چوکنا رہنے کی ضرورت ہے وہ کبھی بھی ہم لوگوں کو پھنسا سکتا ہے-"

"مگر وہ اللہ سے بڑھ کر تو نہیں- جب آپ لوگ بے قصور ہیں تو وہ کیا کرے گا- دنیا میں ایسا اندھیر ہے کیا- کیا داروغہ کے اوپر کوئی اور نہیں- میں کہتی ہوں اللہ تو ہے"

"اللہ تو بے شک ہے" وہ بولے "مگر اللہ ہی تو حرامزادے کی رسّی بھی دراز کرتا ہے اور ویسے بھی سیدھا آدمی ہی دھوکہ کھاتا ہے اور جیت چلتے پرزوں کی ہوتی ہے- لوہا لوہا ہی سے کٹتا ہے- اینٹوں کا جواب پتّھر سے دیا جاتا ہے پھولوں سے نہیں- اس لئے پیاری زرّو بیگم ہمیں بھی سیدھی پٹری کے بجائے ٹیڑھی چال چلنی ہوگی- کیا سمجھیں؟"

"میں کچھ نہیں سمجھی- صاف صاف بتائیے کیا کہنا چاہتے ہیں"

"دیکھو- اس وقت دانشمندی کا یہی تقاضہ ہے کہ شیر علی کی بات مان لی جائے"

"کیا!" زرّیں ایکدم چونک پڑی

"دیکھو تم اپنے دل میں کوئی اور خیال مت لانا" میر صاحب سمجھانے لگے "اس وقت موقع کی نزاکت اور مصلحت کا یہی تقاضہ ہے کہ شیر علی کی بات مان لی جائے"

"بیس سال سے میں نے تو ایسی موقع پرستی اور مصلحت بینی سے کام نہیں لیا آپ مرد ہیں جو چاہے کیجئے- آپ کو کون کچھ کہہ سکتا ہے-" زرّیں نے برا مانا

"دیکھو ناراض مت ہو- تمہارا بیٹا قتل کے الزام ہیں مشتبہ ہے- داروغہ مجھ پر بھی شک کر رہا ہے تو اگر تھوڑی دیر کو اس کی بات مان لی جائے تو کیا حرج ہے"

"یعنی میں اس کی ہو جاؤں" زرّیں نے بھرائی آواز میں کہا "سیدھے سیدھے اس کے

ساتھ چلی جاؤں"

"تم گھبراتی کیوں ہو" وہ بولے "ایسا سبق دوں گا شیر علی کو کہ زندگی بھر یاد کریں گے" یہ کہہ کر میر صاحب نے پھر اسے لپٹا لیا

"مگر قدیر کیا کہے گا مجھے" زرّیں نے اندیشہ ظاہر کیا "بڑی بے شرمی کی بات ہے"

"میں سب سنبھال لوں گا" اُس کے گال پر ہلکا سا چپت لگا کر میر صاحب باہر چلے گئے-

شام تک میر صاحب قدیر کو تلاش کرتے رہے مگر وہ نہ جانے کہاں غائب تھا- رات میں گھر آیا تو میر صاحب نے اُسے دروازے ہی پر روک لیا

"کہاں گئے تھے؟" اُنھوں نے پوچھا

اس بات کا جواب دینے کے بجائے قدیر نے ایک نیا آئیڈیا پیش کیا

"میاں آپ کہتے تھے کہ اپنے بچاؤ میں ہمیں کچھ کرنا چاہیے تو میں نے ایک بہت اونچا پلان سوچا ہے یعنی سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے"

"میں بھی سنوں کیا ہے تمہارا پلان"

"میرا مطلب ہے میاں کہ اگر داروغہ کو ہم اپنی طرف ملا لیں تو کیسا رہے- دیکھئے ایسا کرنے میں آگے کوئی پریشانی ہی نہ ہوگی"

"مگر بیٹا" میر صاحب نے پان کی گیجھی منھ میں گھمائی "ایسا کرنے میں بھی پریشانی ہوگی"

"کیوں- کیوں- کیسے؟" قدیر نے جلدی سے پوچھا

"وہ ایسے- کہ شیر علی تیرا باپ بننا چاہتا ہے"

"ارے تو بنے" قدیر بولا "وقت پڑنے پر تو لوگ گدھے کو بھی باپ بنا لیتے ہیں-"

"اچھا؟- تو بنا لے اس کو اپنا باپ" میر صاحب نے تیکھا طنز کیا اور دانت پیس کر بولے

"چل دور ہو میری نظروں سے- نالائق کہیں کا"

"لیجئے- بھلا میری کیا غلطی ہے اس میں" قدیر بڑی معصومیت سے بولا "اب شادی ہو جانے پر رشتہ ہی ایسا ہو جاتا ہے تو میں کیا کروں"

"اچھا-" میر صاحب نے ہتھیار ڈال دیئے "چل تیرا ہی کہا کروں گا- تو راضی ہے تو مجھے کیا- میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے- مگر ایک شرط میری ماننی پڑے گی وہ یہ کہ جو جو میں کہوں وہ کرتے جاؤ"

"ہاں میاں- وہی وہی کروں گا" قدیر بولا

"تو پھر سنو" میر صاحب سمجھانے لگے "اس وقت میں تمہاری ماں سے بات چیت کر کے

آ رہا ہوں ان کا بھی یہی خیال ہے کہ داروغہ کی بات مان کر ان کو اپنی طرف ملا لینے میں ہی ہم لوگوں کا بھلا ہے- یعنی کہ شادی کر دی جائے"

"ارے واہ میاں- سچ مچ!" قدیر خوشی سے چہک اٹھا "جایئے جایئے جلدی پوچھئے"

"ابے ابے- اس بات سے تجھے اتنی خوشی کیوں ہو رہی ہے یہ میری سمجھ میں نہیں آیا یعنی کہ شادی شیر علی کی ہوگی اور ناچ تم رہے ہو-"

"کیا کیا کیا؟" قدیر گھبرا کر بولا "شادی کس کی ہو رہی ہے؟- کس کو کہہ رہے ہیں آپ؟"

"ہوں-" میر صاحب بولے "تو اب تیری سمجھ میں بات آئی- ابے الّو کی دم فاختہ- یہ مکر وفریب کا سارا جال شیر علی نے اپنی شادی کے لئے پھیلایا ہے- وہ تیری والدہ کے ساتھ عقد کرنا چاہتا ہے- میں نے کہا نہیں تھا کہ وہ تیرا باپ بننا چاہتا ہے"

"میاں میں تو اس کا مطلب کچھ اور سمجھا تھا" پھر مٹھی بھینچ کر غصّہ میں بولا "قسم سے کہتا ہوں میں اس شیر علی کی نانی کی دُم میں بھونسہ بھر دوں گا"

پھر وہ کچھ سوچ کر یک بیک خاموش ہو گیا- امّاں کے گلے میں چمپا کلی کا مطلب اب پوری طرح اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ شیر علی نے امّاں کو دیا اور ماں نے قبول کر لیا وہ افسردہ ہو گیا- جب ماں کی یہ مرضی ہے تو وہ کیا کر سکتا ہے۔

"غصّہ سے نہیں عقل سے کام لو بیٹا" میر صاحب نے سمجھایا "دشمن چالاک اور طاقت ور ہو تو غصّہ سے نہیں پالیسی اور سمجھ داری سے کام لینا چاہیئے تھوڑا صبر وضبط سے کام لو اور جیسا میں کہوں اس پر عمل کرتے چلو"

"امّاں نے اس کی بات مان لی ہے؟" قدیر نے پوچھا

"اوپری دل سے تو تمہیں بھی ماننا پڑے گا- بیٹا دشمن کو گھات لگا کر غفلت میں مارنا چاہیئے بس اسی میں مزہ ہے- پھونک پھونک کر کھانے میں مزہ ملتا ہے"

"پتہ نہیں کیا مزہ ہے" قدیر نے کہا "خیر آپ بتایئے کیا کرنا ہے مجھے"

"دیکھو- سب سے پہلے تم شیر علی کے پاس جا کر اُسے یہ خوش خبری دو کہ ہم لوگوں نے اس کی تجویز مان لی ہے اور کل نکاح ہونا ہے- اس لئے وہ اس بارے میں مفصّل بات چیت کے لئے آج ہی کسی وقت مجھ سے مل لے"

"یعنی آپ سے- پھر کیا ہوگا؟" قدیر نے پوچھا

"پھر کپتان پولیس کانپور کے پاس تمہیں ایک درخواست لے کر جانا ہوگا"

"کیسی درخواست؟"

"اُفّوہ- پھر پوچھ لینا" میر صاحب نے کہا "پہلے تم وہ کام کرو جو پہلے کرنا ہے"

★★★

زرّیں اور میر صاحب سے گفتگو کے بعد شیر علی ان دونوں سے برگشتہ تو ہو ہی چکے تھے اس لئے اُنھوں نے ایک کام یہ کیا کہ میر صاحب کے پرانے حریف وپٹّی دار شیورتن سے مل کر اُسے اس بات پر اُکسایا کہ وہ میر صاحب کے اس پیڑ کو جو چک بندی کے بعد اُس کے کھیت میں آ گیا تھا جڑ سے کٹوا ڈالے اور کٹوانے کے بعد تھانہ میں میر صاحب کے خلاف یہ رپورٹ لکھوا دے کہ اُنھوں نے کھیت میں گھس کر اس پیڑ کو کٹوا ڈالا ہے۔ ساتھ ہی آس پاس کے گاؤں میں بھی فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا کر دی ہے۔ شیورتن اس بات پر رضا مند تو ہو گیا مگر اُسے تھوڑی ہچکچاہٹ ہو رہی تھی ڈرتے ڈرتے بولا

"ای سب تو ہم کر لیں گے دروگا جی پر گواہی کہاں سے ملی- میر صاحب کے خلاف گواہی بڑا مشکل کام ہے- کونو راجی نہ ہوئی"

"ارے تو کیسا آدمی ہے" شیر علی نے ڈانٹا "میرے رہتے ہوئے ایک نہیں دس بیس گواہیاں مل جائیں گی پہلے تو اپنے آدمیوں سے پیڑ تو کٹوا لے"

داروغہ جی کے جانے کے بعد شیورتن نے سوچا کہ پولیس کے جنجال میں پھنسنا ٹھیک نہیں ہے۔ ان لوگوں کا کیا بھروسہ نہ ان کی دوستی اچھی نہ دشمنی۔ رہ گیا میر صاحب کا معاملہ تو وہ چلتا ہی رہے گا۔ پٹّی داری میں یہ سب تو ہوتا ہی ہے۔

شام کو چار بجے کے قریب داروغہ شیر علی تھانہ میں شیورتن کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کے اندازے کے مطابق اس وقت تک شیورتن نے پیڑ کاٹ کوٹ ڈالا ہوگا۔ مگر عین انتظار کی گھڑیوں میں شیورتن کی جگہ اُنھیں قدیر کی صورت دکھائی دی۔ قدیر نے آتے ہی اُنھیں بڑے ادب سے جھک کر سلام کیا

"کیسے آئے؟" اُنھوں نے بڑی رعونت سے پوچھا

"آپ سے تنہائی میں کچھ پرائیوٹ باتیں کرنی ہیں" قدیر نے جواب دیا

"جو کچھ کہنا ہے وہ یہیں کہو اور زور سے کہو- قتل کا کیس ہے میں چوری چوری ڈھکے چھپے ملزموں سے بات نہیں کرنا چاہتا سمجھے؟"

"جی- وہ-" قدیر نے کچھ کہنا چاہا

"اور اگر کچھ لینے دینے کی بات منھ سے نکالی تو مارے ہنٹروں کے سالے چمڑی ادھیڑ دوں گا"

”مجھے میاں نے آپ کے پاس بھیجا ہے“

”کون میاں؟“

”میر صاحب۔میر فدا حسین“

”کیوں بھیجا ہے؟“

”وہ نکاح والی بات ہے“ قدیر بولا ”میر صاحب نے کہلایا ہے کہ ہم لوگ آپ کی بات پر راضی ہیں آپ آج ہی اُن سے مل کر بات چیت طے کرلیں۔نکاح کے لئے“

شیر علی کرسی چھوڑ کر اس طرح کھڑے ہوگئے جیسے اس میں اسپرنگ لگی ہوں ”اچھا۔اچھا۔آؤ“ کہہ کر وہ قدیر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے علیحدہ برامدے میں لے گئے ”یعنی کہ۔میرا مطلب ہے۔سب لوگ رضامند ہوگئے؟“

”جی ہاں“

”تمہاری والدہ؟“

”وہ بھی“ قدیر نے سر جھکا کر بڑی معصومیت سے کہا

”ارے تم بیٹھو۔تمہارے لئے مٹھائی منگاتا ہوں۔رس گلے“ شیر علی خوش ہوگئے

★★★

قدیر کو داروغہ شیر علی کے پاس بھیجنے کے بعد خود میر صاحب شیروانی پہن کر اور چھڑی ہاتھ میں لے کر اپنے پٹی دار شیورتن کے گھر پہونچے۔اس وقت شیورتن اپنی کُریا میں بیٹھا نریل کا حقّہ گڑگڑا رہا تھا۔میر صاحب کو اپنی کُریا کی طرف آتا دیکھ کر اُسے بڑی حیرت ہوئی۔نریل کو کھاٹ کے پائے سے ٹکا کر کھڑا ہوگیا۔میر صاحب نے اُسے دیکھ کر دور ہی سے آواز دی

”کیوں بھائی شیورتن۔کیسے حال چال ہیں“

”ارے ارے میر صاحب“ وہ بولا ”آؤ آؤ۔ادھر بیٹھو کھٹیا پر“ میر صاحب چارپائی پر بیٹھ کر شیروانی کے بٹن بند کرنے لگے

”ہم کہا۔اس گریب کی جھونپڑی میں کیسے آنا ہوا میر صاحب“

میر صاحب نے منھ میں دبی پان کی گلوری کو ادھر اُدھر گھمایا

”بھائی شیورتن۔میں اس وقت یہ کہنے آیا ہوں کہ مہوے کا جو پیڑ تمہارے کھیت میں ہے“

”ہاں ہاں۔ہے“ شیورتن جلدی سے بولا

”وہی جس کے لئے برسوں سے ہم دونوں میں کھینچا تانی چل رہی ہے۔تو اُسے اب تم اپنا ہی سمجھو۔میں نے اس پر سے اپنا حق ختم کیا اور اس وقت بخوشی تمہیں دے رہا ہوں“

شیورتن نے فوری کوئی جواب دینے کے بجائے جھک کر اپنا نریل اُٹھایا اور کچھ سوچتا ہوا گڑگڑانے لگا۔میر صاحب کچھ دیر بعد پھر بولے

”شیورتن تم نے سُنا میں نے کیا کہا“

”ہاں سُن تو لیا میر صاحب“ وہ دھیمے لہجے میں بولا ”پر ای بات ہمری سمجھ میں نہیں آئی۔دیکھو بُرا نہ مانیو میر صاحب ہم کا ای ماں کونو چال دکھائی دیت ہے“

”کیسی چال؟“ میر صاحب بولے ”شیورتن اگر مجھے دھوکہ دھڑی سے کام لینا ہوتا تو میں خود چل کر تمہارے پاس کیوں آتا۔اچھا اگر تمہیں میرے کہنے کا یقین نہیں تو لاؤ کاغذ میں ابھی لکھ کر دیئے دیتا ہوں کہ آج سے وہ پیڑ تمہارا ہوا“

”ہم کہی میر صاحب“ اُس نے اپنا نریل پھر رکھ دیا ”اب اگر کاغذ پر کچھ لکھا پڑھی کرنے کا ہے تو سیدھے سیدھے سو روپیہ پر پیڑ کا بیع نامہ کاہے نہیں لکھ دیتے“

”دیکھو شیورتن پیڑ تو میں نے تمہیں دے ہی دیا رہا بیع نامہ تو وہ جب چاہو لکھا لینا۔“

”بات پکّی رہی؟“ شیورتن نے پوچھا

”بالکل پکّی رہی۔آخر میں تمہیں زبان دے رہا ہوں“

”ارے سرپھہ آدمی کی جبان ہی بہت ہے“ شیورتن بولا ”اب ایک مجے دار بات ہم سنائت ہے۔آج دن ماں داروگا جی ہم سے ای کہہ گئے ہیں کہ اُو پیڑ تم کاٹ ڈالو اور تھانے پر میر صاحب کے کھلاف رپٹ لکھائے دییو کہ اُو کھیت ماں گھس کے جبردستی پیڑ کاٹ ڈائن۔تو اب کون بات پر ہم بشواس کریں“

”پھر تم نے پیڑ کاٹا؟“ میرے صاحب نے پوچھا

”کاہے کاٹی“ وہ بولا ”میر صاحب ہم کونو بچّہ نہ ہوئی دوسرے کے بھڑکاوے میں کونو کام تنک سوچ بچار کے کرے چاہی۔جون بات شیورتن کے دماگ ماں نہ آئی او کا شیورتن کبھی نہ کری ہیں۔اب دیکھو نا کہ اگر داروگا کے کہے ماں ہم پیڑ کاٹ ڈائت تو کی کے نقصان ہوت۔اپنے تو“

”اب شیورتن تم ہماری مدد کرو“ میر صاحب نے کہا

”حکم دیں میر صاحب“

”تم داروغہ سے جاکر بتادو کہ پیڑ تم نے کاٹ ڈالا۔بس اتنا کام کردو“

''ٹھیک ہے ابہن جائت ہے'' شیورتن نے کہا ''مگر اُو بیع نامہ میر صاحب''

''لاؤ کاغذ - ابھی لکھے دیتا ہوں۔''

★★★

شیورتن کے پاس سے اُٹھ کر میر صاحب گھر آئے اور داروغہ شیر علی کے خلاف سپر نٹنڈنٹ پولیس کان پور کے نام ایک شکایتی درخواست لکھ کر قدیر کو دیا اور اُسے مناسب ہدایات دے کر کان پور روانہ کر دیا۔ وہ مغرب کی نماز پڑھ کر تسبیح پڑھ رہے تھے کہ داروغہ شیر علی آ گئے۔ نماز سے فارغ ہو کر اُنھوں نے برامدہ کے دروازے سے جھانک کر اندر آواز دی۔

''ذرا چائے بنا دینا - داروغہ صاحب آئے ہیں''

شیر علی کے پاس آ کر میر صاحب نے بڑی شفقت سے ان کے شانے پر ہاتھ رکھا ''بھائی شیر علی - تم جیت گئے میاں۔ اللہ تم کو خوش رکّھے سچ تو یہ ہے کہ میں نے ایک سے ایک تیز طرّار پولیس انسپکٹر دیکھے۔ بہتوں سے واسطہ رہا مگر فدا حسین نے کسی کو حاوی نہیں ہونے دیا سب کی ناک رگڑ دی - مگر میاں - مان گئے بھائی تمھیں۔ شریعت کی یہ پابندی اور لحاظ - اللہ اکبر کہ بغیر نکاح کے نامحرم کو ہاتھ نہیں لگایا۔ واہ - مرد ہو تو تمہارے جیسا - شاباش''

میر صاحب کے منھ سے اپنی تعریف سن کر شیر علی نہال ہو گئے۔ صرف 'ہی ہی' کرتے رہے۔

''اَماں تمہاری اسی بات نے تو ہم لوگوں کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ واللہ سچ کہتا ہوں''

شیر علی صوفہ پر بڑے تکلّف سے بیٹھ کر بولے ''آپ کی ذرّہ نوازی ہے میر صاحب''

''تو اب اصل بات کی طرف آیئے شیر علی صاحب'' وہ بولے ''نکاح سے پہلے چند باتیں پہلے سے بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ آگے کوئی غلط فہمی نہ ہو''

شیر علی ہمہ تن گوش ہو کر میر صاحب کی طرف دیکھنے لگے

''پہلی بات تو یہ کہ قدیر کو میں نے باہر بھیج دیا ہے اس لئے اس کی غیر موجودگی میں کل عقد ہو جائے - کوئی دھوم دھام یا بے مقصد شور شرابہ بالکل نہ ہو کیونکہ زرّیں دو جوان بچّوں کی ماں ہے اور آپ کے لئے بھی مناسب نہیں - تو جتنی سادگی اور خاموشی کے ساتھ نکاح ہو جائے بہتر ہے - نکاح بھی میں ہی پڑھ دوں گا''

''مجھے یہ سب باتیں بخوشی منظور ہیں'' شیر علی بولے

''دوسری بات یہ ہے کہ'' وہ چند لمحہ خاموش رہ کر پھر بولے ''زرّیں بیس سال سے بالکل سادہ

زندگی گذار رہی ہے اس کے پاس زیوارت اور قاعدے کے کپڑے نہیں ہیں اس لئے یہ سب آپ کو نکاح سے پہلے اس کو دینا ہوگا تاکہ اُنھیں پہن کر وہ دولھن بنے''

''ٹھیک ہے'' شیر علی بولے ''اور مہر کیا رہے گا؟''

''مہر کی رقم جو آپ کہیں گے وہی رکھی جائے گی'' میر صاحب نے کہا

''پانچ سو'' شیر علی جلدی سے بولے

''بہتر ہے'' میر صاحب بولے ''مگر یہ رقم آپ عقد ہی کے وقت ادا کر دیں گے''

''مجھے منظور ہے''

زرّیں نے ناشتہ کی ٹرے دروازے کی اوٹ سے باہر نکالی۔ شیر علی نے جب اُس کی کہنی تک ننگے ہاتھ کو دیکھا تو دل میں پھر ایک ہیجان سا محسوس کیا اُنھیں پھر اپنی مرحومہ بیگم یاد آ گئیں۔ میر صاحب ناشتہ کی ٹرے لینے کو اُٹھے تو شیر علی نے کہا ''ارے آ جایئے نا اندر - یہاں کون پرایا بیٹھا ہے''

میر صاحب محظوظ ہو کر بولے ''ارے اب ایک دن تو شرما لینے دو بھائی - لیجئے آپ پیڑے کھایئے''

شیر علی پیڑہ کھانے لگے تو میر صاحب نے گرم لوہے پر چوٹ لگائی۔ آہستہ سے بولے ''بھائی شیر علی آپ کا کام تو ہو گیا - اب یہ بتایئے کہ عزیز بیگ والے کیس میں آپ نے کیا رپورٹ لگائی؟''

شیر علی نے دوسرا پیڑا اُٹھاتے ہوئے کہا ''آپ فکر نہ کریں میر صاحب میں سب سنبھال لوں گا۔ بس گاؤں کے دو چار معتبر لوگ اگر پنچ نامہ پر تیار ہو جائیں تو کل ہی معاملہ ختم ہو سکتا ہے کیونکہ موت ندی میں ڈوبنے سے ہوئی ہے اور بظاہر قتل کا کوئی کیس نہیں بنتا''

''کیا لاش ندی میں ملی تھی؟'' میر صاحب نے پوچھا

''جی ہاں - لاش گنگا کے کنارے پڑی تھی آج کل تو پانی بھی کم ہے۔''

''خودکشی کا کیس بھی تو ہو سکتا ہے'' میر صاحب بولے

''بالکل ہو سکتا ہے'' شیر علی نے کہا ''خیر چھوڑیئے یہ سب - میں کل صبح یہیں آ کر پنچ نامہ کرا دوں گا - اللہ اللہ خیر صلاّ''

شیر علی جانے کے لئے اُٹھے تو میر صاحب نے کہا

''اور وہ شیورتن والی بات آپ کو یاد ہے نا؟

''جی ہاں - جی ہاں - خوب اچھی طرح یاد ہے'' شیر علی نے جواب دیا

''اُس حرام زادے نے آج وہ پیڑ کاٹ ڈالا'' میر صاحب بولے ''کیا بتاؤں میں بات کو بڑھانا نہیں چاہتا اور وہ سر پر چڑھا آتا ہے - خیر اب کل کے بعد ہی دیکھوں گا۔ آپ نے تو کوئی توجہ ہی نہ

کی ویسے اب بھی اگر اس کی سرکوبی کے لئے آپ کچھ کر سکیں تو بہتر ہے۔ بھائی اب اس عمر میں فوجداری میرے بس کی بات نہیں ہے''

''سب کچھ مجھ پر چھوڑ دیجئے - میں دیکھ لوں گا''

شیر علی جانے لگے تو میر صاحب نے پھر یاددہانی کرائی

''دن میں ٹھیک گیارہ بجے آجایئے گا - اور ہاں دولھا میاں بن کر نہ آیئے گا سہرا پھول کے ہار وغیرہ سب کچھ آپ کو یہیں پہنایا جائے گا - ہاں کپڑے اور زیورات نہ بھولئے گا - اپنے ساتھ ہی لایئے گا۔''

داروغہ شیر علی میر صاحب سے باتیں کر کے رات میں تھانے واپس آئے تو شیورتن کو انتظار میں بیٹھا پایا۔ اس وقت تھانے میں اس کی موجودگی شیر علی کو اچھی نہیں لگی۔ اُنھیں آتا دیکھ کر شیورتن ہاتھ جوڑ کر دھیرے سے بولا

''کام تو ہوئے گوانسپکٹر صاحب - پیڑ وناکاٹ کر پھینک دین''

شیر علی کچھ جواب دینے کے بجائے بڑی فکرمندی کے ساتھ کرسی پر بیٹھ گئے اور شیورتن کے چہرے کو خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اُسے کیا جواب دیں۔ شیورتن اُنھیں خاموش دیکھ کر پھر بولا

''سُنا داروغہ جی - میر صاحب والا پیڑ سوہا ہوئے گوا''

''بھائی تم کیا کہہ رہے ہو - میں کچھ سمجھ نہیں پایا'' وہ بولے

شیورتن اُنھیں ٹھیک سے سمجھانے کے انداز میں کچھ آگے کی طرف جھک کر بہت دھیرے سے بولا

''ارے ہم کہا سرکار - میر صاحب والا مہوہ کا پیڑ کٹ گوا''

''کس نے کاٹا؟'' شیر علی نے انجان بن کر پوچھا

''کس نے کاٹا؟'' شیورتن نے حیرت سے کہا ''ارے ہم کاٹا - اور کون کاٹی۔ آپ کے حکم رہا تو دن بھرے ماں ہم سب مل کے کاٹ ڈالا - تون یہی بتاوے کھاطر تو ہم یہاں آئے ہیں - اور آپ پوچھت ہیں کون کاٹس''

''ہوں'' شیر علی نے گہرائی تک سمجھنے کے انداز میں 'ہوں' کہا ''تو تم گاؤں میں فرقہ وارانہ فساد کرانا چاہتے ہو - کیوں؟ - تیرا پہلا جرم تو یہ ہے کہ تو نے گاؤں میں فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا کی۔ ابھی اگر میر صاحب بھی دس بیس ہمدردوں کو لے کر آجائیں تو بلوہ ہوتے کتنی دیر لگے گی، بول - اور دوسرا جرم تیرا یہ ہے کہ ہرے بھرے پیڑ کو کاٹ کر قانونی جرم کیا اس پر سے یہ ڈھٹائی کہ تھانے پر اپنی سرہنگی بیان

کرنے آگئے سمجھتے ہوئے میں تمہیں ایسے ہی چلا جانے دوں گا - گنپت رام بند کر دو اِسے حوالات میں''

''ارے ارے - دروگا جی - اِی آپ کا کہت ہیں - سرکار ہم تو آپے کے کہے پر کاٹا ہے''

''چوپ - بدمعاش'' شیر علی نے ڈانٹ بتائی ''اب بولا تو زبان کھینچ لوں گا''

گنپت رام نے شیورتن کو پکڑ کے حوالات میں بند کر دیا

★★★

یہ رات شیر علی کے لئے شبِ ہجراں سے کم نہ تھی۔ بھاری اور طویل۔ وہ ساری رات جاگتے اور بستر پر کروٹیں بدلتے رہے۔ کبھی مرحومہ بیگم کا چہرہ تصوّر میں آتا تو کبھی زرّیں کا شاداب مسکراتا چہرہ - اسی بے چینی اور بیداری میں اُنھوں نے اپنی شریک حیات کے تصوّر میں نہ جانے کتنی غزلیں کہہ ڈالیں۔ ایک دوسہرے بھی کہے۔ خیالوں ہی میں اُنھوں نے اپنے کوارٹر کا جغرافیہ درست کیا۔ بیوی کے لئے کمرہ، مسہری، سنگھار میز سب کچھ اس سجاوٹ کے ساتھ ترتیب دیا کہ اپنی خوش سلیقگی پر خود ہی خوش ہو اُٹھے۔ شاید ایک آدھے گھنٹے پلک جھپکی ہو کہ صبح سویرے ہی جاگ اُٹھے۔ آج کا دن ان کی زندگی میں ایک نئی بہار نئی ترنگ اور نیا جوش لانے والا تھا اس لئے اپنے چہرے پر بھی جوانی کی چمک دمک لانے کی خاطر اُنھوں نے نئے بلیڈ سے خوب اچھی طرح شیو کیا اور اسی مصروفیت میں اپنی بیٹی ثریّا کو صرف اتنا کہہ کر آگاہ کیا

''بیٹی آج گھر ایک مہمان آنے والا ہے۔ ذرا گھر ٹھیک ٹھاک کر لینا اور اپنا کوئی اچھا سا سوٹ پہن لینا۔'' ثریّا نے کوئی تفصیل نہیں پوچھی سن کر چپ رہی

صبح نو بجے کے قریب بستی میں جا کر داروغہ شیر علی نے لوگوں کو میر فدا حسین کے مکان پر اکٹھا کیا اور عزیز بیگ کے پانی میں ڈوب کر مرنے کا پنچ نامہ تیار کر کے تین چار بزرگ اور معتبر قسم کے گواہوں کے دستخط کرا لئے۔ ابھی اُنھیں اس کام سے پوری فرصت نہیں ہوئی تھی کہ شیورتن کی گھر والی اور اس کی بیٹی روتی پیٹتی دہائی دیتی ہوئی دو ایک آدمیوں کو ساتھ لے کر وہاں پہونچ گئی۔

''ارے کاہے ہمرے گھر والے کو قید میں ڈالا ہے - کون چوری ڈکیتی کہس ہے۔ ای کیسا اندھیر ہے دروگا جی جرا ہمیں بتاؤ تو او کے قصور''

ایک سپاہی نے اپنا بید کا ڈنڈا ہوا میں لہرایا ''اے عورت چپ رہ''

''کاہے چپ رہیں'' اس کی لڑکی اکڑ کر بولی ''بپّا کو بن ناحک پکڑ کے تھانے ماں بند کئے ہو اور ہم سُور بھی نہ مچائی - ارے ہم کھوب چلائیں گے۔ کھوب سور مچائیں گے - کا کرلو گے ہمار''

''دیکھوتم لوگ ابھی یہاں سے جاؤ۔ یہاں بہت ضروری سرکاری کام ہو رہا ہے تھوڑی دیر بعد تھانے آ جانا تو سب کچھ بتا دیا جائے گا'' شیر علی نے سمجھایا

ان عورتوں کو وہاں سے ہٹانے کے بعد داروغہ جی میر صاحب کو تخلیہ میں لے جا کر بولے

''دیکھئے آپ کے کہنے پر میں نے شیورتن کو حوالات میں بند تو کر دیا ہے مگر میرے پاس کوئی تحریری رپورٹ آپ کی طرف سے نہیں ہے اس لئے مہربانی کر کے شیورتن کے خلاف پیڑ کاٹنے کی ایک تحریر لکھ کر مجھے دے دیجئے تا کہ میری بھی مضبوطی ہو جائے''

''ہاں ہاں- کیوں نہیں'' میر صاحب جلدی سے بولے ''رپورٹ تو لکھ کر دینا ہی دینا ہے بس قدیر کو واپس آ جانے دیجئے اسی سے لکھوا دوں گا- دراصل وہ پیڑ قدیر ہی کا ہے''

''ٹھیک ہے'' شیر علی بولے پھر تو مجھے اِن عورتوں کے چلاّنے کی کوئی فکر نہیں ہے''

شام کو چار بجے شیر علی سرکاری جیپ میں بیٹھ کر نکاح کی غرض سے آ پہونچے اور اپنے ساتھ دولھن کے لئے کپڑے زیورات، میوے شکر اور ڈھیروں مٹھائیاں و پھل بھی لائے تھے۔ دو ہزار روپے کی بڑی نفیس اور جگمگاتی ہوئی بنارسی ساڑی بھی لائے تھے اُسے پہننے کے بعد اپنے پورے سنگھار کے ساتھ جب زرّیں نے آئینے میں اپنی سج دھج دیکھی تو کھل اُٹھی اور میر صاحب بار بار آ کر ''ماشاءاللہ- ماشاءاللہ- چشم بد دور'' کہتے رہے۔ مگر شیر علی کی چشم بد ابھی زرّیں کے اس قیامت خیز سنگھار کو نہیں دیکھ پائی تھی وہ کمرے میں آنے والی گھڑیوں کے انتظار میں بڑی بے تابی سے ٹہل رہے تھے۔

میر صاحب نے رسماً پہلے شیر علی کا منھ میٹھا کرایا پھر اُن دونوں کا نکاح بہ عوض پانچ سو روپیہ مہر معجّل سکۂ رائج الوقت پر کچھ ایسی عربی نما زبان میں پڑھ دیا کہ اُسے شیر علی کے فرشتے بھی سمجھ نہ پائے- دولھا میاں کے سر پر سے چھوہارے نچھاور کرنے کے بعد میر صاحب بولے

''مبارک ہو میاں شیر علی صاحب- زرّیں اب اس وقت سے آپ کی زوجہ ہو گئ'' نوشہ میاں نے سروقد کھڑے ہو کر میر صاحب کو سلام عرض کیا اور نئی نویلی دولھن کو جیپ میں بٹھا کر اپنے گھر لے آئے۔

نکاح خوانی کی رسم تو بہت سادگی کے ساتھ بغیر کسی دھوم دھام کے صرف آدھے گھنٹے میں انجام پا گئی تھی۔ دولھن شیر علی کے کوارٹر میں آئی تو ان کی بیٹی ثریّا یہ ہوش ربا منظر دیکھ کر بھوچکّی رہ گئی۔ اس کی حیرت دور کرنے کے لئے شیر علی نے خود ہی کہا ''بیٹی یہ تمہاری نئ ماں ہیں، انھیں سلام کرو۔''

بیٹی تو اپنی جگہ چپ چاپ تصویرِ حیرت بنی کھڑی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ ماجرا کیا ہے جسے نئ ماں بتایا گیا ہے وہ تو ہو بہو اپنی ہی ماں کی طرح ہے- لیکن ایسا کیوں کر ممکن ہے- کیا ماں پھر سے زندہ ہو کر آ سکتی ہے- وہ دم بخود کھڑی تھی کہ زرّیں خود ہی آگے بڑھی اور ثریّا کو اپنی بانہوں میں لے کر سینے سے لپٹا لیا

''جیتی رہو بیٹی- خوش رہو'' دراصل اُسے قدیر کی پسند اچھی لگی تھی

نئ دولھن کو شیر علی نے اپنے کمرے میں مسہری پر بٹھایا اور الماری کھول کر ڈھیروں روپے نکالے پھر اُن نوٹوں کو دولھن کے قدموں پر رکھ کر بولے

''بیگم یہ تمہارے مہر کے روپے ہیں۔ میر صاحب کا حکم تھا کہ مہر فوراً ہی ادا کرنا ہوگا''

''ان روپوں کو وہیں رکھ دیجئے یہ میں اپنی طرف سے ثریّا بیٹی کو دوں گی'' وہ بولی

''اگر تم ثریّا کو اپنے بس میں کر لو تو میری ساری فکریں ختم ہو جائیں وہ کئی سال سے ماں کے پیار کو ترس رہی ہے'' شیر علی نے کہا

''آپ فکر نہ کریں اُسے میں اپنی ہی بیٹی کی طرح پیار دوں گی'' زرّیں نے کہا

شیر علی اپنی دولھن سے پیار بھری باتوں میں مصروف تھے کہ اتنے میں کسی نے کوارٹر کا دروازہ باہر سے کھٹ کھٹایا

''داروغہ جی- کپتان صاحب آئے ہیں۔'' یہ سپاہی گنپت رام کی آواز تھی

بادل ناخواستہ اپنی بیگم کے پاس سے اُٹھ کر شیر علی نے جلدی جلدی وردی پہنی اور باہر آئے تو تھانے میں ایس پی کان پور کو بیٹھا دیکھا۔ اُس کی جیپ ایک پیڑ کے نیچے کھڑی تھی اور دو سپاہی اس میں بیٹھے تھے۔ شیر علی تھانے میں آئے تو وہاں ایس پی کے سامنے شیورتن کی عورت اور اس کی بیٹی کھڑی تھیں۔

''دیکھو بھائی یہ عورتیں کیا لفڑا لائی ہیں۔ کیا بات ہے'' ایس پی نے کہا

''چلو ہٹو- تم لوگ وہاں باہر چل کے بیٹھو- ابھی باتیں کرتا ہوں'' داروغہ عورتوں سے بولے

''کاہے- باہر کاہے جائیں'' عورت بولی ''جون بات کرنا ہوئے حاکم کے سامنے کرو- ایک تو ہمرے آدمی کو کل سے قید ماں ڈالے ہوا اوپر سے کہت ہو باہر جاؤ- ہم نہیں جائیں گے باہر ہم صاحب کے دہائی دے رہن ہیں وہی سنیں گے''

''چلو سُن لو بھائی یہ کیا کہتی ہیں- پہلے ان ہی کا قضیہ نمٹا لو'' ایس پی بولا

شیر علی نے ایک سپاہی کو حکم دیا کہ وہ شیورتن کو حوالات سے لے آئے

''وہ- حضور- شیورتن یعنی اس عورت کا آدمی گاؤں کا بڑا سرہنگ بدمعاش ہے اُس نے گاؤں کے ایک معزّز زمیندار میر فدا حسین کا ایک ہرا بھرا پیڑ کاٹ ڈالا ہے''

''ارے ای بالکل جھوٹ بات ہے سرکار'' عورت چلائی ''ہمار مرد کچھ نہیں کہس''

''اچھا اچھا- تم خاموش بیٹھو اپنے آدمی کو آنے دو'' ایس پی نے کہا

چند منٹ بعد سپاہی شیورتن کو لے کر آ گیا- ایس پی نے اس سے پوچھا

''تم نے میر صاحب کا پیڑ کیوں کاٹا ہے؟''

''ہم کونو پیڑ نہیں کاٹا سرکار'' شیورتن بولا ''ای ہم پر جھوٹا الزام ہے''

داروغہ شیر علی نے لاجواب ہو کر ٹرمپ کارڈ پھینکا

''میر صاحب کو بلا کر پوچھ لیا جائے۔ یہ تو انکار ہی کرے گا''

''ٹھیک ہے۔ ہم میر صاحب سے پوچھیں گے۔ تب تک تم لوگ باہر بیٹھو'' ایس پی نے کہا

شیورتن اور دونوں عورتیں برامدے میں جا کر بیٹھ گئے تو ایس پی نے اپنی فائل سے ایک کاغذ نکال کر شیر علی کے آگے رکھا

''آپ کے خلاف یہ شکایت آئی ہے۔ پڑھیۓ ذرا''

شیر علی نے درخواست کو پڑھا تو پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔ قدیر نے سپرنٹنڈنٹ پولیس کو یہ عرضی دی تھی کہ مدنی پور کے تھانہ انچارج شیر علی نے اس کی ماں کو اُس کی مرضی کے خلاف زبردستی اپنے گھر میں بند کر رکھا ہے اگر اُسے فوراً تھانہ انچارج سے چھٹکارا نہ دلایا گیا تو ماں کی عزت کو خطرہ ہو سکتا ہے''

''اس درخواست کے بارے میں آپ کا کیا کہنا ہے؟'' ایس پی نے پوچھا

''بالکل جھوٹی شکایت ہے حضور والا''

''یعنی کہ وہ عورت آپ کے گھر میں نہیں ہے۔ یہی کہنا چاہتے ہیں نا آپ؟''

''جی نہیں۔'' شیر علی بولے ''میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں نے اس عورت سے نکاح کیا ہے۔ شرعی عقد۔ وہ میری بیوی ہے۔ اگر آپ کو اس بارے میں پوچھ گچھ کرنی ہو تو میر فدا حسین سے پوچھئے اُنھوں نے ہم دونوں کا نکاح پڑھایا ہے۔ پھر ایک بالغ بیوہ عورت سے عقد کرنے کے لئے اس کے لڑکے کی مرضی واجازت کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی''

''بلوایئے میر فدا حسین کو'' ایس پی نے کہا ''ذرا میں دیکھوں کون ہیں میر صاحب جن کو آپ ہر معاملے میں صفائی کے لئے پیش کر رہے ہیں۔ پولیس کے ٹاؤٹ ہیں کیا؟''

شیر علی نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا بلکہ ایک سپاہی کو حکم دیا کہ جا کر میر صاحب کو ان کے گھر سے پولیس کی گاڑی میں بٹھا کر لے آئے۔

میر صاحب جلد ہی آ گئے۔ شیروانی اور کالی فیز کیپ کے ساتھ منھ میں پان کے کئی بیڑے دبائے بڑے رعب ودبدبے کے ساتھ تھانہ میں آئے تو ایس پی نے پوچھا ''کیا نام ہے آپ کا؟''

''بندے کو سیّد فدا حسین کہتے ہیں حضور والا''

''منھ کا پان باہر تھوک کر آیئے۔'' ایس پی نے کہا

میر صاحب پان تھوکنے کے بعد ایس پی کے پاس والی کرسی پر بیٹھ گئے ایس پی نے مُڑ کر ان

کی طرف دیکھا ''پہلے آپ یہ بتایئے کہ شیورتن ہی نے آپ کا پیڑ کاٹا ہے اس کا آپ کے پاس کیا ثبوت ہے۔ کتنے گواہ ہیں آپ کے پاس۔ یہ میں اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ شیورتن جرم سے انکار کرتا ہے''

''شیورتن نے میرا کوئی پیڑ نہیں کاٹا حضور والا۔ نہ ہی میں نے ایسی کوئی رپورٹ لکھائی ہے''

یہ سنتے ہی شیر علی اپنی کرسی سے اس طرح اچھل کر کھڑے ہو گئے جیسے بہت سے بچھّوؤں نے ایک ساتھ ڈنک مارا ہو۔ بڑی بڑی آنکھیں نکالے تعجب کے ساتھ میر صاحب کی صورت دیکھتے رہے۔ ایس پی نے میر صاحب سے پھر پوچھا

''یعنی آپ نے شیورتن کے خلاف پیڑ کاٹنے کی کوئی رپورٹ نہیں لکھائی''

''جی نہیں'' وہ بولے ''بلکہ میں نے تو اپنا ایک درخت اس کے ہاتھوں بیچا ہے''

''شیورتن کو بلایئے'' ایس پی نے شیر علی سے کہا

شیورتن سامنے آیا تو ایس پی نے اس سے پوچھا

''کیا میر صاحب نے تمہارے ہاتھ کوئی پیڑ بیچا ہے؟''

شیورتن ہاتھوں کو جوڑ کر جھٹ بولا ''ہاں سرکار ہاں۔ میں نے میر صاحب سے ایک پیڑ مہوا کا خریدا ہے۔ اور کونو پیڑ ویڑ نہیں کاٹا''

''اچھا تم جاؤ'' ایس پی اُسے جانے کا اشارہ کیا

شیورتن چلا گیا تو ایس پی پھر میر صاحب کی طرف متوجہ ہوئے

''ایک بات اور آپ سے پوچھنا ہے''

''حکم کیجئے'' میر صاحب بولے

''کیا آپ نے داروغہ شیر علی کا نکاح کسی بیوہ عورت کے ساتھ پڑھا ہے؟''

''جی! میں نے؟'' وہ بولے ''جناب کیوں مجھ بوڑھے سے آپ مذاق کر رہے ہیں''

''ہنسیۓ مت'' ایس پی بولا ''صرف ہاں یا نہیں میں جواب دیجئے''

''میں نے تو کوئی نکاح وکاح نہیں پڑھا۔ یہ کس نے کہا ہے آپ سے'' میر صاحب بولے

''قدیر نام کے ایک لڑکے نے رپورٹ کیا ہے کہ داروغہ شیر علی نے اس کی ماں کو زبردستی اپنے گھر میں بند کر رکھا ہے اور داروغہ صاحب کا کہنا ہے کہ اُنھوں نے اس عورت کے ساتھ نکاح کیا ہے یعنی وہ عورت اب ان کی بیوی ہے۔''

یہ سُن کر میر صاحب اپنے منھ میں بچی کھچی پان کی پیکھی باہر تھوکنے گئے پھر لوٹ کر واپس آئے تو بولے

''تو بندہ پرور میں اس معاملہ میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا ہوں کہ اگر

حضور والا کا حکم یا اشارہ ہو تو بندہ ابھی اور اسی وقت ان دونوں کا نکاح پڑھ دے گا- بھائی عورت اگر بالغ ہے تو کسی پوچھنا کیسا''

''آپ صرف اتنا بتایئے کہ آپ نے نکاح پڑھا ہے یا نہیں'' اس نے سخت لہجہ میں پوچھا

''جی نہیں- خادم نے یہ بات تو پہلے ہی عرض کر دی تھی'' میر صاحب بولے

اب ایس پی شیر علی کی طرف متوجہ ہوا

''کیا وہ عورت اس وقت آپ کے گھر میں موجود ہے؟''

شیر علی کی نظروں میں اندھیرا چھا گیا- دنیا تاریک دکھائی دینے لگی۔ وہ قدیر، میر صاحب اور شیورتن کی مجموعی سازش کا بری طرح شکار ہو چکے تھے اُنھوں نے ایسا سوچا بھی نہی تھا کہ یہ لوگ اُسے دھوکہ دے کر اس طرح ذلیل کریں گے ابھی وہ اسی شش و پنج میں تھے کہ ایس پی نے پھر اپنا سوال دوہرایا

''جواب دیجئے مسٹر شیر علی- کیا وہ عورت اس وقت آپ کے گھر میں ہے؟''

''جی- جی ہاں'' شیر علی بولے ''مگر میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ وہ میری بیوی ہے''

''تو چلئے- اس بات کی تصدیق کر لی جائے'' ایس پی نے اُٹھتے ہوئے کہا

''بہت مناسب ہے'' میر صاحب بولے ''ہو سکتا ہے لڑکے نے ناسمجھی میں درخواست دی ہو اس لئے اس عورت سے پوچھ لینا بہت ضروری ہے- یعنی اگر دونوں ایک ساتھ رہنے پر رضامند ہیں تو میرے خیال میں کپتان صاحب اس معاملہ میں قانون کچھ کر ہی نہیں سکتا- دونوں بالغ ہیں نا''

ایس پی نے میر صاحب کو ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا

''دیکھئے اب آپ خاموش بیٹھے رہیئے اور جب آپ سے کچھ پوچھا جائے تب ہی بولئے گا''

''بہت بہتر ہے جناب'' میر صاحب اپنی مونچھیں سنوارنے لگے

''منشی جی کو بلوایئے'' ایس پی نے شیر علی سے کہا پھر شیورتن کو اشارے سے بلایا شیر علی نے ایک سپاہی کو اشارہ کیا کہ وہ منشی جی کو بلا لائے۔ ہیڈ کانسٹبل منشی نے اندر آ کر ایس پی کو سلوٹ مارا اُس کے پیچھے شیورتن آ کر کھڑا ہو گیا۔

ایس پی نے داروغہ سے کہا

''آپ کے تھانے میں پیڑ کاٹنے کی کوئی رپورٹ درج نہیں ہوئی- آپ نے یہ بے بنیاد خبر کس سے سنی یہ بھی نہیں معلوم اور نہ آپ نے اس بات کی کوئی انکوائری موقع پر جا کر کی- میر صاحب اور شیورتن دونوں اس بات سے انکاری ہیں- تو نتیجہ یہ نکلا کہ آپ نے ایک بے قصور کو بلا وجہ زور زبردستی سے حوالات میں بند رکھا''

شیر علی لاجواب تھے چپ چاپ سنتے رہے۔ ایس پی نے منشی کو حکم دیا

''تم اسی وقت میرے سامنے تھانہ انچارج کے خلاف شیورتن کا ایف آئی آر لکھو اور لا کر مجھے دکھاؤ- کیوں شیورتن تم داروغہ کے خلاف رپورٹ لکھانا چاہتے ہو''

''ہاں حضور'' وہ بولا

اب ایس پی نے شیر علی سے کہا ''آیئے چلئے- اب اس عورت کے بارے میں بھی تحقیقات کر لی جائے جسے آپ اپنی بیوی بتاتے ہیں''

''صرف بتاتا ہی نہیں ہوں- وہ شرعاً قانوناً اور حقیقتاً میری بیوی ہے اس لئے بغیر میری مرضی و اجازت کے آپ میری پردہ نشین اہلیہ سے کیسے اور کس بنا پر باتیں کر سکتے ہیں''

''اس درخواست کی بنیاد پر جو اس کے لڑکے نے مجھے دی ہے'' ایس پی نے آگے کہا ''یہ بات کہ وہ عورت آپ کی بیوی ہے اس کے ثبوت میں آپ نے میر صاحب کو پیش کیا وہ اس بات سے انکار کر گئے کہ اُنھوں نے نکاح پڑھا ہے اس لئے شرعاً وہ آپ کی بیوی نہیں ہے۔ قانوناً وہ آپ کی بیوی ہے یا نہیں اس کا فیصلہ قانون کر دے گا۔ رہ گئی یہ بات کہ وہ حقیقتاً آپ کی بیوی ہے تو اس کی تصدیق کے لئے میں آپ کے ساتھ چلوں گا اور آپ کی موجودگی میں اس عورت کے منھ سے صحیح بات معلوم کر کے یہ فیصلہ کروں گا کہ یہ درخواست صحیح ہے یا نہیں''

''حضور کپتان صاحب- بالکل سولہ آنہ کھری بات فرمائی ہے آپ نے اور ویسے بھی سانچ کو آنچ کیا ابھی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی....''

''دیکھئے میر صاحب- میں نے آپ کو بولنے کے لئے منع کیا تھا'' ایس پی بولا شیر علی کو پسینے چھوٹ گئے- منھ خشک ہو گیا اور چہرے پر ہوئیاں اُڑنے لگیں

''چلئے اُٹھئے'' اس نے شیر علی سے کہا ''بات سچی ہے تو ڈر کس بات کا ہچکچاہٹ کیسی- آپ اگر سچ بول رہے ہیں تو یقین کیجئے میں کوئی ایکشن نہ لوں گا''

شیر علی دل ہی دل میں اچھی طرح سمجھ چکے تھے کہ میر صاحب نے بڑی گہری سازش ان کے خلاف رچی ہے اور اس میں پھنسانے کے لئے جو چال میر صاحب نے بچھایا ہے اس سے آسانی کے ساتھ چھٹکارا پانا بہت مشکل ہے اس وقت ان کا حال اس نٹ کے مانند تھا جو دو اونچی پہاڑیوں کے بیچ کی کھائی کو ایک رسّے پر چل کے پار کرنے کی کوشش میں بالکل بیچوں بیچ پہونچ چکا ہے اور جس کے لئے پیچھے واپس جانے میں آگے بڑھنے سے زیادہ خطرہ ہے۔ اس وقت ان کی عزت اور نوکری دونوں داؤں پر لگی تھیں اور ان میں سے کسی کو بھی وہ آسانی کے ساتھ قربان نہیں کر سکتے تھے۔ مجبوراً چلنے کے لئے اُٹھ گئے

''چلئے- چلتا ہوں'' وہ بولے ''مگر میرے ساتھ صرف آپ چلیں گے''

''مسٹر شیر علی'' ایس پی نے کہا ''میں ایک ذمّہ دار پولیس افسر ہوں۔ آپ کے خلاف اپنی

تحقیقات میں کیا میں آپ ہی کو گواہ بناؤں گا۔ میر صاحب بطور گواہ میرے ساتھ چلیں گے''

''اے حضور۔ آپ اس خادم کو تو معاف ہی رکھیں'' میر صاحب بولے'' میں ضعیف و ناتواں گواہی شہادت میں کہاں مارا مارا پھروں گا۔ کسی دوسرے کو لے لیں حضور''

''میں نے بولنے کو منع کیا تھا'' ایس پی بولا'' آپ ہی کو چلنا ہوگا''

ایس پی داروغہ شیر علی اور میر صاحب تینوں داروغہ کے کوارٹر کے پاس پہونچ کر رک گئے۔ شیر علی اندر جانے لگے تو ایس پی نے روک کر پوچھا

''ٹھہریئے۔ ٹھہریئے۔ پہلے یہ بتا دیجئے کہ گھر کے اندر کون کون ہے''

''میر بیوی اور میری بیٹی'' شیر علی بولے'' ان کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے''

''پہلے آپ اپنی بیٹی کو آواز دیجئے''

شیر علی نے بیٹی کو پکارا'' ثریا بیٹی!''

''جی ابّاں جان''

''بیٹی تم اپنی نئی ماں سے کہو کہ ایس پی صاحب اُن سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں وہ ان کی باتوں کا صحیح صحیح جواب دیں'' شیر علی نے کہا

''وہ میرے پاس ہی کھڑی ہیں'' لڑکی نے جواب دیا

شیر علی نے ایس کی طرف دیکھا'' پوچھئے جو کچھ آپ کو پوچھنا ہے''

ایس پی نے سوال کیا'' معاف کیجئے گا۔ کیا قدیر آپ کا بیٹا ہے؟''

اندر سے آواز آئی'' جی ہاں''

''دیکھئے اب میں جو سوال آپ سے کرنے جا رہا ہوں اس کے لئے مجھے چھما کیجئے گا یہ سوال اگر ضروری نہ ہوتا تو میں نہ پوچھتا''

''آپ پوچھ سکتے ہیں''

''ذرا ایک منٹ ٹھہریئے کپتان صاحب'' میر صاحب کو موقع نازک دکھائی دینے لگا'' دخل اندازی کے لئے معافی چاہتا ہوں لیکن حضور والا یہ بتایئے کہ جو آواز آپ سُن رہے ہیں اس بارے میں آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ اُسی عورت کی آواز ہے جس سے آپ سچ مچ سوال پوچھنا چاہتے ہیں۔ میرا مطلب ہے کیا آپ اس کی آواز کے بارے میں وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ اُسی عورت کی آواز ہے''

میر صاحب کے اتنا کہنے پر ایس پی نے انھیں اوپر سے نیچے تک ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا پھر بولا

''جناب میں کتنی بار آپ کو بیچ میں بولنے سے منع کر چکا ہوں۔ صرف دیکھتے رہئے آپ''

''واہ واہ صرف دیکھتے رہئے۔ خیر۔ جو آپ کا حکم۔'' میر صاحب بولے'' میں تو اس آواز کو نہیں پہچانتا''

''ہاں تو قدیر کی ماتا جی'' ایس پی زنان خانہ کی طرف متوجہ ہوا'' آپ یہاں یعنی شیر علی صاحب کے گھر میں خود اپنی مرضی سے آئی ہیں یا کسی کے زور زبردستی سے''

دو منٹ کے لئے سکوت رہا تو شیر علی کو پھر پسینہ چھوٹ پڑا۔ میر صاحب جان بوجھ کر اپنا گلا صاف کرنے کی غرض سے دو ایک بار کھنکھارے شاید کوئی لقمہ دینا چاہتے تھے

''بولئے۔ بولئے'' ایس پی نے کہا'' آپ کسی سے ڈریئے نہیں''

''ہاں۔ کسی سے ڈریئے نہیں'' میر صاحب بول ہی پڑے اور شیر علی دانت پیس کر رہ گئے۔ اندر سے آواز آئی

''میں یہاں اپنی مرضی اور اپنی خوشی سے آئی ہوں''

یہ سنتے ہی فرطِ حیرت سے میر صاحب کے پیروں تلے کی زمین کھسکنے لگی ہکلاتے ہوئے بولے

''بھ۔ بھائی۔ عجیب تماشہ ہے۔ یعنی کہ آپ بولنے ہی نہیں دیتے مجھے زبان بند کر رکھی ہے میری''

''ہاں ایک بات آپ سے اور پوچھنا ہے'' ایس پی نے کہا'' کیا داروغہ جی نے آپ سے۔'' نکاح۔''

''بس جناب والا'' شیر علی نے ٹوکا'' قدیر نے صرف اتنی ہی رپورٹ کی ہے کہ اس کی والدہ کو جبراً گھر کے اندر بند کیا گیا ہے اس کے علاوہ اس نے کوئی اور شکایت نہیں کی اس لئے اپ کی تحقیقات اور انکوائری صرف اسی بات تک محدود ہونی چاہئیے۔ اور اب جب کہ آپ نے سُن لیا کہ ان کے ساتھ کوئی زور زبردستی نہیں کی گئی وہ اپنی خوشی سے یہاں آئی ہیں تو کمپلینٹ بے بنیاد ہوگئی کہ نہیں''

''دیکھا حضور والا'' میر صاحب نے پینترا مارا'' میں نہ کہتا تھا کہ آگے کو یہی بات پیدا ہوگی۔ میرا اندازہ بالکل صحیح نکلا۔ نہ جانے آپ نے کس سے پوچھا اور کس نے جواب دیا۔ واہ صاحب واہ۔ اچھی تحقیقات ہو رہی ہے''

''آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں'' ایس پی نے مُڑ کر میر صاحب کو دیکھا

''بالکل سیدھی سی بات ہے جناب'' میر صاحب بولے'' قدیر کی ماتا جی کی آواز نہ تو آپ پہچانتے ہیں اور نہ نعوذ باللہ میں۔ تو پھر اس کی تصدیق کیسے ہوگی کہ یہ عورت جو اندر سے بول رہی تھی وہی قدیر کی ماں ہے۔ نہیں نہیں۔ سوچنے والی بات ہے جناب والا''

''۔ کچھ سوچنے کی بات نہیں'' ایس پی بولا'' قدیر سراسر جھوٹا ہے ورنہ اُسے بھی انکوائری کے وقت یہاں موجود رہنا چاہئیے تھا۔ چلئے اب مجھے اطمینان ہوگیا۔ مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا۔ میر صاحب اب آپ جاسکتے ہیں۔''

”بہت اچھا جناب - بالکل جا رہا ہوں ۔ کون سی جائیداد میری لُٹی جا رہی ہے“

وہ تینوں شیر علی کے کوارٹر سے تھانہ کی طرف چلے تو راستے میں میر صاحب نے پھر کہا ”تو میں نے عرض کیا بندہ پرور کہ وہ جو عورت داروغہ صاحب کے کوارٹر میں اپنی خوشی سے آ بیٹھی ہے اور جس کا ابھی نکاح نہیں ہوا تو کیا اس کام کے لئے ابھی اس خاکسار کی ضرورت پڑے گی - میرا مطلب ہے کہ اگر حضور کا منشا ہو تو بندہ آپ کی موجودگی میں یہ کام بھی کرتا جائے - شیر علی صاحب شکر چھوہارے منگا لیں - بس ۔“

ایس پی نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا لیکن تھانہ کے اندر آتے ہی اُنھوں نے داروغہ شیر علی کو اپنا زبانی حکم سنایا

”شیورتن پر بے جا سختی کے لئے میں آپ کے خلاف صرف ڈپارٹمنٹل کارروائی کر رہا ہوں یعنی آپ کا یہاں سے فوری تبادلہ - دو تین دن میں جیسے ہی اپ کو ریلیو کرنے والا یہاں پہونچے آپ فوراً چارج دے کر کان پور کوتوالی میں رپورٹ کریں اور وہاں سے اپنی نئی تعیناتی کے آرڈس لیں - سمجھ گئے؟“

★★★

داروغہ شیر علی اپنے کوارٹر میں زخمی شیر کی مانند گرج رہے تھے غصّہ میں ٹہل ٹہل کر چلاّ رہے تھے ”یہ سالا میر صاحب - خدا اس کو غارت کرے - حرام زادہ ایکدم آستین کا سانپ بن گیا ۔ کم بخت پر بھروسہ کیا تھا میں نے مگر اس کی آنکھوں میں تو سور کا بال نکلا - ایسا فریبی کمینہ اور کم ظرف انسان آج تک میری نظر سے نہیں گذرا - میری مہربانیوں کا میرے روپوں کا کچھ بھی خیال نہ کیا اس نے ۔ سالا احسان فراموش ۔ دغاباز ۔ افوہ رے مکّاری - اور اوپر سے سینہ زوری بھی - کہتا ہے میں نے نکاح ہی نہیں پڑھا - اچھا بیٹا نہیں پڑھا تو - میں اب اس سے پڑھواؤں گا بھی نہیں - میں ابھی کان پور سے مولوی فیض اللہ صاحب کو بلواتا ہوں اور ابھی ایک گھنٹہ میں نکاح ہوا جاتا ہے - پھر پوچھوں گا سالے سے“

زرّیں خاموش سر جھکائے بیٹھی تھی ۔ ثریّا باپ کو سمجھانے لگی

”ابّا جان غصّہ کرنے سے کوئی فائدہ نہیں - آپ تھوڑی دیر خاموشی سے بیٹھ جائیں“

”نہیں بیٹھوں گا میں“ پھر ہتھیلی پر مکّہ مار کر بولے ”ابھی جیپ سے جا کر مولوی فیض اللہ کو کان پور سے پکڑ لاتا ہوں - آج ہی رات میں نکاح پڑھا کر دم لوں گا“

”دیکھئے ابّا جان - نکاح کا خیال اپنے ذہن سے نکال دیجئے اور انھیں اپنے گھر جانے دیجئے - میں آپ کے ہاتھ جوڑتی ہوں“

”کیوں - کیوں - کیوں - کیوں جانے دوں؟ ۔ یہ اپنی خوشی اور مرضی سے آئی ہیں ، ابھی

ابھی کہہ چکی ہیں ۔“

”نہیں ابّا جان“ ثریّا بولی ”یہ نکاح کے لئے راضی نہیں ہیں میں پوچھ چکی ہوں - ان کا یہی احسان کیا کم ہے کہ ایس پی کے سامنے آپ کی بات اور آپ کی عزّت انھوں نے رکھ لی ۔ سوچئے تو اگر میر صاحب کی طرح یہ بھی مکر جاتیں تو آفیسر کے سامنے آپ کی کتنی ذلّت ہوتی - آپ خود پوچھ لیں یہ راضی نہیں ہیں ۔“

”راضی نہیں ہیں - تو پھر جب میر صاحب کا بچّہ نکاح کے صیغے پڑھنے کی جگہ عربی میں آئیں بائیں شائیں بک رہا تھا تو اسی وقت یہ کیوں نہیں بولیں ۔ شادی کے لئے کپڑے اور زیورات کیوں لئے - یہ ڈھائی ہزار کی بنارسی ساڑی کیوں پہنی - دولھن بن کر میرے ساتھ کیوں آئیں - بات بالکل صاف ہے ۔ یعنی اگر یہ اب نکاح پر راضی نہیں ہیں تو بے شک میر صاحب کی سازش میں شریک تھیں“

”نہیں نہیں - میں کسی سازش میں شریک نہیں ہوں“ زرّیں بولی

”چلو مان لیا“ وہ بولے ”تو پھر اب مولوی فیض اللہ کو بلانے دو“

”نہیں“ وہ جلدی سے بولی

”نہیں؟ - کیوں نہیں؟“ شیر علی چمک کر بولے ”اب کیا بات ہوگئی - اچھا مان لو میر صاحب کے نکاح پڑھنے کے بعد اگر ایس پی یہاں نہ آیا ہوتا تو کیا ہوتا ۔ یہی ہوتا کہ ہم دونوں میاں بیوی کی طرح رہتے ۔ چلو یہ بھی اچھا ہوا کہ میر صاحب حرام زادے نے اُگل دیا کہ اس نے نکاح نہیں پڑھا ۔ میں بہت بڑے گناہ سے تو بچ گیا ۔ تو پھر اب شرع شریف کے مطابق یہ کام کیوں نہ کیا جائے - میں تم ہی سے پوچھتا ہوں“

”مجھے گھر جانے دیجئے“ زرّیں روندھی ہو کر بولی

”واہ صاحب - آپ بھی خوب ہیں - آخر آپ یہاں کیا کرنے آئی تھیں اپنی مرضی سے - اور میں آپ کو ایسے ہی کیوں چلا جانے دوں - بتایئے“

”اس لئے کہ میرا اور آپ کا عقد نہیں ہوا“ زرّیں نے کہا

”تو اب ہو جائے گا“ وہ بولے

”میں نکاح کے لئے راضی نہیں ہوں“

”تو پانچ سو روپے مہر معجّل کے جو میں نے دیئے تھے وہ کس لئے رکھ لئے؟“

”واپس لے لیجئے“ زرّیں نے کہا ”روپئے آپ ہی کے پاس ہیں“

چند منٹ تک شیر علی زرّیں کی صورت دیکھتے رہے پھر آہستہ سے ٹھنڈی سانس لے کر بولے

”ٹھیک ہے - جایئے - بے شک جایئے - پولیس کا ایک سخت گیر داروغہ آپ کو کوئی سزا دیئے

بغیر-کوئی بدلہ لئے بغیر آپ کو آسانی سے جانے دے رہا ہے۔ایسا بہت کم ہوتا ہے محترمہ-لیکن اگر آپ کے سینے میں دل ہے اور دل میں سچائی ہے تو سوچئے گا کہ میں نے ایسا کیوں کیا-اور آپ نے میرے ساتھ کیوں دھوکہ کیا-"

"آپ یقین کیجئے میں نے آپ کے ساتھ کوئی دھوکہ نہیں کیا" زرّیں سمجھانے لگی "جو کچھ ہوا یا میں نے کیا وہ آپ کے اور میرے دونوں کے حق میں بہتر ہے۔دیکھئے ہم دونوں کے آگے جوان اولاد ہے ہمیں ان کے گھر بسانے کی فکر کرنی چاہئے۔یہ بچّے ہمیں کیا کہیں گے-دنیا کیا کہے گی-ذرا سوچئے-میں نے تو آپ کے حاکم کے سامنے آپ کی عزّت بچالی ایک بدنامی سے آپ کو بچایا-آپ کی نیک نیتی پر حرف نہیں آنے دیا-میر صاحب کی ناراضگی کی کوئی پرواہ نہیں کی-تو پھر میں نے کیا آپ کو دھوکہ دیا؟"

"اوہ میرے خدا" شیر علی اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئے "سمجھ میں نہیں آتا میں کیا کروں-خدارا آپ چلی جایئے یہاں سے-خدا کے لئے-مجھے چھوڑ دیجئے-جایئے"

★★★

زرّیں رات میں اپنے گھر واپس آئی تو میر صاحب غصّہ میں بھرے بیٹھے تھے اُسے دیکھتے ہی چارپائی سے اُٹھ کر کھڑے ہو گئے اور بڑے طنزیہ لہجہ میں بولے

"آ گئیں پاکیزہ بیگم-مِل آئیں اپنے یار سے؟"

زرّیں نے کوئی جواب نہیں دیا ذرا دیر کو رک کر دُکھ بھری نظروں سے میر صاحب کی طرف دیکھا اور پھر اپنے کمرے کی طرف جانے لگی

"میری طرف گھور کر کیا دیکھتی ہے-بے شرم میں تیرے دیدے پھوڑ دوں گا۔بد ذات دھوکہ باز-تو نے سارا پلان چوپٹ کر دیا-حرام زادی"

"میں نے کیا کیا ہے-مجھ سے کیوں خفا ہیں؟" وہ رو پڑی

"اچھا اچھا" وہ بولے "ننّھی بیگم کو یہ نہیں معلوم کہ اُنھوں نے کیا کیا-آؤ آؤ ادھر آؤ-بتاؤں تم نے کیا کیا ہے"

ایک منٹ کو زرّیں رک کر کھڑی ہو گئی تو وہ پھر بولے "بے شرم حرّافہ-اگر تجھے اس شیطان کے گھر خوشی خوشی جانا تھا تو یہ ناٹک کرنے کی کیا ضرورت تھی-مجھے پہلے ہی بتا دیا ہوتا کہ تو اس کے ساتھ یارانہ بڑھا رہی ہے تو میں تجھے آزاد کر دیتا"

"آپ چپ بھی رہیں گے-میری بھی سنیں گے یا نہیں" وہ بولی

"اچھا بول کیا سناتی ہے-میں بھی تو سنوں کہ مجھے دھوکہ کیوں دیا"

"میں نے دھوکہ نہیں دیا" وہ بولی "میں تو اپنے قدیر کے لئے اس کی بیٹی سے رشتہ کی بات چیت کرنے گئی تھی"

"کیا-کیا-کیا؟" میر صاحب بولے "پہلے تو اِدھر آ-میں تیری ڈاکٹری کروں گا پھر بتاؤں گا کہ تو کتنی جھوٹی اور مکّار ہے"

میر صاحب نے زرّیں کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا پھر یوں ہی گھسیٹتے ہوئے لے جا کر کوٹھری میں پڑی ہوئی ایک چارپائی پر گرا دیا

"اب بول کتنے لونڈے پکڑ لاؤں تیرے لئے؟"

زرّیں سسکیاں لے لے کر رونے لگی مگر میر صاحب اس کے آنسوؤں سے بے پروا لپک کر دالان سے بہت سی موٹی موٹی ادوائن اُٹھا لائے اور زرّیں کو چارپائی پر ڈھکیل کر بولے "لیٹی رہ چپ چاپ۔اگر منھ سے آواز نکالی تو گلا گھونٹ دوں گا"

میر صاحب فرطِ غیض وغضب سے کانپتے ہوئے اُسے موٹی رسیّوں سے چارپائی سے باندھنے لگے۔زرّیں چپ چاپ لیٹی سسکیاں لیتی رہی مگر منھ سے ایک لفظ نہ بولی اور نہ کوئی احتجاج کیا۔میر صاحب اُسے خوب اچھی طرح رسیّوں میں جکڑ کر بولے

"اب بتا-کتنے مسٹنڈوں کی ضرورت ہے تجھے"

زرّیں نے کسی بات کا جواب نہیں دیا صرف بلک بلک کر روتی رہی مگر میر صاحب کا دل اس کی بے بسی اور بہتے ہوئے آنسوؤں پر کچھ بھی نہ پسیجا۔کچھ دیر کے لئے گھر سے باہر نکل کر اُنھوں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی کہ آس پاس کوئی دیکھ یا سُن تو نہیں رہا پھر وہ باورچی خانے سے مٹّی کے تیل کا بوتل اُٹھا لائے اور زرّیں کے اوپر تیل چھڑکنے لگے اس پر بھی زرّیں نے کوئی احتجاج نہیں کیا صرف بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ خوشامدانہ لہجہ میں بولی "مجھے یوں نہ جلایئے۔ خدا کے لئے-رسیّاں کھول دیجئے میں قسم کھاتی ہوں کہ میرے منھ سے کوئی آواز نہ نکلے گی۔کسی کو مدد کے لئے بھی نہ پکاروں گی"

میر صاحب پاگل ہو رہے تھے دانت پیس کر بولے

"چوپ-تجھے اسی طرح ختم ہونا ہے-ہرجائی بے وفائی کی یہی سزا ہے"

زرّیں نے روتے ہوئے ایک بار پھر کہا

"اس طرح چارپائی پر جل کر مروں گی تو دنیا والے آپ ہی کے اوپر شک کریں گے آپ مجھے کھول کر باہر چلے جایئے سچ کہتی ہوں میں خود اپنے آپ کو آگ لگا لوں گی"

میر صاحب پر تو جیسے بھوت سوار تھا اُنھوں نے زرّیں کی فریاد پر کوئی سماعت نہیں کی۔زرّیں

جس چار پائی پر رسیّوں سے بندھی پڑی تھی اس کے سرہانے میز کے اوپر اُنھوں نے ڈالڈا ٹین کا ایک ڈبّہ رکھا اور اس کے اوپر بغیر چمنی والا ایک چھوٹا سا چراغ لا کر جلا دیا پھر چراغ سے ایک پتلی ڈور باندھ کر اس کا دوسرا سرا زرّیں کے دونوں ہاتھوں میں لپیٹ دیا

''اِدھر دیکھ'' وہ بولے ''اگر تو نے اپنے کو رسیّوں سے آزاد کرانے کی کوشش میں ہاتھوں کو ذرا بھی جنبش دی تو یہ جلتا ہوا چراغ ٹین کے ڈبّہ سے لڑھک کر تیرے اوپر گر پڑے گا- آگے تو سوچ لے''

''آپ یہ سارے جتن کیوں کر رہے ہیں میں خود آپ کے سامنے آگ لگا لوں گی''

''نہیں-'' اُنھوں نے زور سے ڈانٹا'' مجھے گاؤں سے نکل جانے دے- اور سُن- میرا تیرا اب کوئی واسطہ نہیں رہا- میں تجھے آزاد کرتا ہوں''

زرّیں روتی رہی اور میر صاحب کوٹھری میں چھوٹا سا تالا بند کر کے چلے گئے۔

☆☆☆

داروغہ شیر علی کے خلاف ایس پی کان پور کو شکایتی درخواست دے کر گھر لوٹنے کے لئے جب قدیر چھّنی گنج کے بس اسٹیشن پر پہونچا تو اُسے خالو کرامت علی دکھائی دیئے جو ایک ٹی اسٹال پر کھڑے چائے پی رہے تھے۔ اس وقت وہ داڑھی مونچھوں سے بالکل آزاد کلین شیو اور بہترین گرم سوٹ و ٹائی میں کوئی اپٹوڈیٹ رئیس دکھائی دیتا تھا۔ چند لمحے تو قدیر کو اُسے پہچاننے میں تامّل ہوا کیوں کہ ابھی چند ہی روز پہلے جب اس نے کرامت علی کو اپنے گھر پر دیکھا تھا تو اس وقت وہ اتنا ماڈرن نہ تھا۔ قدیر دھیرے دھیرے اس کے پیچھے جا کر بولا

''معاف کیجئے گا جناب- شاید میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے''

''ارے- قدیر!'' کرامت اپنی آنکھوں پر چشمہ درست کرتے ہوئے بولا

''بیٹا میں تو مدنی پور تیرے ہی گھر جا رہا تھا۔ بس آنے میں دیر تھی اس لئے چائے پینے لگا۔ آؤ آؤ- تم بھی چائے پیو''

ارے خالو جان- مائی ڈیر انکل- ہاؤ ڈو یو ڈو'' قدیر ہنس کر بولا

''دیکھو قدیر- میری ٹھلّی مت اڑاؤ- بیٹا میں تمہارا خالو ہوں''

''ہاں بھائی'' قدیر ٹھنڈی سانس لے کر بولا ''مجھے تو اپنے آنکھوں پر سچ مچ ابھی بھی یقین نہیں آ رہا- ارے یہ ٹھاٹ باٹ- یہ کایا پلٹ لگتا ہے خالو کہیں کوئی لمبا ہاتھ مارا ہے''

''ارے بہت لمبا ہاتھ نہیں'' وہ بولا ''بس دو لاکھ کی لاٹری کُھلی ہے''

''خالو مجھے بھوک لگی ہے- چائے بسکٹ سے میرا پیٹ نہ بھرے گا'' قدیر نے کہا

کرامت علی قدیر کو روٹی والی گلی میں ایک ہوٹل میں لے گیا جہاں قدیر قورمہ، بریانی، کباب اور شاہی ٹکڑے کھا کر شکم سیر ہوا مگر کھاتے وقت یہ سوال برابر اس کے دماغ میں چکر کاٹتا رہا کہ خالو یک بیک اتنے امیر کیسے ہو گئے مگر اس بات پر اُسے زیادہ دیر تک غور و فکر نہیں کرنا پڑا فوراً ہی جو بات اُس کے ذہن میں اُبھری وہ سونے کے بسکٹوں اور مدنی پور میں عزیز بیگ کے قتل کی بات تھی۔ ان دونوں میں اُسے کرامت خالو کا ہاتھ بالکل صاف نظر آیا پھر بھی خالو کا دل ٹٹولنے کی خاطر اس نے ہوا میں تیر پھینکا۔

''خالو- جو آدمی راتوں رات پیسے والا بن جائے جانتے ہو اسے کیا کہتے ہیں؟''

''تم بتاؤ کیا کہتے ہیں''

''اُسے خالو کہتے ہیں''

یہ کہہ کر قدیر ہی ہی کر کے بناوٹی ہنسی ہنسا ''میں تو کہتا ہوں اچھا ہوا عزیز بیگ سالا مدنی پور آ کر گنگا کے کچھار میں جہنّم واصل ہوا۔ ارے کم از کم اپنے اچھے- پیارے پیارے خالو کو لکھ پتی تو بنا گیا''

''کون۔ کون- کون عزیز بیگ؟'' کرامت جلدی سے بولا

''آہاہا- کیسا ننھے نادان بن رہے ہو'' قدیر بولا ''مار کر لاش گنگا میں پھینکی اور سونے کے بسکٹ لے کر مدنی پور سے نو دو گیارہ ہو گئے- ارے واہ خالو''

''یہ تم کیا بک رہے ہو''

''بک نہیں رہا خالو'' قدیر بولا ''تمہیں چتاؤنی دے رہا ہوں عزیز بیگ کے قتل کی تفتیش زوروں پر ہے اور راتوں رات دولت مند بن جانے والے خالو جان داروغہ شیر علی کی نظروں سے بچ نہیں سکتے۔ اب تم نے مزیدار قورمہ بریانی کھلائی ہے نا تو اسی کا حق ادا کر رہا ہوں- بس ہوشیار ہو جاؤ خالو جان''

''ابے تو بول نا میں کیا کروں'' کرامت نے پوچھا

''تم یہ کرو کہ آدھے بسکٹ میرے حوالے کرو میں تمہیں داروغہ کے چنگل سے بچاؤں گا ورنہ خالو مدنی پور کا داروغہ بہت حرامی آدمی ہے تمہیں چھوڑے گا نہیں''

قدیر کا ہوائی تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا تھا۔ کرامت علی کسی انجانے خوف سے کانپ اُٹھا ''قدیر سچ سچ بتاؤ- تمہیں چھوڑ کر یہ بات اور کون کون جانتا ہے''

''میرے سوا اور کسی کو یہ نہیں معلوم کہ عزیز بیگ کو تم نے قتل کیا ہے''

''ارے- ارے دھیرے بول''

''اچھا اچھا'' قدیر نے کہا ''مگر زبان بند رکھنے کی قیمت- آدھے بسکٹ سمجھے؟''

قدیر اور کرامت علی کان پور سے ٹیکسی کر کے رات میں اس وقت مدنی پور پہونچے جب میر

فدا حسین زرّیں کو خودسوزی کے لئے ایک کوٹھری میں بند کر کے گاؤں سے بھاگ رہے تھے۔ جب ان دونوں کی ٹیکسی مدنی پور کے بس اسٹاپ پر پہونچی تو اس وقت میر صاحب بس کے اندر بیٹھ چکے تھے اس لئے ان دونوں کو اُنھوں نے ٹیکسی سے اترتے نہیں دیکھا۔

میر صاحب کے جانے کے آدھے گھنٹے تک زرّیں چپ چاپ چارپائی پر لیٹی رہی اس عرصہ میں اس نے اپنے آپ کو رسیّوں سے آزاد کرانے کی کوشش بھی نہیں کی کیونکہ بغیر شیشے کا لیمپ ذرا سا ملنے میں اس کے اوپر گر پڑتا۔ اس نے مدد کے لئے کوئی شور وغل بھی نہیں کیا۔ کہتے ہیں جب جان پر آ بنتی ہے تو عقل تیزی سے کام کرنے لگتی ہے۔ زرّیں نے اتنے وقفہ میں اپنی جان بچانے کی تدبیر سوچ لی۔ اُس نے لیٹے ہی لیٹے پہلے لیمپ کی لو میں زور سے پھونک ماری - لو تھرتھرائی اور پھر سیدھی ہوگئی مگر دو تین بار کی پھونکوں نے لیمپ کی لو بجھادی - زرّیں نے اپنے کو رسیّوں سے آزاد کرلیا۔

کچھ دیر بعد جب قدیر اور کرامت علی وہاں آئے تو کھلے گھر میں سناٹا دیکھ کر قدیر کو تشویش ہوئی۔ اُس نے آواز دے کر ماں کو پکارا تو زرّیں کوٹھری کے اندر سے بولی

''بیٹا - کوٹھری میں باہر سے تالا بند ہے کیا؟''

''ہاں امّاں - یہ تالا کس نے بند کیا ہے؟''

''کون بند کرے گا میر صاحب بھولے سے بند کر گئے ہوں گے۔ میں ذرا دیر کو کوٹھری کے اندر آ کر لیٹی تھے کہ آنکھ لگ گئی''

تھوڑی سی محنت کے بعد دونوں نے کوٹھری کا تالا باہر سے کھول لیا

''زرّو! تیری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' کرامت نے پوچھا

زرّیں کو اس وقت کرامت علی کا آنا اچھا نہیں لگا وہ خاموش رہی

''کہاں گئے ہیں میاں؟'' قدیر نے پوچھا

''مجھے بتا کر نہیں گئے'' وہ بولی ''ہوسکتا ہے جائس چلے گئے ہوں''

''چلو آج بھی تمہارا کام نہ ہو پائے گا خالو''

''کوئی بات نہیں'' کرامت بولا ''میں ان کے واپس آنے تک یہیں ٹھہر جاؤں گا''

''کیا پتہ وہ کب تک لوٹیں'' زرّیں نے کہا ''اُن کا کوئی ٹھیک نہیں''

''ہاں خالو - میری رائے میں تو تم یہاں رکنے کے بجائے جائس چلے جاؤ'' پھر بڑی رازداری سے بولا ''اور سالا داروغہ یہاں کا ایک حرامی ہے اس نے آپ کو یہاں دیکھ لیا تو چھوڑے گا نہیں''

''اُسے مجھ پر شک ہے کیا؟''

''ہاں، ہاں'' قدیر جلدی سے بولا

''تم نے یہ بات مجھے کان پور میں کیوں نہیں بتائی - میں یہاں تک آتا ہی نہیں'' کرامت نے کہا

''ارے تو اب راتوں رات یہاں سے نکل لو - کسی نے آپ کو یہاں دیکھا بھی نہیں''

''اچھا - میں جارہا ہوں'' کرامت بولا ''مگر تم بھی ذرا خیال رکھنا میرا''

''تم گھبراؤ نہیں خالو'' قدیر نے کہا ''بس آدھے سکٹ مجھے چاہئیں''

کرامت آگے کچھ بولے بغیر چپ چاپ چلا گیا۔

مدنی پور کے ریلوے اسٹیشن پر دس بجے رات والی ٹرین پکڑنے کے لئے کرامت علی اکیلا ہی اسٹیشن پہونچ گیا۔ رات کا وقت ہونے کی وجہ سے وہاں بالکل سناٹا تھا مگر اتفاق سے مدنی پور تھانہ کے انچارج شیر علی کان پور جانے کے لئے دو سپاہیوں کے ساتھ وہاں پہلے سے موجود تھے جن سے بالکل اتفاقی طور پر کرامت کی نظریں چار ہوگئیں اور وہ خوف سے سر سے پیر تک کانپ اُٹھا - پتہ نہیں شیر علی نے اُسے پہلی نظر میں پہچانا یا نہیں مگر جب کرامت نے گھبرا کر اُسے مودّبانہ سلام کیا تو شیر علی نے اخلاقاً ذرا سا مسکرا کر اپنے سر کو اس طرح جنبش دی جیسے اُنھوں نے اس کا سلام قبول کرلیا ہو پھر تھوڑی دیر تک اُنھوں نے کرامت کے چہرے کو بغور دیکھا تو اُسے یقین کامل ہوگیا کہ داروغہ نے اُسے پہچان لیا ہے - اُس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں - شیر علی فوراً ہی بولے

''معاف کیجئے گا جناب میں نے آپ کو پہچانا نہیں'' کرامت کا حلیہ پہلے سے بہتر ہوگیا تھا کرامت کی جان میں جان آئی اپنی بدحواسی پر قابو پا کر بولا

''میں شیخ کرامت علی ہوں'' وہ بولا ''آپ نے مجھے میر فدا حسین کے مکان پر دیکھا تھا''

میر فدا حسین کا نام سنتے ہی شیر علی سلگ اُٹھے

''ہوں - اچھا اچھا''

شیر علی کی نظروں میں وہ رومانی منظر گھوم گیا جب کرامت نے چارپائی پر لیٹے لیٹے زرّیں کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹا تھا اور وہ چپ چاپ اُس کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھی۔ شیر علی کے لئے اس دل آزار منظر کا تصور ویسے بھی خوش آیند نہ تھا اس پر سے وہ رقیب روسیاہ سامنے کھڑا نہ جانے کس خوشنودی میں اُن سے ہمکلام ہورہا تھا۔

''یاد آ گیا آپ کو؟''

''بالکل یاد آ گیا شیخ صاحب'' شیر علی طنزیہ لہجے میں بولے ''وہ پنچ لڑی بھی یاد آ گئی جو آپ نے اپنی سالی کو پہنائی تھی - کیوں؟ - اسی چکر میں آئے ہیں نا''

''ارے نہیں داروغہ صاحب'' وہ بولا ''آپ تو خواہ مخواہ مجھ پر شک کر رہے ہیں''

شیر علی کو غصّہ تو شیروں جیسا آ ہی گیا تھا مگر اسٹیشن پر لائین کلیر کی گھنٹی بجنے لگی تو وہ زبردستی مسکرا کر بولے

''ارے چھوڑو میاں جی- اب تو ہم اور آپ بہت جلد ہم زلف ہونے جا رہے ہیں''

''کیا ہونے جا رہے ہیں؟'' کرامت ہم زلف کا مطلب سمجھے بغیر خوش ہو کر بولا

''ہم زلف- یعنی ساڑھو بھائی'' پھر فوراً ہی شیر علی نے ایک شعر پڑھا

''ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے- سب اُسی زلف کے اسیر ہوئے''

اس شعر کا مطلب بھی کرامت کی سمجھ میں نہیں آیا پھر بھی وہ دل ہی دل کوئی مطلب سمجھ کر بڑبڑایا

''سالا میر صاحب''

آوٹر سگنل پر انجن کی تیز روشنی دیکھ کر شیر علی جاتے جاتے بولے

''یار شادی ہو رہی ہے ایں جانب کی- ملاّ جی کو لانے کے لئے کانپور جا رہا ہوں''

''ارے کہاں؟- ہو رہی ہے شادی؟'' کرامت پوچھ بیٹھا

''وہیں وہیں- جہاں تمہاری رال ٹپک رہی ہے شیخ جی''

شیر علی کو اس نے دور تک پلیٹ فارم پر جاتا دیکھا- سوچتا رہا کہ سالا کیا کہہ گیا ہے- کہیں وہ زرّو پر ڈورے تو نہیں ڈال رہا- اُسے شیر علی کے لئے کوئی موٹی تگڑی گالی بھی اس وقت نہ یاد آئی کیونکہ ٹرین پلیٹ فارم پر آ گئی تھی- اور وہ ٹرین پر بیٹھ کر سوچنے لگا- لگتا ہے داروغہ کو مجھ پر قتل کا شک نہیں ہے۔ قدیر جھوٹا ہے- وہ بسکٹ اینٹھنے کے لئے یہ چال چل رہا ہے مگر میں بھی بچّو کو وہ سبق دوں گا کہ یاد کرتا رہے گا۔

☆☆☆

جائس میں بڑی حویلی والی سیدانی زہرابی کو ایک روز نادرہ نائین نے آ کر بتایا کہ ان کے پڑوسی اور قریبی رشتہ دار ہادی میاں نے اپنے اکلوتے بیٹے وقار کے لئے لاڈلی کو پسند کیا ہے اگر اُنھیں یہ رشتہ منظور ہو تو ہاں کر دیں تا کہ اس رشتے کی خواستگاری کے لئے وہ کسی روز خود زہرابی سے ملنے آویں۔ دراصل وہ اس بارے میں پہلے زہرابی کا عندیہ معلوم کرنا چاہتے تھے۔ زہرابی بھلا اس خوبصورت رشتے کو کیسے ٹھکراتیں۔ زمیندارانہ ماحول میں پرورش پائے ہوئے اس قصبہ کو معاشی بُحران نے اتنا پسماندہ و بے حال کر دیا تھا کہ اب بڑے بڑے عالی نسب اور نجیب الطرفین اپنی بیٹیوں کے لئے آئے ہوئے رشتوں میں کسی طرح کی نسلی یا نسبی کھوٹ کی ان دیکھی کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ صورت حال یہ تھی کہ ایک لڑکی کے لئے بس دال روٹی کھانے کھلانے والا لڑکا ہی اچھے رشتہ کا واحد معیار رہ گیا تھا۔ اس لئے

زہرابی نے جب نادرہ کی زبانی یہ پیغام سنا تو اسے ایک مژدۂ جانفزا ہی سمجھا مگر اپنی خوشی کو قابو میں رکھتے ہوئے نائین کو جواب دیا

''ندّو اب میں کیا بتاؤں- وہ تو یہاں ہیں نہیں کہ ان سے رائے مشورہ کروں۔ ہادی بھی تو کوئی پرائے نہیں میرے ماموں کے لڑکے ہی تو ہیں جو کچھ وہ طے کریں گے مجھے کبھی انکار نہ ہو گا- میری طرف سے تو ہاں سمجھو''

''چلو بی اللہ مبارک کرے'' نادرہ نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھائے پھر جھک کر کان میں بولی ''سو میں ہزار میں ایک لڑکا ہے۔ ذات پات بھی دیکھنا نہیں، بس سمجھو بی بی کہ تمہاری بیٹی راج کرے گی راج''

''تیرے منہ میں گھی شکر ندّو'' پھر کچھ اداس ہو کر بولیں ''کیا کروں بہن مولا نے اپنی کوکھ سونی رکھی (بہت دھیرے سے) اپنے پیٹ سے نہ سہی ہے تو کم بخت اُنھیں کی نشانی، اپنے ہی جگر کے ٹکڑے کی طرح جھک مار کر ماننا ہی پڑے گا- کہ جھوٹ کہتی ہوں ندّو؟''

''نہیں نہیں بی بی- ٹھیک کہتی ہو'' ندّو اُٹھتے ہوئے بولی ''اچھا اب چلوں گی لاؤ بتیس آنے میرا حق دے دو اور ایک چھوٹی سی گلوری پان کی دے دو تو جاؤں''

زہرابی نے نادرہ کو اس کا حق دے کر تاکید کی

''تم کہہ دینا ہادی سے کہ جب اُن کا جی ہو آ جائیں- اُن کا گھر ہے یہ''

اس کے دو دن بعد سید ہادی نے حویلی کی ڈیوڑھی میں آ کر زہرا بجّو کو آواز دی تو وہ خوشی خوشی لپک کر دہلیز میں آ گئیں اور سر پر ڈوپٹہ برابر کرتے ہوئے بولیں

''اے ہادی- میں پوچھتی ہوں بھیّا- یہ تم اتنے غیر کب سے ہو گئے کہ ڈیوڑھی میں کھڑے کھڑے آواز دو- اچھن ماموں جب تک زندہ رہے کبھی پکار کر گھر میں نہیں آئے۔ بس کھنکھارا اور دروازہ کھول کر آ گئے- چلو آؤ- اندر آؤ- آج کتنے دنوں بعد میری یاد آئی ہے تمہیں۔''

''بس اسی لئے یاد نہیں آتی'' ہادی ان کے پیچھے پیچھے گھر کے اندر آئے ''تمہاری پرانی عادت شکوہ شکایت کی ہے اور مجھے ہوتی ہے الجھن- خیر- کہنے یہ آیا ہوں کہ ندّو کو پرسوں میں نے تمہارے پاس بھیجا تھا تو اس بارے میں تم نے کیا سوچا کیا طے کیا''

'دا ے لو- تو کیا ندّو نے تم سے کچھ بتایا نہیں؟'' زہرابی نے پوچھا

''دیکھو بجّو میں بہت صاف گو آدمی ہوں۔ جو دل میں ہوتا ہے وہی زبان پر بھی اسی لئے لوگ مجھے اکھّڑ اور بد مزاج سمجھتے ہیں- اب ندّو نے تو یہ بتایا کہ جو ہادی طے کر دیں گے وہ مجھے بھی منظور ہو گا''

''ہاں ہاں- کہا ہے میں نے'' وہ بولیں

''بجّو - دیکھو مجھے لگی لپٹی نہیں آتی۔ بڑی چڑھ ہے مجھے اس سے - تم تو ہاں ہاں کرکے چپ ہوگئیں مگر میں تو صاف بات کہوں گا۔ عورت ذات کی بات ٹھہری میں کچھ طے کروں اور کل کو تم یہ کہہ دو کہ میں نے ایسا کب کہا تھا۔ تو پھر میری عزّت خاک میں مل جائے گی کہ نہیں - بولو - سب لوگ مجھ ہی کو کہیں گے۔ اس لئے اچھا ہے کہ جو بات ہو وہ منہ در منہ ہو - یا تو فدّن بھائی کو آ جانے دو یا پھر برادری کے دو چار لوگوں کے سامنے سب کچھ طے ہو جائے''

زہرابی ایسا بالکل نہیں چاہتی تھیں کہ لاڈلی کا رشتہ طے ہونے سے پہلے خاندان یا رشتہ داروں میں بات پھیل جائے کیونکہ معاملہ ایک ایسی لڑکی کے رشتے کا تھا جس کے بارے میں سبھوں کو اتنا علم ضرور تھا کہ وہ زہرابی کے پیٹ سے پیدا نہیں ہوئی تھی تو اسے طشت از بام کرنا نہیں چاہتی تھیں اس لئے بڑی نرمی سے بولیں۔

''ارے تو وہ بھی دو چار دن میں آ جائیں گے - پہلے تم یہ بتاؤ کہ رشتے کی بات پکّی سمجھوں نا؟''

''اُفّوہ'' وہ بولے ''بس یہی سب باتیں مجھے پسند نہیں - تم کیا سمجھتی ہو میں تمہیں اسٹامپ کاغذ پر اقرار نامہ لکھ کر دوں گا - دو عزّت داروں کے بیچ باتیں ہوگئیں تو ہوگئیں۔''

'دہاں ہاں تم ٹھیک کہتے ہو ہادی'' زہرابی نے کہا ''عزّت داروں کی زبان ہی سب کچھ ہوتی ہے - اب تمہیں جو کہنا سننا ہو وہ بتادو''

''کیا بتادوں - مجھے کچھ کہنا سننا نہیں'' ہادی بولے ''اور قرابت داروں میں کچھ طے تمام نہیں کیا جاتا۔ سمجھیں؟ - میں دان دہیج کے بارے میں کہہ رہا ہوں بجّو - تم کچھ دو یا نہ دو مگر میں تو اپنے بارے میں پہلے بتادوں کہ میرا ہاتھ بالکل خالی ہے۔ کوئی دھوم دھڑ کا نہیں ہوگا سمجھ لو''

''تم نے تو میرے منہ کی بات چھین لی ہادی'' زہرابی بولیں ''مجھے بھی دھوم دھڑ کا اچھا نہیں لگتا - اور مقامی شادی میں بارات کا کھانا وانا بھی نہیں ہوتا مجھے بھی آسانی رہے گی''

''ہاں ہاں جانتا ہوں'' وہ بولے ''بارات نہ لاؤں گا تو باجہ اور آتش بازی بھی نہ رہے گی''

''اوئی لوگو'' وہ اپنی انگشت شہادت کو ناک پر مار کر بولیں ''ارے باجہ نہ لاؤ گے تماشہ نہ چھڑاؤ گے تو میرے دروازے پر رونق کیسے ہوگی ہادی؟''

''اپنے دروازے پر رونق کی بات تم خود سوچو'' ہادی نے کہا ''میں تو باجہ لاؤں گا نہیں کیونکہ لکھنؤ کے قبلہ و کعبہ نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ جہاں باجہ بجے گا وہ نکاح نہیں پڑھیں تو بجّو مجھے کیا پاگل کتّے نے کاٹا ہے جو شرع کے خلاف کام کروں''

زہرابی نے اس بات پر بالکل لاجواب ہونے سے بچنے کے لئے آخری بار ہاتھ پاؤں مارے ''ارے تو نکاح ہی کی بات ہے تو مولوی اطّن سے پڑھا لینا اُنھیں باجہ گاجہ پر اعتراض نہیں

ہوتا اور جس جس کا نکاح اُنھوں نے پڑھا ہے سب ہی ہرے بھرے خوشحال ہیں''

''ہاں ہاں آپ لڑکی کی طرف سے اُنھیں کو وکیل بنا لیجئے مجھے کوئی اعتراض نہیں - مگر بجّو میں پھر بتادوں کہ باجہ میں نہیں لاؤں گا - بس''

''ارے تو جیسا تم کہو گے وہی ہوگا بھیّا'' - میں ٹھہری عورت ذات میری اتنی عقل کہاں''

ہادی میاں جاتے جاتے زہرابی کو یہ بھی کہہ گئے کہ وہ لاڈلی کا اُن کے گھر میں آنا جانا کچھ دنوں کے لئے بند کرادیں کیونکہ اب اس گھر میں وہ دولہن بن کے جانے والی ہے۔

شام کو زہرابھی کے بھتیجے ماجد عرف مِکّی میاں لاڈلی کو انگریزی پڑھانے آئے تو زہرابی نے اُنھیں منع کردیا کہ اب آگے سے وہ لاڈلی کو ٹیوشن پڑھانے کے لئے نہ آیا کریں کیونکہ بہت جلد اس کی شادی ہونے والی ہے۔ ماجد میاں کے لئے یہ خبر بڑی روح فرسا اور اتنی ناخوشگوار تھی کہ اسے سنتے ہی ان کا جی چاہا کہ اپنے پھوپھی جان کا منہ نوچ لیں۔ اُنھوں نے اپنی بے ہنگم مونچھوں کو بلاوجہ مروڑتے ہوئے تند لہجے میں پوچھا ''کہاں ہو رہی ہے شادی؟''

''وقّن کے ساتھ'' وہ خوشی خوشی بولیں

''وقّن کے ساتھ!'' وہ سرتا پا جل بجھے ''میں ابھی جا کر ہدّو چچا کو لاڈلی کا پورا پورا جغرافیہ سمجھائے دیتا ہوں - پھر دیکھتا ہوں کیسے ہوتی ہے یہ شادی''

''اے تیرا سر پھر گیا ہے مِکّی'' وہ تڑپ کر بولیں ''کیا کہو گے - کیا سمجھاؤ گے؟ ذرا میں بھی تو سنوں''

ماجد سانپ کی طرح پھنکار کر بولے ''میں یہ سمجھاؤں گا کہ لاڈلی فدّن پھوپھا کی نا تحقیق اولاد ہے - جایئے میرا جو بگاڑنا ہو بگاڑ لیجئے''

''ارے ارے ارے'' زہرابی کو بھی غصّہ آ گیا ''یہ طنطنہ کس کو دکھا رہا ہے تو - دوسرے کے پھٹے میں ٹانگ گھسیڑ رہا ہے اور اوپر سے تیہا بھی دکھاتا ہے - میں پوچھتی ہوں کہ لاڈلی کی شادی وقّن کے ساتھ ہو رہی ہے تو تیرے کلیجے میں ہُوک کیوں اٹھی - تو کیوں مرا جاتا ہے۔ کیا مطلب ہے تجھ سے - چل جا یہاں سے'' زہرابی کا پارہ کافی چڑھ گیا

ماجد میاں اسی جوش و خروش سے سیدھے ہادی صاحب کے گھر پہنچ گئے وہ اس وقت نہانے میں مصروف تھے۔ اپنے کو ''ہٹ یوگی'' کہتے تھے اس لئے جاڑوں میں سورج غروب ہونے کے بعد، گرمیوں میں عین دوپہر کو اور برسات میں بالکل نہیں نہاتے تھے۔ جتنی دیر وہ نہاتے رہے اُتنی دیر وہ سکینہ سے باتیں کرتے رہے اور شادی کو معلوم کرکے نصیحت کرتے رہے۔

''آپ ہدّو چچا کو سمجھایئے کہ کیوں اپنی ہڈّی خراب کرتے ہیں - وقّن اور لاڈلی کا کوئی جوڑ نہیں ہے ایک مسجد کی اینٹ ہے اور دوسری سنڈاس کی''

’’دیکھو ممّی - تم نے مجھ سے تو یہ بات کہی ہے لیکن ابّا کے سامنے ہرگز نہ کہنا وہ بہت برا مانیں گے‘‘

’’کیوں برا مانیں گے -‘‘ ممّی بولے ’’حق بات کہنا برا ہے کیا - اور برا ہے تو مانا کریں برا، ٹھینگے سے۔ میں تو ضرور کہوں گا - اور کیا آپ کو نہیں معلوم کہ لاڈلی کے ماں باپ کا کوئی اتہ پتہ نہیں - کہ غلط کہتا ہوں - تو پھر جان بوجھ کر زندہ مکّھی نگلنے میں کون سی عقلمندی ہے۔ آپ خود سوچئے‘‘

’’اُفّوہ - تم اتنی زور زور سے کیوں بول رہے ہو‘‘ سکینہ نے کہا ’’تھوڑی دیر صبر کرو ابّا نہا کر نکلیں تو جو جی میں آئے کہہ دینا‘‘

ہادی میاں کھارے پانی سے نہا کر نکلے تو ممّی کو بیٹھا دیکھا مگر ان سے مخاطب ہونے کے بجائے ہادی سکینہ سے بولے ’’چائے لے آؤ بیٹی‘‘

’’اتنی ٹھنڈک میں آپ کو جاڑا لگ رہا ہوگا‘‘ ممّی نے ان کی چاپلوسی کی

’’تم کیسے آئے؟‘‘ ہادی نے ممّی کی چاپلوسی کا کوئی نوٹس نہیں لیا

’’میں نے سنا ہے کہ آپ وقّن کی شادی لاڈلی کے ساتھ کر رہے ہیں - یہ سچ ہے کیا؟‘‘

’’کیوں؟‘‘ اُنھوں نے بھویں سکوڑیں ’’تم یہ بات کیوں پوچھ رہے ہو؟‘‘

’’جی!‘‘ وہ گھبرا کر بولا ’’ویسے ہی پوچھ رہا ہوں‘‘

’’کیوں ویسے ہی پوچھ رہے ہو؟‘‘ ہادی نواڑ کی مسہری پر پالتھی مار کے بیٹھ گئے ’’صاحبزادے تم یہ بات اس لئے پوچھ رہے ہو کہ وقّن کے ساتھ تمہاری بہن کے رشتے کی بات پر ابھی تک میں نے ہاں یا نا نہیں کہا۔ تم چلے ہو میرے دل کا بھید لینے - کیوں؟‘‘

’’میں نے تو ابھی پوری بات بھی نہیں کہی - آپ خواہ مخواہ شک کرنے لگے‘‘

’’بیٹا - میں صورت ہی سے بکلوس لگتا ہوں ورنہ اس قصبہ میں مجھ جیسا سمجھدار ایک نہ ملے گا۔‘‘

سکینہ نے چائے کی ٹرے لاکر مسہری پر رکھ دی ہادی نے ایک پیالی ماجد کی طرف بڑھائی

’’لو - اور اب سمجھاؤ پوری بات کیا کہنا چاہتے ہو‘‘

’’میں کچھ کہنا نہیں چاہتا‘‘ ماجد کھڑا ہو گیا ’’آپ ضرورت سے زیادہ عقلمند ہیں‘‘

ہادی صاحب کے حکم کے مطابق اس روز سے زہرابی نے لاڈلی پر یہ بندش عاید کر دی تھی کہ وہ اپنی چھت پر سے ہادی کے کوٹھے پر مت جھانکے اور نہ پڑوس میں کہیں آئے جائے اس لئے اس رات کو وقار کئی بار اپنی چھت پر گیا اور گھنٹوں لاڈلی کا انتظار کرتا رہا لیکن وہ اوپر نہیں آئی اس کی اس بے چینی اور تڑپن کو دیکھ کر سکینہ محظوظ ہوتی رہی۔ آخر ایک بار اُس نے وقار کو لاڈلی کی چھت پر چھوٹے چھوٹے ڈھیلے پھینکتے دیکھ لیا

’’اوہو وقن یہ کیا کر رہے ہو؟‘‘ اُس نے چپکے سے سمجھایا ’’ارے اتنی تڑپن اچھی نہیں۔ چلو

چل کے لیٹ جاؤ ورنہ ابّا کو بھنک لگ گئی تو سارا کھیل چوپٹ ہو جائے گا‘‘

’’اَپیا! - کہیں لاڈلی کی طبیعت تو خراب نہیں ہو گئی‘‘ وہ بڑی معصومیت سے بولا

’’اُفّوہ بھئی‘‘ سکینہ بولی ’’تم کتنے بے صبرے ہو گئے ہو اتنی بے تابی کس لئے ہے‘‘

’’اپیا - اگر تھوڑی دیر تم یہیں کھڑی رہو تو میں دیوار پھاند کر اس کی چھت پر چلا جاؤں‘‘

’’اونہک‘‘ سکینہ نے انکار کیا

’’پلیز اپیا‘‘ وقار لجاجت سے بولا

’’دیکھو - یہ بات ٹھیک نہیں‘‘ سکینہ نے سمجھایا ’’تم نہیں سمجھتے وقن بات کھل گئی تو بہت برا ہوگا - تمہاری بدنامی بھی ہوگی اور تم سے زیادہ لاڈلی کی - ارے دو ہی چار دنوں کی تو بات ہے - اپنے دل کو تھوڑا سمجھاؤ‘‘ اتنا کہہ کر وہ کھل کھلا کر ہنسی

’’ہنس لو - ہنس لو‘‘ وہ بولا ’’میرا ساتھ نہیں دے رہی ہو اور اوپر سے میرا مذاق اڑا رہی ہو - یہ کوئی اچھی بات نہیں اپیا‘‘

’’میرے بھیّا - میں تمہارا ساتھ نہ دیتی تو لاڈلی کے ساتھ رشتہ کیسے لگتا‘‘ وہ بولی

’’اچھا تو ایک کام کرو‘‘ وقار دھیرے سے بولا ’’تم خود اس کے گھر چلی جاؤ اور چپکے سے اُس کو چھت پر بھیج دو - کسی بہانے سے‘‘

’’اب تم مار کھا جاؤ گے وقن‘‘ سکینہ بولی ’’اب چپکے سے کھسک جاؤ یہاں سے‘‘

☆ ☆ ☆

ماجد میاں عرف ممّی نے جائس کے سارے دھوبیوں، کاسہ گروں، کمہاروں اور بیلداروں کو پیسے دے کر ان کے گدھوں اور خچّروں کو کرایہ پر لیا اور ایک بڑا لمبا جلوس ان جانوروں کا تیار کیا پھر ان میں سب سے اونچے گدھے کو پھول کی مالاؤں سے مزیّن کر کے آگے کیا اور ایک تختی پر یہ عبارت جلی حرفوں سے لکھ کر اس کی گردن میں لٹکا دیا

’’بھائیو یہ گدھا شادی کرنے جا رہا ہے۔ اسے آفریں کہو اور آشیرواد دو‘‘

ایک لڑکا کرائے کا ریشمی چھتّر اس کے سر پر لگا کر ساتھ ہو لیا۔ ڈھول تاشہ کے ساتھ گدھوں کی بارات معیّنہ پروگرام کے مطابق ہادی صاحب کے گھر کے سامنے پہونچ کر رک گئی۔ جب آدھے گھنٹے تک ڈھول تاشے کا شور اور دور دور سے اکٹھا ہوئے لڑکوں کی بھیڑ ہادی کے گھر کے سامنے جمی رہی تو وہ گھر سے باہر نکلے - گدھوں کے جلوس کا یہ عجیب و غریب منظر از خود ملاحظہ فرمایا - گدھوں کی گنتی کی تو

تعداد ستّائیس نکلی۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ بولے

’’آؤ آؤ – میرے بچّو – لاڈلو – یہ تماشہ ہمیں بھی دکھاؤ‘‘

اور دوسرے لڑکے تو ہادی کی بات سن کر کچھ نہیں بولے مگر وہ لڑکا جو دولھا گدھے پر چھتر لگائے چل رہا تھا اور جسے ماجد میاں ایک روپیہ نقد اور آدھ پاؤ جلیبی کا لالچ دے کر لائے تھے اُس نے سمجھائے پروگرام کے تحت ایک کاغذ ہادی کو دیا جس میں لکھا تھا

’’اس دولھا گدھے کا باپ گم ہو گیا ہے اور ہم اُسے ڈھونڈنے نکلے ہیں جب تک بڑ کا گدھا نہیں مل جاتا پورے قصبہ کے گدھے بھوک ہڑتال پر رہیں گے – پتہ چلا ہے کہ اس دولھا گدھے کا باپ آپ کے گھر میں ہے – اس کو بولئے کہ باہر آئے‘‘

ہادی میاں کی اس ایک خصوصیت سے بہت کم لوگ واقف تھے کہ ان کی زبان پر جو کچھ ہوتا ہے وہ بیشتر ان کے دل میں نہیں ہوتا اور یہ کہ وہ ہمیشہ ایسا ہی کام کرنا چاہتے ہیں جو عام حالات میں لوگوں سے نہ ہو سکے اس لئے جب اُنھوں نے اس لڑکے کی صورت دیکھی تو فوراً یہ سمجھ گئے کہ لڑکا سیدھا اور بے قصور ہے اور یقیناً اس ’’گدھے پن‘‘ میں ضرور کسی دوسرے کا ہاتھ ہے۔ کاغذ پڑھنے کے بعد ہادی نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور لڑکے سے بولے

’’ہہ ہہ ہہ!!! – ارے تو سمجھو وہ باہر آ گیا – ہاں بولو بیٹا‘‘

’’سلام وعلیکم‘‘ لڑکے نے اپنا اُلٹا ہاتھ ماتھے پر چھوایا

’’آؤ بیٹا آؤ‘‘ ہادی بڑے پیار سے بولے ’’ان جانوروں کو یہیں رہنے دو – اور تم میرے ساتھ اندر چلو – ارے تو جگّن نائی کا لونڈا ہے نا؟‘‘

’’ہاں میاں – کدّو نام ہے اپن کا‘‘

لڑکے کو اندر لے جا کر ہادی نے ایک پلیٹ میں چنا لائی چیوڑا اور گڑ کی بوندیاں اُسے کھانے کو دیں اور پیار سے پوچھا

’’تو تو بڑا پیارا لڑکا ہے – یہ چھتّر تجھے کس نے دیا تھا بہت خوبصورت ہے‘‘

لڑکا گڑ کی بوندیاں کھاتے ہوئے بولا

’’جس نے دیا ہے اس نے منع کیا ہے کہ نام نہ بتانا‘‘

’’ارے تو نام نہ بتا – مگر یہ تو بتا دے کہ دیا کس نے ہے‘‘

لڑکا پلیٹ چھوڑ کر کھڑا ہو گیا ’’ہم نہیں کھائیں کے آپ کا سامان‘‘

’’کیوں – کیوں؟‘‘

’’ہمیں ماریں گے‘‘ وہ بولا

’’کون مارے گا؟‘‘ ہادی نے پوچھا ’’ہمارے پیارے کدّو کریلا کو کون مار سکتا ہے؟‘‘

’’ملّھی میاں‘‘ وہ جلدی میں بتا گیا مگر پھر فوراً ہی بولا ’’نہیں – کوئی نہیں‘‘

ہادی سمجھ گئے کہ یہ حرکت ملّی کی ہے وہی وقّن کی شادی کی بات سن کر اونچ نیچ سمجھانے آیا تھا۔ لڑکے کو پھر بٹھا کر ہادی میاں نے اپنے نوکر سے کہا کہ تین بوریاں ولایتی کھاد سوڈیم نائٹریٹ کی کوٹھری میں رکھی ہیں اُسے گُڑ کے ساتھ بالٹیوں میں گھول کر باہر کھڑے ہوئے سارے گدھوں کو زبردستی دو دو لوٹا پلا دے – یہ انوکھا شربت پی کر وہ بے زبان جانور اپنے اپنے مستقر پر پہونچے تو شربتی جلّاب نے ان کی آنتوں کی دُھلائی پر گھر بھر میں وہ چھیچھا لیدر مچائی کہ سارے مالکان خر گھبرا کر مویشی ڈاکٹر بانکے بہاری کے پاس بھاگے۔ زندگی میں شاید پہلی بار ڈاکٹر بانکے بہاری گدھوں کی اس آسمانی وبا پر دس دس روپے فی گدھا اپنی فیس اور اتنے ہی روپے دوا کے وصول کرنے کے بعد پانچ چھ سو روپے کما لئے۔

★★★

وقّن کی شادی کا صرف چرچا ہی چرچا چاروں طرف تھا کیوں کہ ہادی کے گھر میں اس تقریب کا کچھ بھی نہ انتظام ہو رہا تھا اور نہ کوئی گہما گہمی تھی۔ کپڑوں کی خریداری نہ دعوت ولیمہ کا اہتمام اور نہ ان سب کا کوئی تذکرہ۔ ہاں گھر کی دیواروں پر چونے کی سفیدی اور کچھ چارپائیوں کی بنائی ضرور ہو رہی تھی۔ شادی کو جب دو دن رہ گئے تو سکینہ نے باپ سے پوچھا

’’ابّا – یہ کیسی شادی ہو رہی ہے گھر میں – کوئی بھی تو انتظام نہیں ہو رہا رشتہ داروں کو بھی نوید نہ گئی ہو گی آخر کیا سوچا ہے آپ نے؟‘‘

’’تم فکر نہ کرو سکینہ‘‘ ہادی نے سمجھایا ’’میں نے زہرا بجّو سے صاف صاف بتا دیا ہے کہ میں کوئی ٹیم ٹام شادی میں نہ کروں گا۔ ارے بھائی یہ دوسری شادی ہے نا رشتہ داروں کو بلا کر خواہ مخواہ زیر باری میں پڑنا کونسی عقلمندی ہے۔ اوّل تو مجھے جہیز یا نقدی لینا نہیں تو پھر اپنا پیسہ کیوں پھونکوں – اور سب سے بڑی بات یہ کہ روپے میرے پاس ہیں کہاں‘‘

’’ابّا – مگر یہ تو بڑی سونی سونی شادی ہو گی – مجھے اچھا نہیں لگتا‘‘ سکینہ بولی

’’دیکھو بیٹی‘‘ اُنھوں نے پھر وضاحت سے سمجھایا ’’شادی کے معنی ہیں نکاح – اور نکاح میں خرچ ہی کیا ہوتا ہے۔ شکر چھوہارے – یہی نا – تو یہ لڑکی والے دیتے ہیں بارات جائے گی نہیں۔ بارات کا کھانا لڑکی والوں کی طرف سے نہ ہو گا۔ باجہ اور آتش بازی ہم نہیں لے جائیں گے – تو اس سے اچھی شادی اور کیا ہو گی – نہ ہرّ الگا نہ پھٹکری اور رنگ آیا چوکھا – کیوں؟‘‘

''دعوت ولیمہ بھی نہ ہوگی؟'' سکینہ نے پوچھا

''ہوگی'' وہ بولے ''اس میں کیا دقّت ہے۔ جو روپے سلامی کے اُدھر سے ملیں گے اسی میں برادری والوں کو نان گوشت پلاؤ کھلا دوں گا''

''جایئے میں آپ سے نہیں بولتی'' سکینہ ناراض ہو کر چلی گئی

وقار کے دوست احباب شادی کے سلسلے میں البتہ نئے نئے پروگرام بنا رہے تھے۔ ظفر نے اپنے فوٹو کیمرے میں نئی فلم ڈلوالی۔ یوسف پیٹو اس نئے ولیمہ کے لئے مینو بنانے میں منہمک ہوگئے۔ متین صاحب نے شادی کی خوشی میں ایک مشاعرہ منعقد کرنے کی تجویز پیش کردی۔ اور فخرو بھائی اس بات پر بضد تھے کہ وہ شادی کے دن دو عدد ہاتھیوں کے ساتھ بارات میں شریک ہوں گے۔ یہ سارے دوست ہادی صاحب کی جان کھائے ہوئے تھے مگر ہادی تھے کہ سُن سب کی رہے تھے مگر حامی کسی کے نہ تھے۔ نہ کسی سے انکار کر رہے تھے نہ کسی سے اقرار۔ بیٹھے بیٹھے ہر ایک کی فرمائش یا بقول ان کے ہر ایک کی بکواس سنتے جا رہے تھے۔ یوسف نے ان کی خاموشی سے تنگ آ کر پوچھا

''تو قبلہ آپ یہی بتا دیجئے کہ شیر مالیں لکھنؤ کے نانبائی سے لگوائیں گے یا قصبہ کے نانبائی سے۔ وہ میں اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ اگر پکانے والوں کو لکھنؤ سے بلوانا ہے تو مجھے بتایئے میں چھبن بھائی سے کہوں گا وہ آدمی بھجوا دیں گے۔''

ہادی نے اس کا بھی کوئی جواب نہیں دیا صرف ان کی صورت دیکھتے رہے

''رہی بریانی کی بات'' اُنھوں نے بیان جاری رکھا ''تو وہ بھی یہاں کے باورچی نہیں پکا پاتے اور زردہ تو بالکل ہی گوڑ دیں گے۔ آپ نے مجّن کے عقیقہ پر کھایا ہوگا۔ چاول اکڑ گئے تھے کہ نہیں''

''نہیں تو'' ہادی صاحب بول پڑے ''زردہ میں تو کوئی خرابی نہیں تھی''

''مگر چچا جان آپ کے یہاں مزعفر ہوگا اور چاول بھی دہرہ دون کے ہوں گے۔ کیوں فخرو بھائی؟''

''اچھا اب ذرا دیر کے لئے تم اپنی چونچ بند کرو'' متین نے کہا ''تمہیں تو بس کھانے پینے کی باتوں میں مزہ آتا ہے۔ اصل مسئلہ غور طلب یہ ہے کہ مشاعرہ طرحی ہو یا غیر طرحی''

''آجکل تو غیر طرحی مشاعرے ہوتے ہیں'' فخرو نے کہا

''ہاں۔ مگر اس قصبہ کی روایت تو طرحی مشاعروں کی ہے'' ظفر نے کہا

''ہاں اور کیا'' ہادی بولے ''فرشی مشاعرہ۔ مصرعہ طرح لو اور بیٹھے بیٹھے غزل کہہ ڈالو''

''چچا آپ کہتے ہیں کہ مقامی بارات میں کھانا نہیں کھلاتے تو میں جو ہاتھی لاؤں گا اُسے کھانا کون دے گا'' فخر میاں نے سوال کیا۔

''یہ تم جانو'' ہادی نے جواب دیا

''میں کہتا ہوں کہ ہاتھیوں کا کھانا آپ ہی کو دینا ہوگا'' فخرو بولے

''نالائق میں کیوں دوں گا'' ہادی بگڑ کر بولے ''تم مہاوت سے کہہ دینا وہ اپنے ہاتھیوں کو کھلا پلا کر دروازے پر لائے''

''بالکل واجبی بات ہے'' یوسف نے ہاں میں ہاں ملائی'' یعنی جب ہاتھیوں کو لانے کی اُجرت آپ دے ہی رہے ہیں تو پھر ان کے کھانے پینے سے آپ کو کیا مطلب''

''اے لڑکے'' ہادی جلدی سے بولے ''میں کچھ نہیں دے رہا۔ فخرو تم اس بھڑ کٹے میں نہ رہنا''

زہرا بی بی کی حویلی میں البتہ شادی کی خوب دھوم دھام ہو رہی تھی۔ حالانکہ میر فدا حسین کو ابھی تک اس رشتے کی ہوا تک نہیں لگی تھی مگر زہرا بی بی اس خیال کے تحت کہ لاڈلی کے لئے ایسا اچھا رشتہ نہ ملے گا اور اس یقین پر کہ میر فدا حسین بھی اس رشتہ کو ضرور پسند کرلیں گے وہ بڑی ہماہمی اور دل جمعی کے ساتھ شادی کے انتظامات میں لگ گئی تھیں۔ بھاری بھاری سونے کے ٹھوس زیورات والی گھنوں کی پٹاری نئے ڈیزائن کے حسین و سبک زیورات بنوانے کے لئے نکل پڑی۔ امّاں اور نانی کو شادی پر ملے پوت اور نیم زری کے پائینچے دار غرارے جنگلا اور کم خواب کی کُرتیاں نرما کے چوڑی دار لچکے گوٹے مقیش اور سلمیٰ ستارے سے پٹا پٹ ریشمی ڈوپٹے جو بڑی احتیاط سے لکڑی کے بڑے بڑے بکسوں میں بند تھے شادی میں کام آنے کے لئے باہر آ گئے دور قریب کے رشتہ دار بھی دھیرے دھیرے اکٹھا ہونے لگے اس طرح حویلی میں بڑی چہل پہل اور شادی کی گہما گہمی ہوگئی۔ نائینوں اور میراثنوں کی ڈھولک پر دیر رات تک گانا بجانا ہونے لگا۔ کرامت علی کی پڑوسن بٹّن میراثن صبح سے دیر رات تک حویلی میں کھاتی پیتی چُہل بازیاں کرتی کچھ اچھے کچھ گندے گیت گاتی۔ دو وقت کا کھانا تو ملتا ہی تھا دن بھی بکریوں کی طرح پان کھا کھا کر جگالی کرتی رہتی۔ بٹّن کو یہ بات نہیں معلوم تھی کہ لاڈلی کرامت علی کی پہلی عورت رانی کی حقیقی بھانجی ہے۔ شادی سے ایک دن پہلے نائین کی لڑکی جمیلہ لاڈلی کے بدن میں اُبٹن لگا رہی تھی کہ بٹّن بھی وہاں پہونچ گئی اور لاڈلی کے صندل گلاب جیسے اعضا کو دیکھ کر بولی

''اللہ رکھے ہماری بٹیا تو خود ہی چاند کا ٹکڑا ہے۔ دیکھو کیسا چاندی جیسا پنڈا جھمک رہا ہے۔ ابٹن لگانے کی کیا ضرورت ہے۔''

''تو تم ملوا لو کلّو رانی'' جمیلہ نے چوٹ کیا ''کاہے کو نجر لگاتی ہو''

''اے اے جمیلہ کی بچّی۔ تو میرے منھ نہ لگنا کہے دیتی ہوں'' بٹّن نے پان کی پیک کوڑے دان میں پھینکی

''کاہے؟ ۔ تمہارا منھ بہت سوندھا ہے کیا مُوٹلّو''

''ہاں ہے۔کیا کرے گی تو؟''

''میں نہیں مانتی'' جمیلہ بولی ''اچھا ابھی رمجانی بھشتی آئے گا تو اس سے کہوں گی تمہارا منھ وہی سونگھ کر بتائے گا۔دن بھر پھوہڑ پھوہڑ گیت گاتی ہو ضرور منھ گندھائے گا''

بٹّن نے ایک گالی دی اور غصّہ میں مٹکتی بڑبڑاتی وہاں سے چلی گئی پھر بہت دیر تک اس نے کوئی گیت نہیں گایا۔ان دونوں کی نوک جھونک سن کر لاڈلی دل ہی دل میں محظوظ ہوتی رہی اور جب بٹّن وہاں سے چلی گئی تو لاڈلی نے جمیلہ سے پوچھا ''تجھے کوئی اچھا سا گیت یاد ہے جمیلہ؟''

''ہاں ہاں'' جمیلہ بولی ''پر میں گاؤں گی نہیں''

''کیوں؟''

''ارے مجھے شرم لگتی ہے'' وہ شرما کر ہنسنے لگی

''کیوں شرم لگتی ہے؟'' لاڈلی نے پوچھا

''ارے ابھی ہمری شادی نہیں ہوئی نا'' جمیلہ چپکے سے بولی ''اگر تم کہو تو میں تم کو چپکے چپکے سنا دوں''

''اچھا سنا'' لاڈلی نے کہا

جمیلہ پتلے سروں میں گانے لگی

''کوٹھے اوپر کوٹھاوے ما جھروکا۔گودی مالیکے جھکاوے بھتروا۔ہائے رے دیّا''

''اری چپ کر'' لاڈلی نے ڈانٹا

ہی ہی کر کے وہ ہنسی اور پھر گانے لگے

''سیّاں کے باہوں میں جھولت ہے جھولا۔او دیکھت ہے کُھوسٹ سسُر وا۔ہائے رے دیّا''

''تو نہ مانے گی'' لاڈلی نے ڈانٹا ''کہاں سے سیکھا یہ گانا۔چھی چھی''

وہ پھر کھلکھلا کر ہنسی ''ایک بات ہے بہنی۔گانا ہے مجے دار۔ہم کا بہت اچھا لگت ہے۔اب تو کل سے تم بھی جھولا جھولو گی نا۔ہی ہی ہی'' اس نے لاڈلی کی ران میں دھیرے سے چٹکی لی مگر لاڈلی کچھ کہنے کے بجائے شرما گئی۔

''مگر تمہارے سُسر جی تو کھوسٹ نہیں بڑے موٹے تگڑے ہیں۔بالکل جوان لگت ہیں''

''اچھا بس ہو چکا'' لاڈلی اس سے پیچھا چھڑانے کو بولی ''اب تو جا یہاں سے''

''ہم کہت ہے بڑے میاں کے بھی کہوں بیاہ کرائے دیو۔کاہے سے کہ وہ رجّو ماما کے پتوہیا کے بہت دن سے پیچھے پڑا ہین۔جب دیکھو دوارے کھڑے رہت ہین اور چٹر پٹر کھرید کے او کا دیت ہین۔ہی ہی''

''جمیلہ اب تو جائے گی یہاں سے کہ نہیں''

''ارے جائت ہے جائت ہے'' وہ جاتے جاتے بولی ''اب جراوٗنّ میاں کے پاس چل کے کچھ دل لگی مجاخ کیا جائے۔بہت سیدھے ہین بچارے''

عین شادی کے روز میر فدا حسین صبح صبح گھر پہونچ گئے کسی اطلاع یا بلاوے کے بموجب نہیں بلکہ مدنی پور میں زرّیں کو جل مرنے کے لئے ایک کوٹھری میں بند کر کے وہاں سے بھاگ نکلنے کا اُنھیں سب سے آسان اور سیدھا راستہ جائس کا دکھائی دیا۔راستے بھر اُنھیں زرّیں کا خیال آتا رہا اور ہر بار اُنھوں نے اُسے اپنے تصوّر میں لپکتے ہوئے شعلوں میں جھلستے، تڑپتے اور چلاتے ہوئے پایا گھر پہونچتے پہونچتے وہ اس پختہ یقین پر پہونچ چکے تھے کہ زرّیں جل بھُن کر ختم ہو چکی ہے۔بیس سال کی دست گرفتگی سے ان کا دل پسیج گیا۔

میر صاحب کے عقب میں اسی روز شام تک کرامت علی بھی اُن کی تلاش میں جائس پہونچ گیا۔گھر پہونچنے پر اُسے ابراہیم بھانٹ اور بٹّن سے یہ معلوم ہوا کہ رات میں بڑی حویلی والے میر فدا حسین کی بیٹی کی شادی ہے۔کرامت کو میر صاحب کے اچانک جائس آنے کی علّت اب سمجھ میں آ گئی مگر وہ یہ نہیں سمجھ پایا کہ لاڈلی کی شادی کی خبر زرّیں اور قدیر کو کیوں نہیں دی گئی میر صاحب خود تو شادی میں شرکت کے لئے چلے آئے مگر اُن دونوں کو اس بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا۔ان دونوں کی غیر موجودگی میں اب کرامت علی اس تقریب میں اپنی شرکت کو ضروری اور اپنا لازمی حق سمجھ کر بڑی حویلی پہونچ گیا۔خرقۂ فقیرانہ تو وہ کب کا اتار چکا تھا۔چہرے کی داڑھی بھی چندا کے مرنے کے بعد مونڈ وا دی تھی اس لئے اپنے پر تکلّف اور دیدہ زیب لباس فاخرہ میں وہ کرامت علی درویش کی جگہ شیخ کرامت علی بن کر نفیس گرم شیروانی اور چوڑی دار کے ساتھ چھڑی ہلاتا بڑی حویلی پہونچا تو اس کی ظاہری وجاہت اور جامہ زیبی کی بنا پر میر فدا حسین نے اُسے پہچاننے میں تامّل کیا مگر جب اُس نے میر صاحب کو بڑے مودبانہ انداز میں سلام کیا تو وہ پہچان گئے مگر جواباً جس خوش اخلاقی کی توقع اُسے میر صاحب سے تھی وہ نہ دیکھ کر کرامت علی نے کہا

''میں مدنی پور گیا تھا۔وہیں سے سیدھا یہاں آیا ہوں''

''کوئی خبر؟'' گھبراہٹ میں یک بیک ان کے منھ سے نکل گیا مگر فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس کر کے وہ کسی دوسری طرف متوجہ ہو گئے۔دراصل وہ زرّیں کے بارے میں جاننا چاہتے تھے

''خبر!'' کرامت بولا ''خبر تو کوئی خاص نہیں۔ہاں زرّیں اور قدیر کو شادی کی اطلاع نہیں ہے''

کرامت علی کے اس اطمینانی جواب سے میر صاحب کو یہ علم تو ہو گیا کہ زرّیں جل کر مری نہیں مگر اس بارے میں پھر آگے اُنھوں نے کچھ نہیں پوچھا البتہ کرامت سے کہا کہ وہ مہمانوں کی خاطر تواضع کرے اور خود دوسری طرف کسی اور کام سے چلے گئے۔

کرامت علی کو ابھی تک یہ نہیں معلوم ہوا تھا کہ لڑکا کون ہے اور بارات کہاں سے آئے گی۔ اُسے تو ابراہیم اور بٹّن نے بس اتنا ہی بتایا تھا کہ بڑی حویلی والے میر فدا حسین کی بیٹی کی شادی ہے۔ حویلی کے پڑوس میں ہادی صاحب کے گھر کے آگے میدان میں دو تین پیٹرومیکس کے ہنڈے جل رہے تھے۔ بارات یا شادی کے گھر والی رونق اور چہل پہل وہاں کچھ نہ تھی البتہ کچھ لڑکے روشنی میں اُچھل کود رہے تھے اور بدّھن یکّہ والا نوشاہ کے بیٹھنے کے لئے اپنا گھوڑا دروازہ پر لئے تیار کھڑا تھا۔ رات میں نو بجے کے قریب سیّد ہادی اپنے پانچ سات ہمراہیوں کے ساتھ گھر سے باہر آئے اور خود نوشاہ والے گھوڑے پر بیٹھ گئے۔ اس وقت کسی ناسمجھ نے گولہ بھی داغ دیا۔ بڑی حویلی میں بارات کی آمد کا شور ہونے لگا مگر جب چند منٹ بعد یہ بلا باجے گاجے کی مختصر سی بارات پیٹرومیکس کی روشنی میں میر فدا حسین کے دروازے پر پہونچی تو سب ہکّا بکّا رہ گئے۔ نوشہ کی جگہ کم خواب کی بوسیدہ شیروانی اور سفید چوڑی دار پاجامہ میں سید ہادی کو پھولوں کا ہلکا سہرا سر پر باندھے اور گھوڑے پر بیٹھا دیکھ کر میر فدا حسین کے ہوش اُڑ گئے۔ سب ہی ایک دوسرے کو حیرت بھری نظروں سے دیکھنے لگے اور قبل اس کے کہ کوئی کچھ بولتا حویلی کے اندر سے ایک سن رسیدہ نائین مہندی کی ڈالیوں سے بنی ہوئی موٹی سی چھڑی لے کر باہر نکلی اور بالکل میکانکی انداز میں کچھ گاتی گنگناتی بڑے پیار سے چھڑی کو نوشہ کے سر پر چُھلانے لگی اور اسی وقت ابراہیم بھانٹ بھی اپنا کبت سنانے لگا

''اول نام اللہ توئی جگ پور رحیم کریم کہائیو- اپنے نور سے پیدا کیو پھر وزیر محمد آپ کہائیو''

''ہادی- یہ کیا تماشہ ہو رہا ہے؟'' میر صاحب گرج کر بولے چہرہ فرطِ غیض سے لال تھا

ہادی اپنے چہرے سے پھولوں کا سہرا ہٹا کر گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے اُتنے ہی اونچے سُروں میں بولے ''یہ تماشہ ہو رہا ہے؟- اجی قبلہ میں بارات لے کر آیا ہوں اور آپ کو تماشہ دکھائی دیتا ہے- آپ اپنے ہوش وحواس میں ہیں کہ نہیں''

''نوشہ کہاں ہے؟'' میر صاحب نے چلّا کر پوچھا

''اور میں پہاڑ جیسا اس گھوڑے پر آپ کو بُھنگا دکھائی دیتا ہوں کیا؟- رتوندھی ہوتی ہو تو گیس کی روشنی میں ٹھیک سے دیکھ لیجئے- میں ہی نوشہ ہوں- سمجھ گئے''

میر صاحب کا پارہ آخری حد پر پہونچ گیا وہ فرطِ غضب سے تھر تھر کانپنے لگے۔ دونوں طرف کے شرکا جو سب کے سب آپس میں کسی نہ کسی رشتے میں منسلک تھے اور کچھ فطری حَسد کچھ خاندانی عناد اور کچھ آپسی جلن کے باعث اس عجیب وغریب سچویشن پر چپ چاپ کھڑے محظوظ ہو رہے تھے ان کی مصلحت آمیز خاموشی دیکھ کر میر صاحب نے مُڑ کر اپنے پیچھے دیکھا تو انھیں کرامت علی کھڑا دکھائی دیا اُسے مخاطب کرتے ہوئے میر صاحب شدید غصہ میں بولے

''کرامت- کھینچ لے حرام زادے کو گھوڑے پر سے''

کرامت نے میر صاحب کی شہ پا کر پہلے تو ہادی کے قریب جا کر دھیرے سے کہا

''ہادی بھیّا- آؤ اُتر آؤ- شاباش'' ہادی گھوڑے پر بدستور متمکن رہے تو دوسرے ہی لمحہ کچھ سُنے سمجھے بغیر ہادی کے پاؤں گھوڑے پر سے کھینچنے کے بجائے کرامت نے ان کے ایک پاؤں کو رکاب سے نکال کر زور سے دھکّا دے دیا تو وہ دوسری طرف دھڑام سے گر پڑے اور گرے تو پھر خود سے نہ اُٹھ پائے کیونکہ کولھا اُکھڑ گیا تھا۔ گالیوں کا فوّارہ ان کے منھ سے چھوٹ پڑا اور چاروں طرف افراتفری مچ گئی۔ کچھ لوگ اُنھیں اُٹھا کر گھر لے گئے اور باقی کرامت علی پر ٹوٹ پڑے جن میں دونوں طرف کے لوگ شامل تھے۔ میر صاحب کی نانیہال نصیر آباد سے آئے ہوئے مہمان کرامت علی کی حمایت میں ڈنڈا لے کر پل پڑے۔ کرامت علی بھی لڑنے میں کسی سے کم نہ تھا مضبوط بدن کا پرانا پہلوان ڈنڈا بھانجنے میں ماہر تھا خود تو اچھی طرح پٹا مگر حریفوں میں سے دو چار کے سر توڑے ایک آدھ کے ہاتھ پیر اور گھٹنے۔ غرض کہ اپنی چوٹ کا بدلہ نکال لیا۔

ہادی کا جو منصوبہ تھا وہ کرامت کی دخل اندازی کے سبب چوپٹ ہو گیا بہت دنوں کے بعد وہ اپنے کسی پلان میں ناکام ہوئے تھے۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ نڈّو نائین کی زبانی رشتے کی بات زہرا بی تک پہونچا کر اُنھیں رضامند کر لیا جائے پھر عین موقع پر وقّن کو وہاں سے ہٹا کر خود نوشہ بن کر پہونچ جائیں۔ اپنے عقد کی فکر اُنھیں کئی سال سے تھی مگر اپنی برادری اور رشتہ داروں میں کوئی گھاس ڈالنے والا نہ تھا اس لئے ابھی تک آوارہ سانڈ کی طرح اِدھر اُدھر منھ مارتے اور کھیت چرتے پھرتے تھے۔ بڑی حویلی میں ایک حسین دوشیزہ کی آمد نے دیوانہ را ہُوئے بس است کا کام کیا۔ ایک بے نام ونسب لڑکی کے لئے ان سے بہتر اور کون تھا میر فدا حسین کی اپنی اولاد ہوتی تو ہادی کی یہ ہمّت نہ ہوتی۔ اس لڑکی کو حاصل کرنے کے لئے اُنھوں نے یہ چال چلی کہ شادی والی شام کو وقار اور اس کے دوستوں کو نصیر آباد بھیج دیا کہ وہاں سے نکاح پڑھنے کے لئے قبلہ وکعبہ کو اپنے ساتھ لے آئے اور اس بیچ اس کی غیر حاضری میں خود دولھا بننے اور سجنے سنورنے لگے یہ دیکھ کر سکینہ کو بڑی حیرت ہوئی اس نے پوچھا

''ابّا- یہ پھولوں کا سہرا آپ کیوں باندھ رہے ہیں؟''

سر پر خضاب زدہ بالوں کے حلقے میں بدقلعی لوٹے کی طرح میلے تامڑے پر ہادی سہرے کا پھول کھلا رہے تھے سکینہ نے ٹوک دیا تو جھنجھلا گئے

''تم چپ رہو- اور اب آگے مت ٹوکا ٹا کی کرنا''

اس تمام عرصہ میں اُنھوں نے اپنے بیٹے کو بالکل بے تعلق و بے خبر رکھا تھا اور اُسے اپنا اصل منصوبہ بھی نہیں بتایا تھا۔ وہ بے چارا تو یہی جانتا تھا کہ خود اسی کے نکاح کے لئے نصیر آباد سے قبلہ وکعبہ کو

بلوایا جارہا ہے اور یہی بتا کر وہ اُنھیں اپنے ساتھ لایا بھی۔

میر فدا حسین اس بے شان و گمان وقوعہ اور ہادی کی فریب کاری پر اس وقت بڑے بے چین و مضطرب تھے ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب وہ کیا کریں۔ ہادی کو گھوڑے سے ضرور دھکیل دیا گیا تھا مگر سر دست جو مسئلہ ان کے پیش نظر اس وقت تھا اس کا کوئی حل اُنھیں نظر نہیں آتا تھا۔ ماجد میاں عرف مِلّی اس موقع کو اپنے حق میں بلّی کے بھاگوں جیسی بے حد مفید سمجھ کر میر فدا حسین کو سمجھانے اور تسلّی دینے کو آ گئے

’’پھوپھا جان۔ یہ لوگ بڑے کم ظرف ہیں کسی کی عزّت کا انھیں کوئی خیال ہی نہیں۔ میں تو پہلے ہی ڈر رہا تھا کہ اللہ خیر کرے اس گھرانے میں پھوپھی نے قرابت کا رشتہ جوڑا ہے ضرور کوئی نہ کوئی ہنگامہ ہوگا۔ اور وہی ہوا بھی۔ خیر چلئے اللہ نے آپ کو بچا لیا۔ آپ کوئی غم نہ کیجئے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا‘‘

میر فدا حسین تو پہلے ہی سے پریشان خاطر تھے مِلّی کی باتیں سُن کر جھنجھلا گئے

’’کیا ٹھیک ہو جائے گا۔ کیسے غم نہ کروں۔ ارے میں پوچھتا ہوں کہ وقّن کہاں چلا گیا۔ تم لوگ اس کا پتہ کیوں نہیں لگاتے۔ آخر کہیں نہ کہیں تو ہوگا وہ‘‘

’’پھوپھا جان وہ تو ایک نمبر کا دھوکہ باز ہے۔ اُسے نوشہ بن کر آنا ہوتا تو پہلے ہی نہ آتا سچ کہتا ہوں یہ پورا گھرانا فتنہ جو ہے۔ ناہنجار ہے‘‘

’’تم میرے زخموں پر نمک چھڑکنے کے بجائے جا کر اُسے پکڑ لاؤ‘‘ میر صاحب نے کہا

’’واہ صاحب‘‘ مِلّی بولے ’’اس کا باپ ٹوٹی کمر لئے پڑا ہے اس میں وہ کھپچیاں باندھے گا کہ یہاں شادی کرنے دوڑا آئے گا۔ آپ میری مانیں تو ایک بات کہوں‘‘

’’کہو‘‘ میر صاحب نے جلدی سے کہا

’’ہی ہی۔ اب کیا عرض کروں‘‘ مِلّی خواہ مخواہ شرمانے لگے ’’پھوپھا جان۔ آپ۔ میرا مطلب ہے۔ وقّن کی جگہ۔ آپ کہیں تو۔ یعنی کہ۔ میں تیّار ہوں‘‘

’’کیا!‘‘ میر صاحب چونکے ’’کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ وقّن کی جگہ تمہارے ساتھ عقد کرا دوں؟‘‘

’’ایگزیکٹ لی‘‘ مِلّی چہک اُٹھے ’’بالکل یہی۔ مگر آپ ابّو جان سے نہ پوچھئے گا اس بارے میں‘‘

’’تمہارے ابو جان سے نہ پوچھوں۔ کیوں؟‘‘

’’وہ اس لئے کہ ابّا جان سے پوچھ کر شادی طے کرنے کا نتیجہ تو آپ نے دیکھ لیا۔ میرا مطلب ہے۔ جب لڑکا خود راضی ہے باپ سے پوچھنا کیسا۔ بس کر دیجئے شادی۔ بولئے برکّت۔ باپ کو ماریئے ٹھائیں‘‘

مِلّی کی اس معصوم تجویز نے سچ مچ میر صاحب کو نیا راستہ دکھایا وہ چند لمحے مِلّی کی صورت دیکھتے رہے۔ رائے بڑی معقول تھی۔ یعنی باپ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔

’’تم ٹھیک کہتے ہو مِلّی‘‘ وہ کچھ سوچ کر بولے ’’واقعی کسی سے پوچھنے کی کوئی ضرورت نہیں، بس اب تم لوگ ایسا کرو کہ جیسے بھی بن پڑے اس وقار کے بچّے کو پکڑ کر میرے پاس لے آؤ‘‘

اس کے بعد میر صاحب نے آٹھ دس آدمی مزید اس کام پر لگا دیئے جنھوں نے وقار کو نصیر آباد اور جائس کے درمیان سنسان راستے میں بڑے پُل کے پاس ڈھونڈھ نکالا اور اُسے بغیر کچھ بتائے گھیر گھار کے میر صاحب کی حویلی تک پہونچا دیا اُسے تو یہ بھی نہ معلوم ہو سکا کہ ابّا جان کوٹھے سے بیکار ہو کر گھر میں پڑے ہیں۔ میر صاحب وقار سے کچھ نہیں بولے نگران کے اشارے پر وقار حویلی کی ڈیوڑھی تک پہونچایا گیا جہاں پہلے سے تیّار کچھ تیز و طرار خواتین اور کچھ بے جھجک لڑکیوں نے اُسے زبردستی گھسیٹ کر حویلی کے اندر کر لیا۔ اس رومان انگیز گرفتاری کو اپنی شادی کا لازمی جزو سمجھنے والے وقار پر لڑکیوں کے جُھرمٹ میں کیا گذری اس کا صحیح اندازہ تو خود اُسی کو ہوا ہوگا مگر ایک گھنٹہ کی جبری قرنطینہ کر بعد جب وقار نوشاہ کا پورا شاہانا لباس زیب تن کئے حویلی سے باہر آیا تو میر فدا حسین کی جان میں جان آ گئی۔ پھر نکاح کی محفل میں وقار کو عقد کے لئے آمادہ و تیار دیکھ کر مِلّی میاں گھبرائے اور ہادی صاحب کو اطلاع دینے کے لئے سر پر پیر رکھ کر بھاگے اور پہونچتے ہی بولے

’’چچّا غضب ہو گیا۔ وقّن نکاح کے لئے بیٹھ گیا ہے‘‘

’’بیٹھ گیا ہے؟۔ کہاں بیٹھ گیا ہے؟‘‘ ہادی نے پوچھا

’’اُفّوہ۔ اس کا عقد ہونے جا رہا ہے۔ وہ شادی کے لئے تیار ہو گیا ہے‘‘

ہادی اپنے اُکھڑے کوٹھے کے درد میں پہلے ہی سے ماہیِ بے آب تھے اس خبر کو سُن کر کراہتے ہوئے بولے

’’کم بخت۔ تیری نالائقی پر خدا کی مار ہو‘‘ وہ درد کی چمک سے ہائے ہائے کرنے لگے

’’کیا آپ مجھے کہہ رہے ہیں؟‘‘ مِلّی نے پوچھا

’’وقّنوا کو کہہ رہا ہوں۔ حرامخور میرے پاس کیوں نہیں آیا۔ وہاں کیوں چلا گیا‘‘ پھر پلٹ کر مِلّی سے بولے

’’ابے میرے پاس بتانے کیوں آیا ہے الّو کی دم۔ وہیں پر ہنگامہ کیوں نہیں مچا دیا۔ اپنے ابّا جان سے کیوں نہیں کہا کہ اُسے اُٹھا لے جائیں محفل سے۔ گھسیٹ لے جائیں مردود کو اپنے گھر۔ ہائے ہائے تم سب کوڑھ مغز ہو کم بخت۔ بد عقل ہو۔ نالائق ہو۔ مِلّی بیٹے کیا بتاؤں۔ میں نے تو اس کا رشتہ تیری بہن کے ساتھ سوچ رکھا تھا اور وہ خود اپنی شادی کئے لے رہا ہے۔ تم لوگ کس مرض کی دوا ہو۔ اب گھونگھا کی طرح منہ پھیلائے دیکھتے رہو گے یا کچھ کرو گے بھی؟‘‘

’’آپ ہی بتایئے کیا کروں؟‘‘ مِلّی نے پوچھا

بڑی دیر سے کوئی ثقیل گالی ان کی زبان پر آنے کو بے تاب تھی جل کر بولے

"اپنی یہ کرو" وہ جل بھن گئے

مٹّی وہاں سے بھاگے تو پلٹ کر نہیں دیکھا اور جب میر صاحب کے دروازے پر پہونچے تو وہاں نکاح کے بعد شکر چھوہارے تقسیم ہو رہے تھے۔ گولہ دغا تو کلیجہ پکڑ کر بیٹھ گئے۔

تاروں کی چھاؤں میں لاڈلی کو رخصت کرنے کے بعد میر فدا حسین نے نماز فجر اور دو رکعت نماز شکرانہ ادا کی پھر اپنے دیوان خانے میں جا کر کینولیس کی جھولا کرسی پر نیم دراز ہو گئے۔ تھک کر چور ہو گئے تھے مگر بیٹی کی رُخصتی کے بعد جو ذرا سا ذہنی سکون ملا تھا اس سے اُنھیں بڑی فرحت ملی۔ کمرے کے ایک کونے میں رکھی ہوئی چھوٹی سی چوکی پر کرامت علی سر اور ہاتھ میں پٹّی باندھے سو رہا تھا۔ کچھ تو ٹھنڈک اور کچھ اپنے قد کی لمبائی کے باعث وہ گٹھری بن گیا تھا۔ میر صاحب اس کے زخموں اور بدن پر چوٹوں کی تکلیف کا احساس کر کے دل ہی دل افسوس کرنے لگے۔ ان کی حمایت ہی میں تو اُسے یہ چوٹیں آئی تھیں اُنھیں اس پر ترس آیا تو اُٹھ کر اپنا کمبل اس کے بدن پر ڈال دیا۔ کمبل پڑتے ہی کرامت نے پیر پھیلا کر انگڑائی لی تو آنکھ کھل گئی پھر میر صاحب کو اپنی طرف متوجہ پا کر وہ اُٹھ بیٹھا

"کیسی طبیعت ہے کرامت؟" انھوں نے پوچھا "زیادہ درد ہو رہا ہے؟"

"نہیں میر صاحب" وہ بولا "معمولی چوٹیں ہیں ٹھیک ہو جاؤں گا، آپ فکر نہ کریں"

"اچھا ابھی تم آرام کرو۔ صبح کو ہسپتال چل کر ڈاکٹر زیدی سے مرہم پٹّی کرا دوں گا"

"آپ میری فکر نہ کریں۔ معمولی چوٹ ہے مرہم پٹّی کرانے کی بھی ضرورت نہیں"

"تم سمجھتے نہیں" میر صاحب بولے "تمہیں چوٹیں آئی ہیں خون نکلا ہے۔ تمہیں سوئی بھی لگنی چاہئے"

میر صاحب کے دل میں اپنے لئے رحم کا جذبہ دیکھ کر کرامت علی نے سوچا بس یہی وقت اپنی بات منوانے کا ہے اس سے اچھا موقع اور نہ ہوگا۔ میر صاحب کرسی پر پاؤں لٹکائے لیٹے تھے کرامت یک بیک اپنی جگہ سے اُٹھ کر اُن کے پاس زمین پر آ بیٹھا

"آپ کو اس غریب کا کتنا خیال ہے" وہ میر صاحب کی پنڈلیاں دبانے لگا

"نہیں۔ نہیں کرامت" میر صاحب نے منع کیا "یہ تم کیا کرتے ہو۔ دیکھو دیکھو"

"یہ میرا حق ہے میر صاحب" وہ بولا "اپنے قدموں کی برکت لینے سے منع نہ کیجئے۔ آپ آلِ رسول ہیں۔ سیّد ہیں۔ آپ کے پیروں کے صدقے ہی میں جنّت ملے گی"

میر صاحب اس تملّق آمیز بیان پر پھول گئے۔ تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد زرّیں کے بارے میں براہ راست کچھ پوچھنے کے بجائے انھوں نے قدیر کے بارے میں پوچھا

"مدنی پور میں قدیر ملا تھا؟"

"ہاں میر صاحب ملا تھا" وہ بولا "میں تو پرسوں قدیر کے ساتھ ہی کانپور سے وہاں گیا تھا"

"اچھا!" میر صاحب نے اس طرح "اچھا" کہا جیسے کچھ اور سننے کی خواہش ہو۔ اس کے بعد کرامت اور بھی گرم جوشی کے ساتھ ان کے پیر دبانے لگا۔

"آپ ناراض نہ ہوں تو ایک بات کہوں"

"ہاں ہاں۔ کہو"

"مدنی پور تھانہ کا داروغہ ہے نا" اتنا سنتے ہی میر صاحب چوکنا ہو گئے کچھ بولے نہیں

"برا نہ مانئے گا وہ زرّو پر کچھ کچھ بری نظر رکھتا ہے۔ میرا مطلب ہے۔ آپ کے نہ رہنے پر وہ گھر میں آتا جاتا ہے۔ اور۔ اور میر صاحب کل وہ مجھے مدنی پور کے اسٹیشن پر ملا تھا۔ دروغہ کا بچّہ کہنے لگا کہ۔ اب کیا بتاؤں۔ آپ کو غصّہ آئے گا سن کر"

میر صاحب کو غصّہ تو آ ہی گیا تھا مگر جبراً کہنا پڑا "نہیں نہیں تم کہو"

"کہنے لگا کہ ہم تم اور میر صاحب۔ یعنی کہ تینوں۔ زرّو کے اوپر دل و جان سے مرتے ہیں۔ سالا۔ مجھے بھی بیچ میں گھسیٹ لایا۔ پھر میں چپ رہا تو کہنے لگا اب میں تمہارا یعنی کہ میرا ساڑھو بھائی بننے والا ہوں۔ آپ سمجھ گئے نا۔ وہ زرّو سے شادی کی بات کہہ رہا تھا"

"ہوں" وہ کچھ سوچنے لگے

"تو کیا آپ نے اُسے اجازت دے دی ہے میر صاحب؟ آپ نے میرا کچھ نہیں سوچا؟"

میر صاحب اس کا بیان سنتے رہے مگر منھ سے کچھ نہیں بولے۔ جب کرامت نے اجازت دینے کی بات پوچھی تو وہ کرسی سے اُٹھ کر ٹہلنے لگے۔

"تم نے زرّیں سے یہ بات کیوں نہیں پوچھی۔ وہ تمہیں ملی نہیں کیا؟"

"ملی تو تھی۔ پر میں نے آپ کی ناراضگی کے ڈر سے نہیں پوچھا" کرامت نے کہا

یہ بات تو میر صاحب پر عیاں ہو گئی کہ زرّیں جلی نہیں اور کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو آزاد کرا لیا ہے۔ اب تو اُنھیں اس کی بے وفائی پر اور بھی یقین ہو گیا اس لئے دل میں پچھتائے کہ اُنھوں نے اس کے کپڑوں میں خود ہی آگ کیوں نہ لگا دی۔ کرامت کے اس بیان پر وہ اس نتیجے پر پہونچے کہ شیر علی عین وقت پر زرّیں کی مدد کو پہنچ گیا ہوگا تب ہی تو بچ گئی اور اب شیر علی کی بیوی بننے جا رہی ہے۔ اُنھوں نے پھر کرامت سے پوچھا

"میرا مطلب ہے کہ شیر علی نے ساڑھو بننے والی جو بات کہی تھی اس بارے میں تم نے زرّیں سے بھی پوچھا؟ آخر وہ کیا کہتی ہے اس بارے میں"

"مجھے زرّو سے یہ بات معلوم ہوتی تو ضرور کچھ پوچھتا۔ یہ تو داروغہ نے مجھے آتے وقت

اسٹیشن پر بتایا تھا کہ وہ میرا- ساڑھو بننے والا ہے"

میر صاحب کرسی سے اُٹھ کر ٹہلنے لگے۔ کرامت اسی طرح زمین پر بیٹھا رہا

"کرامت!" میر صاحب کچھ سوچ کر بولے "تم نے زرّیں کے لئے اپنی خواہش ظاہر کی تھی- یاد ہے؟"

"بالکل یاد ہے میر صاحب" وہ بولا "اچھی طرح یاد ہے- آج بھی یاد ہے"

"کیا اب بھی تمہارے دل میں اُسے حاصل کرنے کی تمنّا ہے؟" میر صاحب نے پوچھا

کرامت ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا

"کیسے کہوں مالک" وہ گڑگڑایا "آج آپ کو بتاتا ہوں۔ یہی ہادی جنھیں میں نے گھوڑے سے کھینچا ہے اس آدمی نے چوبیس پچیس سال پہلے زرّو کے لئے میرے کلیجے پر لات ماری تھی۔ میں کلیجہ تھام کے چپ ہو گیا اور اچّھن میاں نے میری شادی اس کی بڑی بہن کے ساتھ کر دی۔ پانچ سال بعد جب زرّو کا شوہر مر گیا تو میں نے آپ کے آگے ہاتھ جوڑے اپ نے دھتکار دیا- آج آپ نے خود سے پوچھا ہے تو آپ ہی فیصلہ کر دیں۔ آپ مختار ہیں- میں تو اپنی زندگی کی آخری سانس تک اُسے اپنانے کو تیار ہوں۔"

"ٹھیک ہے" میر صاحب نے فیصلہ سنایا "تم دو ایک روز میں مدنی پور پہونچو- میں بھی یہاں سے فراغت کرنے کے بعد آ جاؤں گا۔ تمہیں پہلے اس لئے بھیج رہا ہوں کہ تم زرّیں کو روکے رکھنا وہ داروغہ کے ساتھ نہ جانے پائے"

"بہت اچھا سرکار" وہ بولا "زرّو مجھے مل جائے گی نا؟"

"ہاں ہاں- کہہ تو رہا ہوں" میر صاحب بولے "بس تم زرّیں کو گھر سے نہ جانے دینا"

"کہاں لے کے جائے گا داروغہ- میں سالے کی گردن مروڑ دوں گا۔"

☆☆☆

میر فدا حسین کا اپنے سمدھی کی عیادت کو جانا ایک اخلاقی فریضہ تھا۔ تقریب کے سب ہی مراحل کسی نہ کسی طور پورے ہی ہو گئے تھے اس لئے اب بھی کسی کدورت کا دل میں قائم رکھنا ان کے نزدیک درست نہیں تھا۔ ہادی بھی اپنی بیٹی سکینہ اور کچھ دوسرے بہی خواہوں کے سمجھانے اور گھر میں نئی بہو کے آ جانے کے بعد کسی حد تک حالات سے سمجھوتہ کر چکے تھے اب تو صرف اپنے اُکھڑے ہوئے کولھے کی تکلیف پر شور و غل مچانے کو آزاد تھے- گھر کے مختلف حصوں میں نئی دولھن کی آمد پر بڑی رونق

اور چہل پہل تھی مگر ہادی اپنے کمرے میں نواڑ کی مسہری پر مختلف قسم کے مالشوں کے لئے تیل سے لتھڑی ہوئی میلی تہمد باندھے چت پڑے تھے۔ میر فدا حسین ان کی مزاج پُرسی کے لئے پہونچے تو انھیں دیکھتے ہی ہادی نے شکوہ کیا

"ہائے فدّن بھائی- مار ڈالا آپ نے- ہائے مجھے بیکار کر دیا- آپ کا میں نے کیا بگاڑا تھا"

میر صاحب نے ندامت آمیز لہجہ میں معذرت کی "ہادی مجھے معاف کرنا- بھیّا مجھ سے ضرور غلطی ہوئی مگر کیا کروں میں بھی اس وقت غصّہ میں تھا۔ اب یہ بتاؤ کہ تمہاری تکلیف کیسی ہے"

"کیسی ہو سکتی ہے" وہ بولے "اب تو بیساکھی لگانی ہے۔ آپ نے لنگڑا جو کر ڈالا"

"نہیں نہیں- ٹھیک ہو جاؤ گے۔ ڈھارس رکھو"

"خاک ٹھیک ہو جاؤں گا" ہادی کراہنے لگے "لیکن اگر آپ کو میرے تکلیف کا کچھ احساس ہے تو پھر میرا علاج کیجئے- آپ ہی کے ہاتھ میں ہے میری شفا۔ آپ چاہیں تو میں ابھی اچھا ہو سکتا ہوں"

"ارے بھائی کیسے؟- بتاؤ بتاؤ" میر صاحب نے جلدی سے پوچھا

"وہ ایسے فدّن بھائی کہ-" اتنا کہہ کر ہادی اِدھر اُدھر تجسّس آمیز نظروں سے دیکھنے لگے کہ کوئی پاس میں کھڑا سن تو نہیں رہا۔ اس رازدارانہ احتیاط کو دیکھ کر میر صاحب آگے کھسک کر ان کی طرف جُھک گئے۔ ہادی چپکے چپکے بولنے لگے۔

"سنو فدّن بھائی- جولڑکی بہو بن کر میرے گھر میں آ گئی ہے۔ اب تو خیر آ ہی گئی۔ مگر میں نے اس کی پوری پوری چوحدی معلوم کر لی ہے"

میر صاحب حیرت سے ان کا منھ اس طرح دیکھنے لگے جیسے پوچھ رہے ہوں کہ کیا معلوم کر لیا

"کیوں صاحب- یہ زرّیں کی بیٹی ہے نا؟" ہادی نے اس طرح پوچھا جیسے چوری پکڑ لی ہو

میر صاحب نے ہادی کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تو ہادی ایک لمبی ٹھنڈی سانس لے کر بولے "پچیس سال پہلے کیا گذری تھی مجھ پر آپ کو پتہ نہیں- ابّا نے میرے اوپر کتنا بڑا ظلم کیا تھا- زرّیں میرے خوابوں کی دنیا تھی- اور وہ دنیا اُنھوں نے مجھ سے چھین کر آپ کے حوالے کر دی۔ آپ اُسے لے کر اپنے گاؤں مدنی پور چلے گئے پھر ایک کاٹھ کے الّو رحمان کے ساتھ اس کی شادی کر دی آپ نے- رحمٰن مر گیا تو وہ آپ کی دست گرفتہ ہو گئی- آپ نے اُسے اپنے گھر میں ڈال لیا- بولئے غلط تو نہیں کہتا؟"

میر صاحب نے کرسی پر دو تین پہلو بدلے۔ گلا صاف کیا پھر بڑی نحیف آواز میں بولے

"ہادی- میں نے اس کے ساتھ متعہ کیا ہے وہ میری رکھیل نہیں ہے"

"کیوں کر لیا متعہ؟ آپ کو چاہئے تھا کہ اُسے میرے حوالے کرتے" ہادی بولے "آپ کو پتہ نہیں تھا کیا؟"

”تمہاری عورت اس وقت زندہ تھی“ میر صاحب بولے

”اور تمہاری عورت تو ابھی تک زندہ ہے کیا اس نے اجازت دی تھی کہ تم اس کم سن بیوہ سے متعہ کر لو- بولو بولو- بتاؤ نا“

”اب ہادی پرانی باتوں کو دہرانے سے کیا فائدہ کہ تم یہ بتاؤ کہ کیسے اچھے ہو سکتے ہو“

”وہی بتا رہا ہوں۔ وہی بتا رہا ہوں“ ہادی نے کہا ”مگر اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ آپ میرا علاج کرا دیں گے- نہیں نہیں ایک بات کہتا ہوں- آج کل کون کس کے کام آتا ہے- خلوص اور ہمدری کس چڑیا کا نام ہے یہ کوئی نہیں جانتا“

”ہادی تم کچھ بتاؤ تو سہی“ میر صاحب بولے ”میں کوشش کروں گا“

ہادی نے کروٹ لینا چاہا لیکن درد کے مارے نہ لے پائے، کراہ کر بولے

”فدّن بھائی اگر آپ میرے بہی خواہ ہیں تو میرا گھر بسائیے- میری شادی کرا دیجئے“

”کیا؟“ وہ چونک کر بولے ”شادی کرادوں تمہاری؟- کیا کہہ رہے ہو ہادی“

”آپ چونک پڑے نا؟“ ہادی نے کہا ”اس لئے چونکے ہوں گے کہ اب اس لنگڑی ٹانگ پر مجھ سے شادی کون کرے گا- ہے نا یہی بات؟ مگر فدن بھائی سوچئے۔ اب تو مجھے سچ مچ ایک رفیقۂ حیات کی پہلے سے زیادہ ضرورت ہے کیونکہ اب پیروں سے معذور ہو کر یہ بوڑھا شیر دوڑ بھی نہیں سکتا کہ اپنا شکار پکڑ سکے“

”لاحول ولاقوۃ“

”اونہک- لاحول مت پڑھئے“ ہادی بولے ”کیونکہ میں آپ کو اس وقت معاف کروں گا جب آپ میری شادی کرادیں گے“

”اما کیسے کرادوں شادی- کہاں کرادوں؟“ میر صاحب گھبرا کر بولے

”لائیے- ذرا اپنے کان آگے لائیے- میں اس کی بھی نشاندہی کردوں“

میر صاحب ہمہ تن گوش ہو گئے- ہادی کچھ سوچ کر بولے

”فدّن بھائی- میں نے سنا ہے کہ اب آپ کو زرّیں کی ضرورت نہیں رہی- تو پھر آپ اُسے میری طرف بڑھا دیجئے- میرا مطلب ہے میرا مال مجھے واپس کر دیجئے۔ یہی ہے میرا علاج“

”کیا بکتے ہو ہادی“ میر صاحب ناراض ہوئے ”تم اپنے ہوش میں ہو- وہ میری متاع ہے“

”او ہو قبلہ وکعبہ“ ہادی بولے ”میں نے شراب نہیں پی رکھی کہ ہوش کھو بیٹھوں۔ آپ کو میری بات اچھی نہیں لگی تو اس کے یہ معنی نہیں کہ میں بکواس کر رہا ہوں۔ کہئے کیا آپ یہ بات اچھی طرح نہیں جانتے تھے کہ زرّیں ابّا مرحوم کی آوردہ پروردہ اور میری معشوقہ تھی پھر آپ نے مجھے دغا کیوں دی؟ اور اب

جب اُس کے سدھار کا موقع ملا ہے تو بغلیں کیوں جھانک رہے ہیں۔ چلئے اب بھی میری بات مان لیجئے“

”دیکھو ہادی- مجھ سے اس قسم کی باتیں مت کرو۔ سمجھے“ میر صاحب بولے

”ہاں ہاں نہیں کروں گا“ ہادی چہک کر بولے ”مگر جب اس لونڈیا کو چوٹی پکڑ کے گھر سے باہر کر دوں گا تو تم میرا کیا بگاڑ لوگے- میں اتنا بڑا احمق نہیں ہوں کہ آپ کی اس ناجائز اولاد کو اپنے گھر کی بہو بنالوں۔ سمجھ گئے فدّن صاحب کہ اور سمجھاؤں؟“

”جب تم کو لڑکی کے بارے میں اتنا کچھ معلوم تھا تو کیا سوچ کر تم نے اپنے لڑکے کا رشتہ بھیجا تھا تمہارے ساتھ کوئی زور زبردستی تو نہیں کی گئی“

”اے صاحب آپ کو غلط اطلاع ملی ہے کہ میں نے اپنے بیٹے کا رشتہ دیا تھا- میں نے خود اپنے لئے رشتے کا پیغام دیا تھا جا کر زہرا بجّو سے پوچھ لیجئے- اور بھائی جان یہ جو اپنی پیشانی پر سجدوں کا سیاہ نشان لئے آپ گھوم رہے ہیں اسے میں آپ کی سیاہ کاریوں کا سائن بورڈ بنادوں گا اور بیچ چوراہے پر اسے کیچڑ میں لتھیڑ دوں گا۔ سمجھ گئے نا آپ- ہاں بس اب جائیے- شوق سے جائیے- اور یہ سنتے جائیے کہ اگر زرّیں کو میرے حوالے نہ کیا تو ہادی وہ اودھم مچائیں گے کہ بس یاد کروگے“

میر فدا حسین نے ان کی بات کا جواب نہیں دیا اور وہاں سے اُٹھ کر چلے گئے۔

★★★

دوپہر ہوگئی تو ہادی جو بڑی دیر سے وقّن کے حاضر ہونے اور مُجرۂ تعظیمی کے منتظر تھے اس کے آنے سے ناامید ہو کر لیٹے لیٹے چلانے لگے

”ابے وقّن وا- ابے کہاں مر گیا نالائق“

کسی نے آکر بتایا کہ دولھن کی رونمائی کی رسم ادا ہو رہی ہے وہیں وقّن بھی بیٹھا ہے یہ سنتے ہی وہ جل کر بولے

”اس کو کان سے پکڑ کر میرے پاس لاؤ- اور سُنو میرے دیکھے بغیر دولھن کی رونمائی کیسے ہونے لگی- جب تک میں دولھن نہ دیکھ لوں دوسرا کیسے دیکھ سکتا ہے۔ یہ کیا تماشہ ہو رہا ہے“

سکینہ نے آکر بتایا ”ابّا پہلے دولھن آپ ہی کو دکھائی جائے گی ابھی تو دولھن سنگھار وغیرہ کر رہی ہے“

”سنگھار کر رہی ہے تو وقّنو اوہاں کیا کر رہا ہے۔ اس کو فوراً یہاں بھیجو۔ کم بخت نے بالا بالا اپنی شادی رچالی اور میرے سلام کو ابھی تک نہیں آیا- اس کی یہ ہمّت“

وقار کے دوست یوسف صاحب دروازے کے باہر سے چلائے

’’چچّا—شادی مبارک ہو‘‘

ہادی نے اس پُر جوش تہنیت کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ لیٹے لیٹے ہی یوسف کی طرف خشمگیں نگاہوں سے دیکھتے رہے۔ یوسف ان کے پاس مسہری پر بیٹھ گئے

’’مجھے ایک ضروری کام سے کل شام کورائے بریلی جانا پڑ گیا تھا اس لئے شریک نہیں ہو سکا خیر یہ بتایئے دعوت ولیمہ کب کر رہے ہیں؟‘‘

’’دعوت ولیمہ نہ ہوگی‘‘ ہادی گرج کر بولے

’’کیوں نہ ہوگی‘‘ یوسف بھی اتنی ہی بلند آواز میں چیخ کر کھڑے ہو گئے

’’یعنی کہ وقّن کی شادی ہو اور یار لوگ پلاؤ شیر مال اور مرغ نہ اڑائیں‘‘

’’ارے تو اڑاؤ نا—بیٹا ہم نے کب منع کیا ہے۔ صاحب زادے مرغ اڑاؤ، کبوتر اڑاؤ، بٹیر اڑاؤ—مگر دعوت اڑانے کی بات ہم سے نہ کرنا۔ خلیل خاں اب فاختہ کی جگہ مکھیاں بھی اڑانے کے قابل نہیں رہ گئے—یہ دیکھو—یہ دیکھو‘‘ تہمد سرکا کر انھوں نے کولھے کے آگے تک کا منظر دکھا دیا

’’یہ آپ کو کیا ہو گیا؟‘‘ یوسف نے پوچھا

’’یہ ہم کو فالج مار گیا ہے برخوردار—ہم لنگڑے ٹکے کے تین ہو گئے‘‘ ہادی بولے

اتنے میں وقار دروازے پر آتے ہی بولا ’’چلئے ابّا‘‘

’’کہاں میرے لال؟‘‘ وہ بناوٹی پیار سے بولے ’’کہاں لے چلے گا مجھے؟‘‘

’دولھن دیکھنے کے لئے ابّا‘‘ وقار نے کہا ’’پورب والی دالان میں‘‘

’’دور ہو بے شرم‘‘ وہ ڈپٹ کر بولے ’’کوئی اور نہیں ملا تھا بلانے والا—سالا اپنے باپ سے کہتا ہے چلو دولھن دیکھنے، ہونہہ—یہ تو نہ ہوا کہ آ کر مجھے سلام کرتا۔ چپکے چپکے نکاح پڑھوا لیا اور مجھے یاد بھی نہ کیا کہ کہاں مر رہا ہوں—ابے الّو کی دم میں اُٹھ کر جا سکتا ہوں جو دولھن دیکھنے چلوں—دولھن یہاں نہیں آ سکتی؟‘‘

’’مجھ سے بھول ہو گئی ابّا—آپ یہیں رہئے دولھن خود یہاں آئے گی‘‘ وقار بولا

’’اچھا سنو—شام کو سلامی کے جو روپے ملیں وہ لے کے سیدھا میرے پاس آنا‘‘

منٹوں میں رشتہ کی عورتوں نے دولھن کو ہادی کے کمرے میں پہونچا دیا وہ تیل بھری میلی تہمد لپیٹے لیٹے تھے دیکھتے ہی چادر کو سینے تک کھینچ کر لیٹے لیٹے ہی بولے

’’تم سب یہاں سے دفعان ہو جاؤ، میں دولھن کو اکیلے میں دیکھ کر اس سے باتیں کروں گا‘‘

پُھند نیا نائن جو دولھن کے ساتھ آئی تھی یہ سن کر کھڑی ہو گئی اور ہادی کو بڑی تیکھی نظروں سے دیکھنے لگی۔ اِس کے سر کا رعشہ اور پوپلے منھ کی تیز چلّی ہادی کو ویسے ہی زہر لگ رہی تھی اس پر سے جب وہ اپنی ناک کی پھنگی پر انگشت شہادت مار کر بولی ’’ارے واہ میاں‘‘ تو ہادی کے تن بدن میں آگ لگ گئی

سب لوگ ہادی کے کمرے سے باہر چلے گئے تو ہادی نے دولھن کو بڑے پیار سے بلایا

’’آؤ دولھن آؤ—میرے پاس یہاں بیٹھو‘‘

گذشتہ رات کو گھوڑے پر دولھا بن کر آنے کا واقعہ تو دولھن بھی سن چکی تھی پھر بھی اس نے ہادی کی فرمائش مانی اور اُٹھ کر ان کی پائینتی بیٹھ گئی۔ اُنھوں نے دولھن کا گھونگھٹ اُٹھا کر منھ بھی نہیں دیکھا۔ تکیہ کے نیچے سے سوسو کے دس نوٹ نکالے اور اس کی ہتھیلی پر رکھ دیئے دولھن نے بڑے ادب سے ماتھے تک ہاتھ لے جا کر اُنھیں سلام کیا

’’جیتی رہو—خوش رہو—سدا سہاگن رہو—ماشاءاللہ‘‘ پھر منھ پھیر کر وہ رو پڑے

دولھن خاموش بیٹھی رہی تو ہادی ذرا سا کھنکھار کر پھر بولے

’’تو تم زرّیں کی بیٹی ہو—‘‘ دولھن پھر بھی خاموش رہی

’’تمھاری ماں شادی میں کیوں نہیں آئیں؟‘‘ پھر جواب کا انتظار کئے بغیر خود ہی بولتے رہے ’’تم ایسا کرو بہو—کہ—اپنی ماں کو بھی یہیں بلا لو—تم اُنھیں اپنے ہی ساتھ رکھو تمہارا دل بھی بہلا رہے گا—کام کاج میں آسانی رہے گی اور میری تیمارداری بھی ہو جائے گی۔‘‘

باہر سے لڑکیوں نے دروازے کی دراز سے جھانک کر شور مچایا

’’اب ہم اندر آتے ہیں‘‘

ہادی کے جواب سے پہلے ہی لڑکیاں بھرّا مار کر اندر آ گئیں اور دولھن کو اپنے ساتھ لے گئیں پھند نیا نائین بھی آئی۔ جھکی جھکی آگے بڑھی اور ہادی کی ہیئت کذائی کا جائزہ لینے لگی جیسے اُنھیں سونگھ رہی ہو پھر بڑے غمزدہ لہجہ میں بولی

’’میاں بہت برا ہوا کہ تم پاؤں سے لاچار ہو گئے۔ اُٹھ بیٹھ نہیں سکتے۔ اس سے اچھا تھا کہ ایک ہاتھ سے لُولا ہو جاتے—یا ایک آنکھ سے کانے ہو جاتے‘‘

بوڑھیا کے زبان کی یہ مار اُنھیں تلوار جیسی لگی دانت کٹکٹا کر بولے

’’کم بخت—لنگڑا نہ ہوتا تو تجھے بتاتا ڈائن کی بچّی‘‘

بوڑھیا بگڑنے کے بجائے خوش ہو کر اُنھیں کے سامنے اپنے کولھے ہلا ہلا کر گانے لگی

’’ہائے میں مار آئیوں جیئے بندرا—ہائے میں مار آئیوں جیئے بندرا

وہ گاتے ہی گاتے مٹکتی ہوئی باہر چلی گئی۔ ہادی نے دل ہی دل میں ڈیڑھ سو گالیاں اُسے دیں

☆☆☆

سلام کرائی کی رسم میں میر فدا حسین نے وقار کو پانچ سو اکیاون روپے اور کرامت علی نے ایک ہزار نقد اور ایک ہاتھ کی گھڑی دی تقریباً اتنے ہی روپے گھر کے اندر خواتین اور رشتے کی نئی نئی

خوشدامن، سالیوں، پھوپھیوں وغیرہ سے ملا مگر سچ پوچھو تو ان روپوں سے زیادہ وقار کو ان مزیدار تحائف میں زیادہ لطف آیا جو دور دور تک کے رشتہ کی سالیوں نے مل کر اُسے ہنسی مذاق کی شکل میں دیا تھا۔ لڑکیاں اُسے چاروں طرف سے گھیرے تھیں

''ہائے اللہ – دولھا بھائی تو یک ٹک جمیلہ ہی کو گھورے جا رہے ہیں''

''اللہ – کتنے ندیدے ہیں دولھا بھائی'' دوسری بولی

''ایے بنّو – تم تو پیچھے ہی رہنا – اتنا بناؤ سنگھار کر کے ان کی سامنے آنا، مہنگا پڑ جائے گا''

بے چارے دولھا میاں دو چار نئی صورتوں کو چھوڑ کر قریب قریب سب ہی کے نام سے واقف تھے، سب ہی کو وہ بچپن سے اپنے پڑوسی محلوں میں دیکھتے آئے تھے۔ بڑے سیدھے اور نیک مزاج تھے اس لئے خود کسی کے مذاق کا جواب دینے کی نہ ان میں اہلیت تھی اور نہ وہ اتنے تیز طرّار اور حاضر جواب تھے کہ پلٹ پلٹ کر جواب دیتے۔ ایک لڑکی خاصدان سے اکٹھا سات بیڑے پان نکال کر اُنھیں کھلانے کو آگے آئی۔ کسی نے کونے سے آواز دی

''ارے ننّی سا تو منہ ہے بے چارے کا۔ کیسے کھائیں گے اتنے پان''

لڑکی پان کے بیڑے جیسے ہی وقار کے منہ تک لے گئی ایک نے چلّا کر کہا

''دانت کاٹ لو دولھا بھائی درخشاں کی انگلی میں''

''اوئی'' کہہ کر درخشاں نے سچ مچ اپنا ہاتھ کھینچ لیا جیسے وہ کاٹ ہی تو لیں گے

''بھائی ہمیں یہ مذاق نہیں اچھا لگتا'' وہ بولی

''تو جو اچھا لگتا ہو وہی بتا دو نا انھیں'' سب ایک ساتھ ہنس پڑیں

وقار تو چپ چاپ شرمایا شرمایا سب کچھ دیکھ رہا تھا مگر بار بار پہلو بھی بدلتا جا رہا تھا جیسے کوئی بار بار اس کے دونوں پہلوؤں میں چٹکیاں کاٹ رہا ہو۔ وہ کن انکھیوں سے کبھی اس پہلو کی لڑکی کو دیکھتا کبھی دوسری طرف والی کو یہ دیکھ کر کوئی زور سے بولی

''بچ کے رہنا بہنو – دولھا بھائی اِدھر اُدھر چھانٹ رہے ہیں''

''اوہو – حُسنہ کو تو دیکھو کیسا گھسی جا رہی ہے – اللہ جیسے نگل ہی تو جائے گی دولھا بھائی کو''

''ہم مار دیں گے ہاں شکّو'' حُسنہ نے برا مانا

وقار کو ایک ایک کر کے تین بیڑے پان چاندی کے ورق میں لپٹے ہوئے کھلائے گئے تو کلّہ پھول گیا – کوئی بولی

''ابھی چار بیڑے اور ٹھنسوانے ہیں'' سب پھر ٹھٹھا مار کر ہنسیں

دو بیڑے پان جیسے تیسے اور منہ میں گھسیڑے مگر اس کے آگے پھر کوشش ہوئی تو وقار نے

درخشاں کا ہاتھ بڑی عاجزی اور کچھ احتجاجاً پکڑ لیا کہ اب بس بھی کرو

''لو بھائی – انھوں نے تو سچ مچ چھانٹ لیا درخشاں کو''

''ہائے اللہ – ارے درخشاں کی بچّی – مبارک ہو تیرا بیڑہ پار ہو گیا''

''ارے واہ – کاہے کی مبارک بادی دے رہی ہو؟'' درخشاں نے چٹ سے پوچھا

''ہم نے سنا ہے کہ نیا نیا نوشاہ اگر کسی کنواری لڑکی کا ہاتھ نوچندی جمعرات کی شام کو پکڑ لے تو آنے والی نوچندی جمعرات تک لڑکی کا دولھا آ جاتا ہے''

''چل ہٹ'' درخشاں برا مان کر بولی

وقار نے گھبرا کر جھٹ اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور دوسرے ہاتھ سے آگے اور نہ کھلانے کی خوشامد کرنے لگا

''ارے نہیں نہیں – ہاتھ پکڑے رہو دولھا بھائی انھیں اچھا لگ رہا ہے'' ایک آواز آئی

''ہم مار دیں گے صدف'' درخشاں بولی

ایک بڑی پھوہڑ سی بے دانتوں والی خاتون کتّھا چونا اور قوام کی پیک سے لبریز منہ لئے لڑکیوں کے جھرمٹ کو چیرتی سب کو ہٹاتی ڈھکیلتی قالین پر آ دھمکیں اور لگیں نوشاہ کی چٹا چٹ بلائیں لینے اس طرح جیسے اس کی خاک لگا رہی ہوں – ایک لڑکی چہکی

''سلام کرو دولھے میاں – یہ تمہاری خلیری ساس کی چچیری نند ہیں''

وقار نے سلام کے لئے ہاتھ اُٹھایا ہی تھا کہ خاتون نے اپنے بٹوے سے پانچ روپے کا رنگ باختہ اور ملگجا نوٹ اس اہتمام کے ساتھ نکال کر دولھا میاں کی طرف بڑھایا جیسے سو کا نوٹ دے رہی ہوں۔ سلام کرائی کا روپیہ دینے اور نوشہ کا سلام لینے کے بعد اُنھوں نے پھر مشینی انداز میں بلائیں لیں ''ارے ننّا – نوشہ کو گلے سے ہر کاؤ گی نہیں – یہ برا مان جائیں گے'' ایک شریر لڑکی بولی اس بات پر اُن ننّا محترمہ نے سچ مچ وقار کو اپنے کلیجے سے لگانا چاہا تو اُن کے پورے وجود کی کھراہندی بُو اور تمباکو کی جھار نے وقار کے نتھنوں میں ہل چل مچا دی۔ اس فریضہ سے فارغ ہو کر وہ بوڑھیا وہاں سے دفع ہونے کے بجائے اسی جگہ ملائم قالین پر جم کر بیٹھ گئی۔ ایک لڑکی نے گیندے کا پھول ننّا کے گال پر دور سے پھینکا تو روڑھیا تڑپ گئی

''اوئی'' وہ جلبلا کر بولی ''اے نوج میں یہاں بیٹھوں''

ایک بڑی تیز لڑکی آگے بڑھ کر بولی ''اے نوشہ میاں۔ اب تم بھی یہاں سے کھسکو – جاؤ شاباش رات کو پھر آ جانا – سچ مچ''

''نا – نا – پروین – بیٹھا رہنے دو بے چارے کو – اللہ کتنا بے زبان ہے بچارہ''

''ہاں – صورت ہی سے معصوم دکھائی دیتا ہے''

''اور کیا – بھولی بھالی صورت والے ہوتے ہیں جلاّد بھی''

’’ہوتے ہیں جلاّد بھی‘‘ سب برابر اس کی ٹھلّی اڑا رہی تھیں

اس مینا بازار میں وقار کا دل خوب لگ رہا تھا کہ اتنے میں ڈیوڑھی کے باہر سے کسی مرد کی آواز آئی ’’ہٹ جاؤ لڑکیو۔ پردہ کرلو۔ ہم اندر آتے ہیں نوشہ کو لے جانے‘‘

لڑکیاں اُٹھ کر دالان کی طرف بھاگیں تو اُن میں سے ایک نوشہ کا سرخ رنگ والا کامدار ناگرا جوتا اپنے ساتھ لیتی گئی۔ وقار کے دوست احباب اُسے لے جانے کے لئے اندر آئے تو جوتا غائب تھا۔ وقار کے رشتہ کے ماموں محسن میاں نے کہا

’’چلو یہ پچاس روپے اٹھاؤ اور نوشہ کے جوتے جلدی سے واپس کردو‘‘

’’ہم پانچ سو سے کم نہ لیں گے‘‘ ایک لڑکی اندر سے بولی

’’اتنا مہنگا جوتا نہیں ہے وہ‘‘ ظفر نے کہا ’’تم لوگوں کا دینے کا دل نہیں چاہتا تو رکھ کر سونگھواُسے‘‘

’’جوتے سونگھیں ہمارے دشمن۔ جلدی روپے دلایئے نہیں تو ہم بھگوتے ہیں پانی میں‘‘

محسن میاں نے دوسو دے کر لڑکیوں کو راضی کرلیا۔

ہادی بڑی دیر سے اس انتظار میں لیٹے تھے کہ وقار سلام کرائی میں ملی رقم لاکر اُنھیں دے۔ کئی ہرار کا خیالی تخمینہ لگائے تھے اور اس میں بہت سے ضروری اور غیر ضروری کاموں کا منصوبہ بھی اُنھوں نے بنالیا تھا۔ وقار کے آنے میں دیر پر دیر ہورہی تھی کیونکہ وہ لڑکیوں کے جھمیلے میں پھنسا مزے لے رہا تھا۔ اس درمیان ہادی کئی بار اپنی بیٹی سکینہ کو بلا بلا کر پوچھ چکے تھے۔

’’میں پوچھتا ہوں وقّن ابھی تک واپس کیوں نہیں آیا۔ آخر وہاں کیا کر رہا ہے‘‘

’’آجائے گا ابّا۔ شادی بیاہ کے کاموں میں دیر ہو ہی جاتی ہے۔ آپ فکرمند نہ ہوں وہ جیسے ہی آئے گا میں آپ کے پاس بھیج دوں گی۔‘‘

ہادی کے ایک رحم دل رشتہ دار ایک مرحوم فوجی کی بیساکھیاں مانگ لائے تھے تاکہ وہ اس کے سہارے چل پھر سکیں۔ مگر ابھی تو تازہ تازہ ان کا کولھا اکھڑا تھا اور درد بھی ایسا تھا کہ ذرا بھی ہلنے جلنے میں تکلیف ہوتی تھی اس لیے سر دست وہ بیساکھیاں ان کے سرہانے ویسی ہی رکھی تھیں۔ بالکل مغرب کی اذان کے وقت وقار آیا اور حسب الحکم جو روپے اس نے سسرال میں سلامی کے پائے تھے اُنھیں باپ کے حوالے کردیا روپے لے کر ہادی لیٹے لیٹے گننے لگے پھر تھوڑی دیر بعد اُدب کر بولے۔

’’یہ کتنے ہیں؟‘‘

’’تین ہزار ملے تھے اس میں سے دوسو جوتے چرانے کا دے دیا‘‘ وقار بولا

’’دوسو؟ جوتے چرائی ۔ بہت بڑے رئیس زادے ہونا۔ ابے میں نے تو اپنی شادی میں صرف پانچ روپے دیئے تھے سالیوں کو‘‘ ہادی کو غصہ آگیا

’’ابّا اس وقت تو جوتا بھی پانچ سے کم کا رہا ہوگا‘‘ وقار نے کہا

’’کیوں مجھے غصہ دلا رہا ہے کم بخت‘‘ وہ بولے ’’یہ تین ہزار ٹھیکرے اور یہ چنوٹی (گھڑی) لے جا۔ پھینک آ انھیں فدّن کے منہ پر۔ مجھے نہ چاہیے خیرات کے پیسے‘‘

باپ کے اکھڑے تیور دیکھ کر وقار دم بخود کھڑا رہ گیا

’’سکینہ۔ او بیٹی سکینہ‘‘ لیٹے لیٹے وہ سکینہ کو پکارنے لگے ’’یہاں آنا بیٹی۔ یہ کم بخت، بدعقل نہ جانے میری کیسی اولاد ہے کہ آگے پیچھے کچھ سمجھتا ہی نہیں‘‘

وقار اسی طرح چپ چاپ کھڑا رہا۔ سکینہ آئی تو ہادی طیش میں آکر بولے

’’یہ لو بیٹی ۔یہ دیکھو۔ صاحب زادے تین ہزار کی رقم مار لائے سلام کرائی میں۔ اور یہ گھڑی۔ لو دیکھ لو۔ اور اس بھولا رام کی شکل بھی ذرا ملاحظہ کرلو۔ جانے سالا بی۔ اے۔ آنرز کیسے ہوگیا‘‘

ہادی شاید آگے اور بھی کچھ کہتے مگر سکینہ بیچ میں بول پڑی

’’چپ بھی رہیے ابّا۔ کوئی سنے گا تو کیا کہے گا‘‘

’’سننے دو‘‘ وہ بولے ’’اور اب تم بھی سنو برخوردار۔ کان کھول کر سن لو۔ بغیر مجھ سے پوچھے فدّن کی ڈیوڑھی میں قدم رکھا تو ٹانگیں توڑوادوں گا تیری۔ اور یہ فدّن کا بچہ یہ سالا روپیہ اپنی چھاتی پر لے کر مرے گا۔ تین ہزار سلام کرائی ۔ ہونہہ!۔ یارو ایک ہزار تو خود میں نے بہو کو رونمائی میں دے دیا۔ اور اس نے کیا دیا۔ کچھ نہ دیا۔ سن وقّن۔ رات کو سسرال میں چوتھی کا کھانا کھانے تجھے نہیں جانا ہے۔ کیا سمجھا؟ بس چپ چاپ بیٹھ جا گھر میں‘‘

یہ نادر شاہی حکم صادر فرمانے کے بعد ہادی نے میلی چادر سینے تک کھینچ لی اور آنکھیں بند کرلیں۔

☆ ☆ ☆

مدنی پور میں عشق پیچاں کی پیچیدگیاں بڑھتی جارہی تھیں داروغہ شیر علی زریں کے چلے جانے کے بعد دو تین راتیں عشق خانہ خراب میں جلتے سلگتے رہے۔ تھانے میں اپنا کار منصبی چھوڑ دیا۔ کھانا پینا برائے نام رہ گیا۔ دن بھر بستر پر پڑے رہتے۔ نہ جانے یہ عاشقی کی تڑپن تھی یا ان کی یہ کمزوری کہ زریں کی شکل میں وہ اپنی پیاری مرحومہ بیوی نجمہ کا نعم البدل دیکھنے لگے تھے۔ شاید اسی مسرت آگیں تصور نے اُنھیں اتنا بے بس و مجبور کردیا تھا کہ اب زریں سے دستبرداری کے کسی ہلکے سے تصور کو بھی وہ برداشت کرنے کو تیار نہ تھے۔ دل کی تڑپن اور پیار کی لگن ایک روز اُنھیں پھر زرّیں کے گھر کھینچ لے گئی

’’زرّیں۔ خدا کے لیے میری جان سے مت کھیلو۔ میں مرجاؤں گا تمہارے بغیر‘‘ اُنھوں نے

اظہار کیا زریں نے نہ تو اس بات کا کوئی اثر لیا اور نہ کوئی جواب دیا۔

''اگر تم اتنی ہی سنگدل ہو تو لو- یہ میرا پستول ہے- مجھے اپنے ہاتھوں سے ختم کردو- میں اپنی خودکشی کا اقرار نامہ لکھ کر جیب میں رکھ دوں گا''

''ٹھیک ہے'' زریں نے بڑی معصومیت سے کہا'' مگر یہ کام میں یہاں نہیں کروں گی''

پھر چند لمحے ان کی صورت اور اس پر بے چینی کے تاثرات دیکھ کر بولی

''اور خودکشی کے اقرار نامہ کی جگہ جو میں کہوں وہ لکھئے''

''کیا لکھوں؟'' اُنھوں نے پوچھا ''جلدی بولو''

''لکھئے کہ میں اپنی بیٹی ثریا کی شادی قدیر کے ساتھ کرنے پر راضی ہوں''

شیر علی اس انوکھی اور بے شاں وگمان کی فرمائش پر دم بخود رہ گئے۔ وہی قدیر جس نے میر صاحب کے بہکانے پر ایس پی کانپور کے یہاں ان کے خلاف درخواست دی تھی آج وہ اسے اپنا داماد بنانے کی بات زریں کے منہ سے سن کر اندر ہی اندر سلگ اُٹھے مگر منہ سے ناگواری کا کوئی اظہار نہیں کیا اور نہ دروغائیت دکھائی بلکہ قدرے حکمت عملی سے بولے

''ہاں لکھ دوں گا- مگر صرف لکھ دینے سے کیا ہوگا میں تو تمہاری فرمائش کو عملی جامہ پہنادوں گا۔ پہلے میرے دل کی بے قراری تو دور کردو''

''وہنک'' زریں جھٹ بولی ''پہلے بچوں کی شادی- اس کے بعد''

شیر علی سمجھ گئے کہ زریں کی ہٹ کے آگے ان کی کچھ نہ چلے گی اس لئے کچھ سمجھانا یا بحث کرنا بیکار ہے اب زریں کو حاصل کرنے کا ایک ہی صاف اور سیدھا راستہ اُنھیں دکھائی دے رہا تھا وہ یہ کہ جب شرع شریف کے مطابق با قاعدہ نکاح کرنے کے بعد زرّیں کو حاصل کرنے میں کامیابی نہیں ہو رہی تو کیوں نہ دروغائی ہتھکنڈے کو آزمایا جائے۔

''مجھے سوچنے کا کچھ موقع دو'' یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔

★★★

قدیر کو ریل کے محکمہ سے یہ اطلاع ملی کہ نومبر ۱۹۷۰ء کی جس ریل دُرگھٹنا میں اس کی پتنی کی موت ہوئی تھی اس کے سب ہی مرنے والوں کے نکٹ رشتہ داروں کو سرکار نے پچاس پچاس ہزار روپیہ معاوضہ دینا منظور کیا ہے جو اس اطلاع کے ملنے کے پندرہ دن کے اندر ڈیویزنل سپرنٹنڈنٹ ناردرن ریلوے لکھنؤ سے ضروری شناختی کاغذات وثبوت پیش کرنے پر وصول کیا جاسکتا ہے۔ اس اطلاعی خط کے ملنے پر قدیر کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا وہ یہ خوش خبری اپنی ماں کو سنانے کے لیے اپنے کھیت پر سے

بھاگ کر گھر آیا اور ماں کو پچاس ہزار روپے ملنے کی اطلاع دی۔

''بس اماں یہ روپیہ مل جائے تو ہم لوگ میر صاحب کو الوداع کردیں گے۔ بہت دن ان کے ساتھ رہ لئے'' زریں نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا

''اماں میں شام کی بس سے لکھنؤ جارہا ہوں روپیہ ملتے ہی لوٹ آؤں گا''

''دو ایک دن بعد چلے جانا'' دراصل وہ میر صاحب اور شیر علی دونوں سے خوف زدہ تھی ''جتنی جلدی پہونچوں گا اتنی ہی جلدی روپے ملیں گے روپے ملتے ہی سیدھا گھر آؤں گا۔''

قدیر جس بس سے لکھنؤ جانے والا تھا اُسی بس سے مدنی پور تھانہ کے حوالدار گنپت رام اُترے تھے قدیر کو دیکھتے ہی حوالدار نے پکار کر پوچھا

''اوئے میاں قدیر- بڑی پھرتی میں ہو۔ کہاں کی تیاری ہے؟''

قدیر پیٹ کا ہلکا تھا بس پر چڑھتے چڑھتے گنپت رام کے کان میں اُگل دیا

''لکھنؤ جارہا ہوں حولدار صاحب- گورنمنٹ سے ٹرین ایکسیڈنٹ کا معاوضہ ملنے والا ہے''

''اچھا- اچھا'' گنپت رام خوش ہوئے'' ''وہاں سے ہمارے لیے بھی کچھ لاؤ گے پیارے۔''

''آپ کے لیے لکھنؤ کی کھٹیاں لاؤں گا- گلاب ریوڑیاں'' قدیر نے کہا

''ارے یہ تو تم اپنی دلربا کے لیے لانا۔ میرے لیے اکبری گیٹ سے اچھا والا خمیرہ تمبا کو ضرور لانا''

بس چل پڑی تھی اس لیے قدیر صرف مسکرا کر رہ گیا۔ حولدار گنپت رام نے یہ خبر ایف آئی آر کی طرح پہلے داروغہ شیر علی کو سنائی پھر موقع نکال کر ثریا کو بھی بتا آیا۔ قدیر کی غیر حاضری نے شیر علی کے دل میں شیطانی جذبات کو ابھارا تو اسی رات تین اجنبی زریں کے گھر پہونچ گئے۔ ایک نے دروازے پر قدیر کو آواز دی۔

''قدیر گھر پر نہیں ہے'' زریں نے اُنہیں بتایا'' آپ لوگ کون ہیں کہاں سے آئے ہیں؟''

''ہم لوگ سرکاری آدمی ہیں۔ لکھنؤ سے آئے ہیں''

''قدیر سے کیا کام ہے؟''

''دیکھئے ہم آپ کو سب باتیں نہیں بتا سکتے۔ ویسے آپ قدیر کی کون ہیں؟''

''میں اس کی ماں ہوں'' وہ بولی

''پھر تو ٹھیک ہے۔ اگر آپ قدیر کی ماتا جی ہیں تو آپ سے کیا چھپانا'' وہ بڑی رازداری سے بولا ''دراصل ہم کچھ روپے لائے ہیں اُنھیں دینے کے لیے۔ گورنمنٹ سے ریل درگھٹنا کا معاوضہ ملا ہے''

''ہاں ہاں مجھے معلوم ہے'' زریں جلدی سے بول اُٹھی ''پچاس ہزار روپے ہیں نا؟''

''اوہو- ذرا دھیرے بولئے'' اس نے کہا ''رات کا ٹیم ہے۔کوئی سن لے گا تو ہم لوگوں کی بھی مصیبت آ جائے گی۔اچھا قدیر کتنی دیر میں واپس آ جائیں گے۔ہم تھوڑی دیر انتظار کرلیں گے''

''وہ تو اسی کام کے لیے لکھنؤ گیا ہے'' زریں بولی ''ہوسکتا ہے کہ کل شام تک واپس آئے''

''اوہو-تب تو ہمارا یہاں پر انتظار کرنا بیکار ہے'' پہلے آدمی نے کہا ''اچھا ہے کہ ہم لوگ اسی وقت واپس چلے جائیں۔کیوں کہ بہن جی اتنی روپوں کے ساتھ ہم رات کے وقت ادھر اُدھر نہیں گھوم سکتے۔ذمہ داری بڑی چیز ہوتی ہے''-آپ سمجھ رہی ہیں نا؟''

''تو کیا آپ لوگ اسی کام کے لیے لکھنؤ سے آئے ہیں؟'' زریں نے پوچھا

''اور کیا'' اس بار دوسرا آدمی بولا ''یہی کام تھا ہمیں تو گھر ڈھونڈنے میں رات ہوگئی۔بہن جی-گاؤں میں کوئی کھانے پینے کی یا حلوائی کی کوئی دوکان ہے جہاں پر بھوجن مل سکے''

''ارے آپ ہمارے گھر میں کھائیں گے'' زریں نے جلدی سے کہا ''کمرے میں بیٹھ جایئے۔میں پانچ منٹ میں آملیٹ اور پراٹھے بنائے دیتی ہوں''

''نہیں بہن جی-دھنیہ واد'' پہلا بولا ''ہم لوگ شاکھاہاری ہیں انڈے نہیں کھاتے''

''تو آلو کی سبزی بن جائے گی۔بس تھوڑی دیر آپ لوگ آرام کرلیں''

''کیوں گوبردھن بابو-کیا وچار ہے آپ کا؟'' دوسرے نے پوچھا

''ارے بھائی-انکار تو نہیں کرتے بنتا-بہن جی پریم پورو ک کھلا رہی ہیں تو کھانے میں کیا حرج ہے''

''اور بھوک بھی تو لگی ہے'' تیسرا بولا ''زیادہ زیادہ ہم اپنے بھوجن کا اُچت مول دے دیں گے بہن جی کو''

زریں کچن میں پراٹھے سبزی بنانے چلی گئی تو تینوں گھر کے اندر آ گئے اور صدری دروازہ اندر سے بند کرلیا۔تین آدمیوں کے اندر آنے اور دروازہ بند ہونے پر زریں چھنکی تو ایک نے کہا ''آپ جتنا نہ کریں بہن جی ہم نے سرکاری دھن کی سُرکشا کے لیے دروازہ بند کیا ہے کیونکہ یہ رات کا سمے ہے گاؤں میں چور ڈکیت بھی تو ہوسکتے ہیں''

''مول چند ہم سے بھول ہوگئی'' دوسرا بولا ''بہن جی گھر میں اس سمے اکیلی ہیں اور رات کا ٹیم ہے۔پھر گاؤں کا معاملہ ہے۔یدی گاؤں والوں نے دیکھ لیا تو ہمیں کیا کہیں گے اور ہم ٹھہرے سرکاری کرم چاری۔سب لوگ ہم ہی کو تو برا بھلا کہیں گے-ہے کہ نہیں؟''

''بہن جی آپ ہمارے کھانے کے لیے کشٹ نہ کریں'' گوبردھن نے کہا

''واہ واہ گوبردھن جی'' مول چند بولا ''ہم تو پہلے ہی آپ سے آگیہ لے چکے تھے تب اندر

آئے ہیں۔آپ اتنے بڑے دھرم آچاریہ ہیں تو روپے بہن جی کو دے دیجئے تا کہ ہمارے سر سے یہ بوجھ ہلکا ہو پھر ہم بھی لوٹ چلیں''

''ہاں دے بھی سکتے ہیں'' گوبردھن بولا ''دنیا میں سب بے ایمان ہی تو نہیں بستے۔ہاں تھوڑی ہچکچاہٹ رسید کی ہے۔بلا رسید لیے روپیہ کیسے دے سکتا ہوں''

ان لوگوں میں اس طرح باتیں ہو رہی تھیں کہ زریں کچن میں بیٹھی بیٹھی سن سکے

''ہاں بھائی سرکاری روپیہ ہے۔اپنا ہوتا تو چلو کوئی بات نہیں۔دے بھی دیتے''

''ارے ہاں بڑے آئے دینے والے۔مول چند بہت بڑھ چڑھ کے نہ بولو''

''چلو ہم اپنا منہ سئے لیتے ہیں بس-تم ہی جیتے'' مول چند نے کہا

''منہ سی لوگے تو کھاؤ گے کیسے'' گوبردھن نے کہا ''اور شری مان میں پوچھتا ہوں تمہاری تھیلی میں روپیہ ہے بھی۔ابھی پراٹھے کھا کے منہ پونچھتے نکل جاؤ گے تب پوچھوں گا کیا دیا بہن جی کو''

''ان سے کہو پہلے نقد نامہ نکالیں''

''اب تم لوگ مجھ سے تکرار پر اُتر آئے ہو اس لئے چپ ہو رہا ہوں''

''یہ سب بھوک کی چمتکار ہے'' تیسرا بولا ''ذرا دیر چپ رہو پھر چہکنا''

زریں نے کچن سے آواز دی

''بھائی صاحب ہینڈ پمپ کے نیچے بالٹی رکھی ہے آپ لوگ ہاتھ منہ دھولیں''

''اُٹھو بھائی گوبردھن پرشاد'' مول چند بولا ''لگتا ہے پراٹھے تیار ہوگئے''

گرم گرم پراٹھے اور آلو کے قتلے اور تھوڑا آم کا اچار نکال کر زریں نے سینی پر رکھا چینی کی تین پلیٹیں دوسرے ہاتھ میں لیں اور کچن کے دروازے سے بولی

''بابو جی-یہ تھالی لے لیجئے''

تیسرا ساتھی جو زیادہ بھوکا ہونے کی وجہ سے کم بول رہا تھا لپک کر گیا اور سینی لے کر بولا ''دھنیہ واد بہن جی-ہی ہی ہی-میں نے کہا کچھ دارو شارو بھی ہے آپ کے یہاں؟''

اس فرمائش پر زریں کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی کچھ بولنا چاہا لیکن منہ سے آواز نہ نکلی

''چلو کوئی بات نہیں'' وہی بولا ''ہم اپنے ہی بوتل سے پی لیں گے۔ہمارے پاس ہے''

''دیکھئے'' زریں بمشکل بول سکی آپ لوگ یہاں بیٹھ کر شراب نہ پیجئے گا''

''بے شک-بے شک'' مول چند بولا ''ہم لوگ یہاں لیٹ کر پی لیں گے کیوں گوبردھن''؟

اب زریں کا دماغ بری طرح سنسنانے لگا اُسے موقع کی نزاکت کا پورا پورا احساس ہوگیا مگر وہ کر ہی کیا سکتی تھی۔ایک مجرم کی طرح کچن کی دیوار سے لگی گھڑی تھی اور وہ تینوں جانوروں کی طرح

جلدی جلدی کھانے میں لگ گئے۔

''آیئے بہن جی آپ بھی بسم اللہ کیجئے'' تیسرا کچن کی طرف کن انکھیوں سے دیکھ کر بولا

زریں نے کوئی جواب نہیں دیا تو مول چند نے تیسرے ساتھی کو ڈانٹا

''ابے کم پڑ جائیں گا ہمیں''

''بڑا اسوادش بھوجن ہے'' گوبردھن نے کہا ''واہ بہن جی – واہ!''

''دیشی گھی کے پراٹھے لگتے ہیں'' مربھو کا ساتھی بولا

مول چند نے بوتل کھول کر شراب پی پھر بولا

''کہیں پراٹھے کی جگہ کچوڑی ہوتی نا – تو بس – ہائے رے دیّا''

''بس ہائے رے دیّا'' گوبردھن نے نقل اتاری ''ابے مول چند – ابے اتنی ہی تڑپن ہے تو مانگ لے بہن جی سے – پھولی پھولی کچوڑی – گرم گرم کچوڑی''

مربھو کا ترکاری کی پلیٹ لے کر کچن کی طرف بڑھا

''تھوڑی سبزی اس میں اور دے دو کچوڑی دیوی''

زریں کو پوری طرح احساس ہو چکا تھا کہ اس نے غلطی پر غلطی کی ہے مگر اب وہ کچھ کر بھی نہیں سکتی تھی۔ کچن کے دروازے میں اندر سے بند کرنے کے لیے کنڈی بھی نہیں تھی۔ سبزی کی پلیٹ پکڑنے کے لیے جیسے ہی زریں نے ہاتھ بڑھایا مربھو کے نے زریں کی کلائی تھام لی اس کے دوسرے ہاتھ میں لمبا چاقو تھا جس کی نوک زریں کے گلے پر تھی

''آواز نہ نکلے منہ سے'' اُس نے بڑی سختی سے ڈانٹا ''نہیں تو سمجھ لو چاقو کی دھار بڑی چکا چک ہے۔ سٹ سے گلا کٹ جائے گا یہیں پر حلال کر دوں گا''

زریں کی سانس تیز تیز چلنے لگی پھر ذرا ہی دیر میں وہ بے ہوش ہو کر گرنے لگی۔

اس آدمی نے آگے بڑھ کر زریں کے دونوں شانے پیچھے سے پکڑ لئے اور ساتھی سے بولا

'دجلدی کرو – جلدی کرو''

تینوں نے مل کر جلدی جلدی بے ہوش زریں کے ہاتھ پاؤں رسیوں سے جکڑے منہ پر کپڑے کی پٹی کس کر باندھی اور ایک بورے کے اندر ٹھونس کر اسکے منہ کو کس کر باندھ دیا

''پیٹھ پر لاد دو – جلدی کرو – جلدی''

رات کے اندھیرے میں وہ تینوں بورے میں بند زریں کو لاد کر باہر نکل گئے۔

زریں کی غش سے آنکھ کھلی تو اس نے اپنے آپ کو ایک آرام دہ بستر پر پایا۔ داروغہ شیر علی سرہانے بیٹھے اس کے سر کے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کر رہے تھے اور بار بار جھک جھک کر اس

کے چہرے کو دیکھتے جاتے تھے کہ ہوش آیا یا نہیں۔ زرّیں نے ہوش میں آتے ہی پوچھا

''میں کہاں ہوں۔ میں یہاں کیسے آئی۔ وہ لوگ کہاں ہیں''

شیر علی نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بڑے پیار سے کہا

''گھبراؤ نہیں۔ تم میرے گھر میں ہو'' پھر اس کے ہاتھ کو اپنے ہونٹوں سے چومتے ہوئے کہا

''بڑی خیریت ہوئی جان من۔ اگر میں ٹھیک وقت پر وہاں نہ پہونچ جاتا تو وہ تینوں ڈاکو تم کو بورے میں بند کر کے نہ جانے کہاں لے جاتے۔ میں نے اُنھیں للکارا تو وہ بورا زمین پر ڈال کر بھاگ نکلے۔ خیر اب تم بتاؤ کہ یہ سب کیسے ہوا۔ تم ان کے ہاتھوں میں کیسے پڑ گئیں''

زرّیں نے سارا واقعہ سچ سچ بتانا چاہا مگر پھر کچھ سوچ کر خاموش رہی۔ شیر علی نے اس بار اس کے ہونٹوں کو اپنی انگلی سے چھو کر کہا ''بتاؤ۔ کیا قصہ ہے''

زرّیں نے قصہ سنانے کے بجائے پوچھا ''وہ تینوں ڈاکو بھاگ گئے کیا؟''

''شیر علی سے بھاگ کر کہاں جاتے'' اس بار وہ اس کے چہرے پر کافی جھک گئے ''میں نے ان تینوں کو پکڑ کے حوالات میں بند کر دیا ہے مگر ابھی ان سے پوچھ گچھ نہیں کر سکا۔ زرّو میں تو سمجھا تھا کہ بورے میں چوری ووری کا مال ہوگا۔ مگر کھولنے پر تم نکلیں''

پھر ہلکا سا قہقہہ لگا کر دھیرے سے بولے

''اور ایک طرح سے تم بھی چوری ہی کا مال ہو۔ کیوں؟ سنتے ہیں چوری کا گڑ بہت میٹھا ہوتا ہے''

زرّیں نے بستر سے اٹھ کر بیٹھنا چاہا

''تم اُٹھو نہیں۔ ایسی ہی لیٹی رہو۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے'' انھوں نے اس کے شانے دبائے

''مجھے اپنے گھر جانے دیجئے''

''اس وقت کہاں جاؤ گی۔ صبح کو گھر جانا'' شیر علی کرسی چھوڑ کر خود بھی بستر پر آ گئے اور نرمی سے بولے

''زرّو آج رات یہیں رہ جاؤ۔ ارے بھائی ہمارے تمہارے بیچ تکلّف تو پہلے ہی روز ختم ہو گیا تھا پھر یہ ہچکچاہٹ کیسی۔ ایک حساب سے تو ہم دونوں میاں بیوی ہو ہی چکے ہیں''

''کس حساب سے ہو چکے ہیں؟'' زریں نے ناپسندیدگی سے پوچھا

''وہ ایک کہاوت ہے نا کہ میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔ میں نے تو دل ہی دل میں تمہیں اپنی شریک حیات مان لیا ہے اس لئے آدھی کہاوت تو پوری ہو چکی۔ آدھی تم پوری کر دو''

اب انھوں نے جھک کر اس کے ہونٹوں کو چومنا چاہا

''نہیں'' اس نے جلبلا کر پھر اٹھنا چاہا

”نہیں کیوں؟“ وہ بولے ”یہ خانہ خراب میر صاحب اگر حرامی پن نہ کرتا تو تم میری بیوی کب کی ہو چکی ہوتیں اور اس وقت میں تمہیں اپنی آغوش میں لے کر.........“

”کیا کرتے؟“ زرّیں نے احتجاج کیا ”بس ہٹ جایئے۔ چھوڑیئے مجھے“

”ہائے۔ کتنی چھوٹی۔ گدگدی سی ہو تم۔ قسم سے جیسے گلاب کا پھول۔ رات کی رانی“ زرّیں غصّہ بھری نظروں سے شیر علی کو دیکھ رہی تھی۔ وہ جذباتی ہو کر شعر پڑھنے لگے

غازہ ہے تیرے رخ پہ جو رنگ عتاب کا
(قسم سے) کانٹا ہے ہر نگاہ میں چہرہ گلاب کا

زرّیں نے اس شعر پر بھی کچھ نہ کہا۔ بستر پر بیٹھے بیٹھے اپنے کپڑے درست کرنے لگی

”آجاؤ زرّو“ اس بار شیر علی نے اُسے زیادہ گرم جوشی سے اپنی طرف کھینچنا چاہا

”ہٹ!“ اور اس کے ساتھ ایک کرارا طمانچہ اس نے شیر علی کے گال پر جڑ دیا پھر دوسرے ہی لمحہ کسی نے باہر سے ادھ کھلی کھڑکی کے دونوں پٹ کھٹاک سے کھول دیئے۔ اور پھر نیم تاریکی میں باہر سے اُچھل کر وہ کھڑکی پر آیا اور وہیں سے بڑے موٹے ڈنڈے کا بھرپور وار اس نے شیر علی کی کھوپڑی پر جما دیا۔ وہ بے ہوش ہو کر فرش پر ڈھیر ہو گئے۔

★★★

میر فدا حسین کی ایما پا کر کرامت علی جائس سے مدنی پور کے لئے چل پڑا اور رات میں اس وقت پہونچا جب زرّیں کو شیر علی کے آدمی بورے میں ڈال کر لے جا چکے تھے۔ دیر رات میں گھر کے دروازوں کو بھاڑوں بھاڑ کھلا دیکھ کر کرامت علی کے دل میں کچھ شک پیدا ہوا۔ اندر جا کر اس نے زرّیں اور قدیر کو باری باری کئی آوازیں دیں گھر کے ہر کونے میں انھیں تلاش کیا اور جب کوئی نہ دکھائی دیا تو اُسے سچ مچ بڑی تشویش ہوئی گھر کے اندر بھی عجیب افراتفری پھیلی تھی۔ دالان میں کئی جھوٹی پلیٹیں تخت پر رکھی تھیں جن میں آلو کے قتلے اور پراٹھوں کے ٹکڑے تھے۔ دو تین گلاسوں میں پانی، شراب کی خالی بوتل، زمین پر جلے ہوئے سگریٹ کے متعدد ٹکڑے اور کچن میں اوندھی پلیٹ اور بکھری ہوئی ترکاری یہ سب دیکھ کر کرامت علی کے دل میں بُرے بُرے خیال آنے لگے اور ایک نامعلوم اندیشے کو سوچ کر اس نے فوراً تھانہ جا کر رپورٹ کرنے میں بہتری سمجھی اس لئے اور بھی کہ اس خبر کو سنتے ہی داروغہ شیر علی دوڑ پڑے گا۔

رات میں دس بجے تھانہ مدنی پور کے اندر ایسا سنّاٹا طاری تھا جیسے وہاں کا سارا عملہ چھٹی پر چلا گیا ہو۔ سب انسپکٹر والے کمرے میں حولدار گنپت رام جماہی لے لے کر نیند بھگانے کی کوشش کر رہے

تھے ان کے سامنے میز پر کاغذات کی جگہ تمباکو اور چونے کی ڈبیاں رکھی تھیں۔ ایک بار اُنھیں نیند کا تگڑا جھونکا لگا تو وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے جیسے جھنجوڑ دیئے گئے۔ گڑبڑا کر بھجن گانے لگے

”ہے کرشن گووند ہرے مرارے“ عین اسی وقت کٹھہرے دار دروازے کے باہر سے کرامت علی نے پکارا ”داروغہ جی!“

”کون ہے بے؟“ گنپت رام چوکنّا ہوا

”حضور داروغہ جی۔ ایک رپٹ لکھانی ہے“

گنپت رام اٹھ کر اس کے سامنے پہونچے اور غور سے دیکھ کر پوچھا

”ابے اتنی رات میں رپٹ لکھائی جاتی ہے۔ جاؤ صبح کو آنا اس ٹیم نہ داروغہ ہیں نہ منشی“

کرامت علی نے کٹھہرے کی سلاخوں سے گنپت رام کو پچاس روپے کا نوٹ دکھایا

”بہت ضروری ہے سرکار“ کرامت گڑگڑایا ”دروازہ کھولئے تو بتاؤں“

گنپت رام نے پہلے پچاس کا نوٹ تھاما پھر لوہے کا جنگلہ والا گیٹ کھول دیا

”شری مان میں نے بتایا کہ اس ٹیم داروغہ جی نہیں ہیں“ پھر ذرا نرمی سے پوچھا

”تم کہیں باہر سے آئے ہو؟“

”ہاں“ پھر فوراً ہی سوال کیا ”کہاں گئے ہیں داروغہ جی“

یہ کہہ کر کرامت نے جیب سے پچاس کا ایک اور نوٹ نکالا

”یار تم نے تو حد کر دی“ گنپت نے وہ نوٹ بھی گھسیٹا ”اچھا خیر۔ تمہاری ضرورت بہت اُچت معلوم ہوتی ہے اس لئے تمہاری چنتا کو دیکھتے ہوئے تم کو داروغہ جی کا پتہ ٹھکانہ چپکے سے بتائے دیتا ہوں تم جا کر ان سے مل لو اور اپنی گاتھا سنا دو“

”بتایئے جلدی کہاں ہیں وہ“ کرامت نے پوچھا

”یار ایک اور نکالو“ گنپت رام نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کرامت کی جیب کو دیکھا

کرامت نے پچاس کا ایک نوٹ اور نکالا ”اب خلاص۔ جلدی بتایئے کہاں ہیں داروغہ جی“

”اُدھر دیکھو۔ وہ سامنے بھوانی پرشاد منشی کا کوارٹر ہے وہ چھٹی پر اپنے گاؤں پھپھوند گیا ہے اور داروغہ جی اسی میں وشرام کر رہے ہیں۔ ذرا بہت نرمی کے ساتھ جگانا۔ جاگو موہن پیارے۔“

کرامت علی نے بھوانی پرشاد کے کوارٹر کے چاروں طرف چکر لگایا۔ پچھواڑے کھیت کی طرف جو کھڑکی تھی وہ ادھ کھلی تھی اور اس میں سے بہت ہلکی ہلکی روشنی باہر نکل رہی تھی۔ کرامت نے کھڑکی کے دراز میں جھانکنے کے لئے آنکھیں لگائی تھیں کہ بڑا ہوش ربا منظر دکھائی دیا۔ زرّیں ایک بستر پر کہنیاں ٹکائے نیم دراز اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے شیر علی کو گھور رہی تھی اور وہ اس کی طرف پیار بھری نظروں سے

دیکھ کر کہہ رہے تھے

''ہائے کتنی چھوٹی۔گدگدی سی ہو تم۔قسم سے جیسے گلاب کا پھول۔جیسے رات کی رانی''

یہ دلخراش منظر دیکھتے ہی کرامت کا دماغ گرم ہوگیا۔کوئی بڑی موٹی سی گالی اس کی زبان پر آتے آتے رہ گئی اگر اس وقت اس کے پاس کوئی مہلک ہتھیار ہوتا تو وہ ضرور شیر علی کو کیفر کردار کو پہونچا دیتا۔اس بیچ داروغہ نے زرّیں کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اپنی باہوں میں کھینچا

''آجاؤ زرّو''اور پھر زرّیں کے ''ہٹ'' کے ساتھ داروغہ کے گال پر اس کا بھرپور طمانچہ لگتے ہی کرامت کھڑکی کے پلّوں کو دھکّا دے کر تیر کی طرح اندر گھس پڑا اور اپنے موٹے ڈنڈے کا ایک کرارا ہاتھ شیر علی کی کھوپڑی پر جمایا تو وہ چکّرا کر زمین پر ڈھیر ہوگئے۔

''زرّو۔جلدی چل۔نکل چلیں یہاں سے''وہ زرّیں کا ہاتھ پکڑ کر دروازے کی طرف بڑھا اور ایک سکنڈ سے بھی کم عرصہ میں دروازے کی سٹکنی کھول کر اُسے باہر کھینچ لایا

''تم یہاں کیسے آگئے؟''زریں نے بڑے تعجب سے پوچھا

''پہلے بھاگو یہاں سے۔بعد میں بتاؤں گا''

دونوں رات کی تاریکی اور سنّاٹے میں کھیتوں کی طرف تیزی سے بھاگے راستے بھر ان دونوں کو کسی نے بھاگتے نہیں دیکھا یہاں تک کہ دونوں گھر پہونچ گئے۔

زرّو۔اس وقت گھر میں رکنا ٹھیک نہیں تھوڑی ہی دیر میں شہر علی اور اس کے سپاہی گھر کو گھیر لیں گے پھر ہم دونوں مصیبت میں پڑجائیں گے۔ٹرین کے آنے کا وقت بھی ہو رہا ہے چلو ہم لوگ یہاں سے نکل چلیں۔''

کرامت نے گھر کا صدری دروازہ اندر سے بند کیا اور چھت سے کود کر باہر آیا

''اگر گھر میں باہر سے تالا لگا کر جاتے تو شیر علی ہمیں اسٹیشن پر دھر لیتا۔اندر سے بند کرنے میں کم از کم گھنٹہ آدھ گھنٹہ وہ اسی خیال میں رہے گا کہ تم گھر کے اندر ہی ہو''

پھر رات کے اندھیرے میں دونوں ریلوے اسٹیشن پہونچ گئے اور عمارت سے دور ایک سنّاٹے کی جگہ چھپ کر بیٹھ گئے۔ٹرین کے آنے میں ابھی کچھ دیر تھی۔

''ہاں تو تم اس داروغہ کے بچے کے یہاں اس وقت کیا کرنے گئی تھیں۔بہت یارانہ بڑھا لیا ہے اس سے؟سوچو اگر میں ٹھیک وقت پر نہ پہونچ جاتا تو جانتی ہو وہ کیا کرتا؟''

''وہ بہت دنوں سے میرے پیچھے پڑا ہے''زرّیں نے کہا

''اور میں نے تیری محبت میں جو اتنی زندگی گذار دی تو تو نے مجھ پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ تو نے اس کی ہمّت بڑھائی ہوگی تب ہی تو وہ تیری طرف بڑھا۔اس دن وہ تیرے گلے میں چمپا کلی دیکھ کر

کیسا لہلوٹ ہو رہا تھا۔کب ہو رہی تم دونوں کی شادی؟''

''شادی کی بات تمہیں کس نے بتائی؟''زرّیں نے پوچھا

''اُسی نے بتائی ہے''کرامت بولا''کہتا تھا ہم دونوں ساڑھو بھائی ہو جائیں گے''

''کہنے دو اُسے''زرّیں نے کہا''تمہیں میر صاحب کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ کہاں ہیں''

''ہاں۔وہ جائس میں ہیں۔''وہ بولا''تمہیں پتہ نہیں لاڈلی کی شادی ہوگئی''

''شادی ہوگئی؟۔کہاں۔کس کے ساتھ؟''

''چلو اُٹھو۔راستہ میں سب بتاؤں گا۔ٹرین آنے والی ہے''کرامت بولا

کان پور جانے والی پسنجر گاڑی کے ایک کم روشن ڈبّے میں یہ دونوں بلاٹکٹ لئے بیٹھ گئے۔ گاڑی میں بہت بھیڑ تھی کچھ مسافر سیٹوں پر لیٹے تھے۔ان دونوں کو بیٹھنے کے لئے جو جگہ ملی وہ دروازے کے قریب والے پیشاب خانہ کے پاس تھی تھوڑی سی جگہ میں یہ دونوں بھی گھُس پل کر زمین پر بیٹھ گئے۔ اس کسا کسی میں جو جسمانی تکلیف کرامت کو پہونچ رہی تھی وہ زرّیں کے گداز اور گرم بدن کے لمس اور اُسے تقریباً اپنے بازوؤں میں لپٹا رہنے کی نشہ خیز لذّت کے آگے کچھ بھی نہ تھی۔گاڑی کی رفتار میں تیزی آنے سے اندر والے سبھی مسافر ہچکولے کھاتے اور اونگھتے رہے کرامت ان ہچکولوں کا فائدہ اٹھا کر زرّیں کی قربت کا بھرپور مزہ لینے لگا۔پھر دھیرے سے بولا

''زرّو۔اور ادھر کھسک آ۔تجھے ایک بات بتاؤں''

اس کے اور زیادہ کھسکنے کو جگہ تو تھی نہیں مگر زرّیں نے کرامت کے کہنے پر کچھ اِدھر اُدھر ہو کر تقریباً اپنی ہی جگہ پر پہلو بدلنے کے بعد گویا اس کا کہنا مان لیا۔اس کی اس نرمی پر کرامت قوی دل ہو کر بولا

''سُنا زرّو۔میں نے میر صاحب سے بات کر لی ہے۔جانتی ہو میں نے ان سے کیا کہا۔میں نے کہا میر صاحب اگر تم میری زرّو کو مجھے واپس کر دو تو میں زندگی بھر تابعداری کروں گا اور اگر نہیں دیتے تو پہلے میں تمہیں ختم کروں گا پھر زرّو کو مار کر ریل کی پٹری پر لیٹ جاؤں گا''

''ارے واہ!''وہ ہنسی''میں نے کیا کیا ہے جو مارو گے؟''

''تم جوان کے اشاروں پر ناچتی ہو''کرامت نے کہا''اگر تم نے شروع میں میری بات مان لی ہوتی تو آج نہ جانے میرے کتنے نہ پیدا ہونے والے بچّوں کی ماں ہوتیں۔اچھا چلو یہی بتا دوں کہ اگر میر صاحب نے اب بھی بدمعاشی دکھائی تو کیا تم میرے ساتھ رہنے کو تیار ہو جاؤ گی؟''

''اُوہنہ!۔ہٹاؤ ان باتوں کو''زریں نے باتوں کا رخ بدلا''یہ بتاؤ کہ لاڈلی کا بیاہ کہاں ہوا۔ کس کے ساتھ ہوا؟''

''جائس میں ہادی کے بیٹے وقّن کے ساتھ''کرامت نے بتایا۔پھر پوری تفصیل کے ساتھ

اس نے شادی کی بات زرّیں کو بتائی اس کی بدتمیزی سے لے کر لنگڑا ہو جانے کی بات تک

''وہ تو بڑا بُرا آدمی ہے'' زریں نے کہا ''میری بیٹی اس کے گھر میں خوش نہ رہے گی''

''خوش رہے گی'' کرامت ہنسا ''اس کا دولھا بڑا بھلا مانُس ہے۔ میں نے سنا ہے وہ لاڈلی کو دل و جان سے پیار کرتا ہے۔ ہادی سالا تو اب لنگڑا ہو چکا ہے''

کوئی چھوٹا اسٹیشن آ رہا تھا۔ پٹڑیوں پر ریل گاڑی کی کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ ہلکے ہلکے ہچکولے آنے لگے تو کرامت نے ایک بار پھر زرّیں کو چمٹانا چاہا۔ وہ اس بار بھی کچھ نہیں بولی

''زرّو۔ بس تو میری ہو جا۔ میں تجھے سونے چاندی سے لاد دوں گا۔ ہیرے جواہرات سے سجا دوں گا''

''اچھا!'' وہ اس طرح ہنسی جیسے کرامت کی بات کا یقین نہ آیا ہو ''کب؟''

''جب تو میری ہو جائے گی'' وہ بولا ''ہم دونوں۔ دور۔ بہت دور چل کے رہیں گے''

کرامت کی کسی بات پر زرّیں نے دھیرے سے احتجاج کیا ''نہ بھائی۔ یہ سب'' تو ان کے آگے کھڑے ہوئے ایک مسافر نے گھوم کی ان دونوں کی طرف دیکھا اور دونوں کو بڑے رومانی پوز میں بیٹھا دیکھ کر بولا ''دھنیہ ہو مہاراج۔ ارے ہم کہی ای ریل گاڑی کا ڈبہ ہو۔ تم لوگ کا کرت ہو''

''بیٹھے ہیں۔ اور کا کرت ہیں۔ تم کا کونو تکلیف ہوت ہے؟'' کرامت نے تڑاک سے جواب دیا

''اے ناہیں بھیّا'' مسافر بولا ''لیو ہم اُپن منہہ دوسرے طرف کیہے لیت ہے''

زرّیں نے اپنے آپ کو کرامت کی باہوں سے الگ کیا۔ کرامت برا مان کر مسافر سے بولا

''کاہے نہیں۔ جرور کر لیو۔ واہ بھیّا واہ۔ اب تو اپنی گھر والی کو بھی ساتھ لے کر چلنا مصیبت ہے''

کانپور اسٹیشن پر گاڑی پہونچی تو اس وقت رات کے ساڑھے دس بج چکے تھے کرامت نے بتایا کہ جائس جانے والی بس کل دن میں اسٹیشن ہی کے پاس سے ملے گی اس لئے رات گذارنے کے لئے کسی ہوٹل میں ٹھہرنا ہوگا۔ زرّیں کی رائے تھی کہ رات اسٹیشن ہی پر لیٹ بیٹھ کر کاٹ لی جائے مگر کرامت نے نہیں مانا۔ اسٹیشن سے باہر نکل کر زرّیں نے پوچھا ''یہ بتاؤ۔ تم مجھے ہیرے جواہرات میں کیسے سجاؤ گے؟''

''یہ تو وقت آنے پر معلوم ہوگا۔ تم خود ہی دیکھ لوگی بتانے سے کیا فائدہ''

زرّیں ہنس کر بولی ''ہاں۔ کچھ کپڑوں کے ٹھاٹ باٹ سے تو لگتا ہے کہ کہیں سے دولت ہاتھ لگ گئی ہے۔'' ''کیوں؟۔ ہے نا یہی بات؟''

''تمہیں آم کھانے سے مطلب ہے یا گٹھلی گننے سے'' کرامت بولا

''دونوں سے'' وہ ہنسی

''تو پہلے آم کھالو۔ گٹھلیاں بعد میں خود ہی گن لوگی'' وہ بولا

کانپور کے کلکٹر گنج چوراہے پر ایک چھوٹا موٹا ہوٹل تھا کرامت زرّیں کے ساتھ ہوٹل کے پاس پہونچ کر بولا ''دیکھو کوئی جھنجھٹ نہ کرنا ہم لوگ آج رات اسی ہوٹل میں ٹھہریں گے۔ کھانا کھائیں گے اور آرام سے لیٹیں بیٹھیں گے۔ کل دن میں جائس کی بس ملے گی''

''نہیں۔ ہوٹل میں نہیں'' وہ ہچکچا رہی تھی

''میں وہاں تمہیں کھا جاؤں گا کیا؟'' کرامت بولا ''خواہ مخواہ مجھ سے ڈر رہی ہو۔ ارے میں کچھ نہیں کروں گا۔ کہو تو تم سے دو ہاتھ دور ہی رہوں گا۔ بس؟''

زرّیں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کی نیّت کو بھانپا۔ آنکھوں میں سچائی کی جھلک دیکھ کر دھیرے سے بولی ''اچھا چلو۔ مگر مجھ سے دور ہی رہنا ہوگا۔ تمہیں قسم دیتی ہوں''

ہوٹل کا منیجر ایک نوجوان لڑکا تھا اس نے ان دونوں کی انٹری رجسٹر پر درج کرتے ہوئے پوچھا ''سنگل بیڈ روم چاہئے یا ڈبل''

اس سے پہلے وہ کسی ہوٹل میں نہیں ٹھہرا تھا لڑکے کے پوچھنے کا مطلب نہ سمجھ کر بولا ''کیا؟''

لڑکا بہت ہوشیار اور چلتا پُرزہ تھا کرامت کے سوال پر اس کی نادانی کو تاڑ گیا ہنس کر بولا

''مطلب یہ ہے بڑے بھائی کہ آپ دونوں پتی پتنی ہیں تو آپ کو ڈبل بستر والا کمرہ چاہیئے اور اگر کہیں سے بھگا بھگو کر لائے ہیں......''

کرامت کے جواب دینے سے پہلے ہی زرّیں چمک کر بولی ''دیکھئے یہ میرے بہنوئی ہیں ہم کہیں سے بھاگ واگ کر نہیں آئے ہیں''

''اچھا اچھا اچھا'' وہ جلدی سے بولا ''تو یہ کہئے کہ آپ کو ڈبل بیڈ والا کمرہ چاہیئے۔''

''ہاں ہاں۔ وہی'' کرامت نے کہا

ہوٹل والا اپنا رجسٹر بند کر کے کھڑا ہو گیا اور بولا

''آپ لوگ ذرا دیر کو یہاں بیٹھ جائیے۔ میں اوپر آپ کا کمرہ کھول کر ٹھیک ٹھاک کر دوں''

کمرہ کھول کر ٹھیک ٹھاک کرنے کا تو صرف بہانہ تھا لڑکے کا مقصد کچھ اور ہی تھا۔ دل ہی دل میں وہ ان دونوں کی طرف سے مشکوک ہو ہی چکا تھا اُس نے کمرے کے اندر بیڈ کی اونچی تکیہ کے پیچھے آواز کو خفیہ طور پر ریکارڈ کرنے کے لئے منی مائک (بگ) لگا دیا اور اس سے جُڑا ہوا تار کمرے کی کارپیٹ (دری) کے نیچے سے اپنے کمرے تک پہونچا دیا۔ ایسا انتظام اُس نے اور بھی دوسرے کمروں میں کر رکھا تھا اور ریکارڈ کی گئی آوازوں کے ذریعہ وہ اکثر ٹھہرنے والوں کو بلیک میل کر کے روپے

اینٹھتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد منیجر نے ان دونوں کو اس کمرے میں پہونچا دیا۔

صبح سویرے چھ بجے جب کہ یہ دونوں سو رہے تھے تو کسی نے ان کے کمرے کا دروازہ کھٹ کھٹایا۔ کرامت نے بادل ناخواستہ اٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے ہوٹل والا کھڑا تھا

''تیار ہو جایئے۔ چھ بج گئے ہیں'' ہوٹل والے نے کہا

''ارے بھائی ہماری بس آٹھ بجے جائے گی۔ ابھی سے کیوں جگا دیا؟'' کرامت نے کہا

''چائے وائے نہیں پئیں گے؟'' اس نے پوچھا

''نہیں'' کرامت نے کہا ''ہم اتنے سویرے چائے نہیں پیتے''

''اور دوسری بات یہ کہ مسٹر شیر علی آئے ہیں'' ہوٹل والے نے کہا

''تو پھر؟'' کرامت بولا ''آئیں شیر علی۔ میں کیا کروں۔ اُنھیں آپ ٹھہرایئے کہیں''

''جناب وہ یہاں ٹھہرنے نہیں بلکہ ہی ہی ہی۔ اپنی محبوبہ کو لینے آئے ہیں''

یہ سنتے ہی زرّیں کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی ایک لمحہ کے لئے تو کرامت بھی سٹپٹایا مگر فوراً ہی اپنی گھبراہٹ پر قابو پا کر بولا

''اوّہ۔ تو میں کیا کروں بھائی اور یہ شیر علی ہیں کون؟۔ شیر ہیں ببّر ہیں کیا ہیں؟''

''ارے صاحب اندر آنے دیجئے تو بتاؤں'' یہ کہہ کر ہوٹل والا کمرہ کے اندر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بہت چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈ تھا کرسی پر بیٹھتے ہی بولا

وہ بہت بڑی توپ ہیں اور میرے ٹیپ ریکارڈ میں بند ہیں۔ لیجئے سنئے آپ لوگ'' لڑکے نے ٹیپ ریکارڈ چلا دیا۔ زرّیں جو بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی تھی اس کی طرف دیکھ کر لڑکے نے کہا ''شری متی جی۔ ذرا بہت دھیان سے سنئے گا''

ٹیپ سے زرّیں کی آواز آئی

''دولہا بھائی تم بہت برے ہو''

''ہاں میں اس لئے برا ہوں کہ میں نے تجھے اس بھیڑیئے داروغہ شیر علی کے چنگل سے چھڑا لیا۔ کیوں؟''

یہ کرامت کی آواز تھی ''سمجھ گیا میں۔ میں تمہاری اس رنڈوے داروغہ سے ضرور گہری سانٹھ گانٹھ ہے''

''وہ میرا کیا کر لیتا؟''

''وہ۔ ہاں اب تو ضرور کہو گی'' کرامت بولا ''کہہ لو کیوں کہ اب تو تم اس کی پہونچ سے باہر ہو۔ لیکن ذرا یہ بھی سوچو کہ اگر میں ٹھیک ٹائم پر وہاں نہ پہونچ جاتے تو کیا ہوتا۔ خیر جانے دو''

''ہونہہ۔ میں اس کو ہاتھ بھی نہ لگانے دیتی''

''اب تم اتنی جرنیل تو نہیں ہو کہ شیر علی سے جیت جاتیں۔ وہ تمہیں ایسا دبا لیتا کہ۔ بتاؤں کیسے؟''

''نہیں'' زرّیں نے ڈانٹا ''بس اب چپکے سے اپنا منہ اُدھر کر کے سو جاؤ''

''پہلے تم یہ بتاؤ کہ کیا داروغہ شیر علی تمہیں مجھ سے زیادہ پیار کرتا ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم۔ دیکھو دیکھو۔ بس وہیں رہو۔ مجھ سے وعدہ کر چکے ہو کہ دو ہاتھ دور ہی رہو گے''

''مگر تم نے تو میرے قریب نہ آنے کی قسم نہیں کھائی''

زرّیں بستر سے اُچک کر ہوٹل والے لڑکے پر شیرنی کی طرح جھپٹ پڑی

''بند کرا سے۔ بدمعاش کہیں کا'' وہ ٹیپ ریکارڈ چھیننا چاہتی تھی لیکن کامیاب نہیں ہوئی

''بس بس بس۔ اسے ہاتھ نہ لگانا شریمتی جی'' وہ بولا ''کون بدمعاش ہے یہ ابھی معلوم ہو جائے گا۔ میں نے پولیس انسپکٹر کو فون کر دیا ہے۔ جب تک وہ آئے تھوڑا اور سن لیجئے''

یہ کہہ کر اس نے ٹیپ ریکارڈ پھر آن کر دیا۔ زرّیں کی آواز آئی

''اب اگر تم نہ مانو گے تو میں شور مچاؤں گی''

''مچاؤ شور۔ ہم دونوں پکڑ کر حوالات میں بند کر دئے جائیں گے'' کرامت کی آواز تھی

''نہیں مانو گے تم؟'' زرّیں پھر ہوٹل والے پر چیخی ''میں کہتی ہوں فوراً بند کرو یہ باجہ''

لڑکے نے ٹیپ بند کر دیا

''کیا چاہتے ہیں آپ؟'' کرامت نے پوچھا ''یہ سب کرنے سے آپ کا مقصد کیا ہے؟''

''پولیس کے آنے سے پہلے پہلے اگر یہ ٹیپ آپ نے خرید لیا تب تو کوئی بات نہیں اور اگر پولیس کے ہتھے یہ ٹیپ چڑھ گیا تو۔ سمجھو گئی بھینس پانی میں'' ہوٹل والا دانت نکال کر بولا۔

''میں تجھے اٹھا کر باہر سڑک پر پھینک دوں گا'' کرامت کو طیش آ گیا اس نے جھپٹ کر نوجوان کو کمر سے پکڑا اور ایک ہی جھٹکے میں اُسے کھڑکی تک گھسیٹ لے گیا ''زندہ نہیں چھوڑوں گا حرام زادے سور کی اولاد'' کرامت نے ایک ہاتھ سے اس کا ہاتھ اور دوسرے سے اس کی گردن تھامی پھر اسی طرح اٹھا لیا۔ زریں چیخ کو بولی

''نہیں۔ نہیں۔ چھوڑ دیجئے۔ جانے دیجئے''

عین اسی وقت کسی نے باہر سے دروازہ کھٹ کھٹایا

''کون ہے؟'' کرامت نے پوچھا

''پولیس انسپکٹر شاکر علی''

کرامت نے جیسے ہی ہوٹل والے کی گردن چھوڑی وہ اپنا ٹیپ ریکارڈ اٹھا کر سرپٹ بھاگا

اور دروازے سے نکل گیا۔ یہ دونوں دیکھتے رہ گئے۔

''اسی لئے میں ہوٹل کو منع کرتی تھی۔ چلو ہم لوگ یہاں سے چلیں'' زرّیں نے کہا

''زرّو۔تم نے اس کا باجہ اٹھا کیوں نہیں لیا میں تو اس کو پکڑے تھا''

پھر ذرا دیر کچھ سوچ کر کرامت نے پوچھا

''میرے خیال میں تو ہمیں اس سے باجہ خرید لینا چاہئے نہیں تو یہ ضرور کمینہ پن کرے گا''

''کرنے دو'' زرّیں نے کہا ''ہم کہیں گے یہ سب بالکل جھوٹ ہے۔ یہ ہماری آواز نہیں ہے یہ ہم سے پیسے وصول کرنے کی ترکیب ہے اس کی''

ہوٹل والا جب پولیس سب انسپکٹر شاکر علی کو پورا ٹیپ سنا چکا تو سب انسپکٹر اپنے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر کسی گہرے سوچ میں بیٹھ گیا۔ ٹیپ کا ڈرامہ پھر سے اس کے تصوّر میں سنیما کی فلم کی طرح چلنے لگا اور داروغہ شیر علی کا چہرہ بار بار اس کی نگاہوں میں آنے لگا۔ ہوٹل والا ان کے تفکّر کو دیکھ کر بولا

''کیا بات ہے انسپکٹر صاحب آپ کیا سوچنے لگے۔ آپ کی مرضی نہ ہو تو جانے دیجئے۔''

''نہیں نہیں پانڈے جی'' شاکر علی نے کہا ''آپ نے بہت اچھا کیا جو یہ ٹیپ مجھے سنا دیا۔ لائیے اسے میرے حوالے کیجئے میں ان بدمعاشوں کو وہ سزا دلاؤں گا کہ زندگی بھر یاد کریں گے''

ادھیڑ عمر کے پولیس انسپکٹر شاکر علی جن کی نفاست سے تراشے ہوئے داڑھی کے بال کھچڑی ہو چلے تھے ہوٹل والا لڑکا انھیں لے کر کرامت کے کمرے میں آیا۔ انسپکٹر شاکر علی اپنے عہدے کے جس دبدبے اور طمطراق میں آئے تھے وہ زرّیں کو پہلی نظر میں دیکھتے ہی ایک دم بھول گئے۔ جتنی ڈانٹ ڈپٹ اور پولیسی گالیاں وہ سوچ کر آئے تھے وہ رخصت ہوگئیں زرّیں کو دیکھنے کے بعد انسپکٹر شاکر علی نے کرامت کی طرف ایک نظر بھی نہیں ڈالی

''بہن۔ کیا بات ہے؟۔ گھبراؤ نہیں مجھے سچ سچ بتاؤ تمہارے ساتھ یہ کون ہیں۔ کہاں سے آرہی ہو۔ کہاں جانا ہے؟'' بہت سے سوال انھوں نے ایک ساتھ کر ڈالے

''ہم لوگ مدنی پور سے آرہے ہیں'' زرّیں نے بتایا ''یہ میرے بہنوئی ہیں۔ کرامت علی مدنی پور کا نام سنتے ہی انسپکٹر شاکر علی کا شبہ یقین میں بدل گیا اور شیر علی کے بارے میں جو کچھ انھوں نے ٹیپ میں سنا تھا اس کے بارے میں اب کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ رہ گئی۔

''کیوں کرامت علی صاحب'' وہ کرامت سے مخاطب ہوئے ''یہ آپ کی کیسی شرافت ہے کہ اپنی سالی کو لے کر ہوٹل میں شب باشی فرما رہے ہیں۔ میری بات چھوڑیئے اور ایمان سے بتایئے کیا جواب دیں گے آپ اپنی گھر والی کو اور کیا جواب دیں گی یہ اپنے خاوند کو''

''اوپر سے یہ مہاشے میری جان لینے پر تیار تھے'' ہوٹل والے نے مزید نمک مرچ لگائی

''دیکھئے پانڈے جی۔ اب آپ یہاں سے چلے جایئے'' شاکر علی نے کہا ''میں انکوائری کرلوں گا'' ہوٹل والا وہاں سے چلا گیا تو شاکر علی پھر کرامت سے مخاطب ہوئے

''ساری باتیں سچ سچ بتا دیجئے یہی آپ کے لئے مفید ہوگا کیوں کہ ٹیپ ریکارڈ پر میں نے ساری باتیں آپ دونوں کی سن لی ہیں اس لئے اگر مجھے جھانسہ دینے کی کوشش کی تو ابھی لے چل کر بند کردوں گا پھر کوئی ضمانت لینے والا بھی نہ ملے گا۔''

کرامت علی نے کہا ''انسپکٹر صاحب۔ میں سچ سچ بتا رہا ہوں یہ میری سالی ہیں۔ میری گھر والی اور ان کے خاوند دونوں اب اس دنیا میں نہیں رہے تو اگر ایک سچے مسلمان کی طرح ایمانداری اور شرع کی پابندی کے ساتھ ہم دونوں نکاح پر رضامند ہیں تو اس میں کوئی قانونی جرم تو نہیں ہو رہا۔ آپ ہی بتائیں۔''

''ان کے شوہر کو مرے کتنا عرصہ ہوا؟'' شاکر علی نے نیا سوال کیا

کرامت کے بولنے سے پہلے ہی زرّیں بول اٹھی ''بیس سال سے اوپر ہوئے''

''بیس سال!'' انسپکٹر نے تعجب کا اظہار کیا ''اگر میں کہوں کہ آپ دونوں جھوٹ بولتے ہیں تو؟''

''جی! ہم جھوٹ کیوں بولیں گے۔ ہم بالکل سچ کہہ رہے ہیں'' کرامت نے کہا

''جھوٹ بولنے کی ایک نشانی تو یہ ہے'' انسپکٹر نے زرّیں کی طرف اشارہ کیا ''یہ کپڑے یہ زیورات۔ یہ آرائش۔ یہ سنگھار کیا کسی بیس برس سے اوپر کی بیوہ کا ہوسکتا ہے بولئے بہن۔ کیا ہمارے ہندوستانی سماج میں کسی بیوہ کو ایسے سنگھار کی اجازت ہے۔ اگر نہیں تو پھر آپ کا کہنا جھوٹ ہوا کہ نہیں؟''

انسپکٹر کے اتنا کہنے پر کرامت تو لا جواب ہوگیا اور زرّیں کے چہرے سے بھی بے چینی اور گھبراہٹ ظاہر ہونے لگی یہ دیکھ کر شاکر علی تھوڑا سا مسکرائے اور بڑے نرم لہجہ میں بولے

''خیر یہ تو آپ لوگوں نے بہت ٹھیک کہا کہ اپنے کو میاں بیوی نہیں بتایا کیونکہ ہمیں تو آئے دن ایک سے ایک نمبری جھوٹوں سے سابقہ پڑتا رہتا ہے اور ہم منٹوں میں ان کی اصلیت معلوم کرلیتے ہیں۔ اب اگر آپ لوگ واقعی سچ بولتے ہیں تو پھر سچے مسلمان کی طرح ایمانداری اور شرع کی پابندی کرتے ہوئے نکاح کے لئے تیار ہو جایئے۔ میں ملّا جی کو یہیں بلواتا ہوں فٹافٹ نکاح ہو جائے گا'' اتنا کہہ کر انسپکٹر شاکر علی نے ہوٹل والے کو آواز دے کر کہا

''ارے میں نے کہا پانڈے جی۔ ذرا بیگم گنج پولیس چوکی پر فون کرکے سب انسپکٹر پٹن مور یہ سے بولئے کہ وہ چھوٹی مسجد والے مولوی عبدالستار کو اپنے ساتھ لے کر فوراً ہوٹل میں آجائیں میرا نام بتا دیجئے گا انسپکٹر شاکر علی''

پھر وہ ان دونوں سے مخاطب ہوئے ''میں دس پندرہ منٹ بعد پھر آؤں گا تب تک آپ لوگ کپڑے وغیرہ بدل کر تیار ہو جایئے گا۔ میں شکر چھوہارے لینے جا رہا ہوں''

انسپکٹر شاکر علی ان دونوں کو کمرے میں چھوڑ کر پانڈے جی کے پاس جا کر بیٹھ گئے شاید انھوں نے یہ ضروری سمجھا ہو کہ اتنے وقفے میں دونوں تنہائی میں بات چیت کر کے نکاح کے بارے میں فیصلہ کر سکیں۔ آدھے گھنٹے بعد سب انسپکٹر پپن مور یہ مولوی عبدالستار کو لے کر ہوٹل پہونچ گئے۔ شاکر علی انھیں لے کر کرامت کے کمرے پر آئے

''ہاں بھائی - تیار ہو گئے آپ لوگ؟ ملّا جی آ گئے ہیں''

زرّیں تو اس سوال پر خاموش رہی مگر کرامت نے جلدی سے جواب دیا

''جی ہاں - ہم لوگ تیار ہیں''

انسپکٹر شاکر علی نے ایک بار پھر زرّیں کی طرف دیکھا۔ اس کی خاموشی کو نیم رضامندی نہ سمجھتے ہوئے انھوں نے شاید اس کے دل کے اندر چھپے ہوئے تذبذب کو بھانپ لیا تھا اس لئے بڑی بزرگانہ شفقت کے ساتھ زرّیں کو اپنے پاس بلایا اور کمرہ سے باہر راہداری میں لے جا کر تنہائی میں کچھ دیر باتیں کرتے رہے پھر مولوی عبدالستار کو بلا کر انھیں کچھ سمجھایا۔ مولوی صاحب کھٹا کھٹ اثبات میں سر ہلانے کے بعد دو پولیس والوں کی موجودگی میں نکاح پڑھنے بیٹھ گئے اور جب صیغۂ نکاح جاری کر چکے تو اپنی ڈیڑھ مٹھی داڑھی کو بڑے پیار سے سہلا سہلا کر سبھوں کو مبارک باد دینے لگے۔ داروغہ شاکر علی نے اپنی جیب سے سو روپیہ کا ایک نوٹ نکال کر مولوی عبدالستار کو پیش کیا تو وہ اپنے بچے کھچے دانتوں کی نمائش کر کے معذرت خواہ ہوئے مگر شاکر علی نے زبردستی وہ نوٹ ان کے لمبے کرتے کی جیب میں ڈال دیا'' مولانا مول گنج سے بچّوں کے لئے مٹھائی لے لینا'' پھر ایک اور نوٹ نکال کر انھوں نے پانڈے جی کو دے کر کہا

''پنڈت جی - میری بہن کا عقد ہوا ہے بڑھیا دیسی گھی کی مٹھائی منگوایئے اور میری طرف سے سب لوگوں میں تقسیم کر دیجئے۔''

شاکر علی کی اس غیر متوقع فیاضی اور سیر چشمی پر سب ہی کو حیرت ہوئی مگر جب انھوں نے اپنی بہن کے عقد کی بات کہی تو پانڈے جی بھی بول اٹھے

''اور جناب میری طرف سے ان دونوں کے لئے ہوٹل میں تین دن کا کرایہ اور کھانا پینا بالکل مفت''

انسپکٹر شاکر علی خوش خوش وہاں سے چلے گئے۔

ہوٹل ''مے فسلائیٹ'' میں تین دن تک مفت رہنے اور کھانے کا فراخدالانہ آفر تو مل ہی چکا تھا اس لئے کرامت بیڈ پر آرام سے پیر پھیلا کر لیٹ گیا مگر زرّیں کو سب سے بڑی تڑپن یہ تھی کہ وہ کرامت کو چھپّر پھاڑ کر ملنے والی دولت کے بارے میں معلوم کرے

''اب ذرا سونے چاندی اور ہیرے جواہرات والی بات کرو'' وہ بولی

مگر کرامت کے دل کی تڑپن کچھ اور ہی چاہتی تھی۔ اس کا اضطراب اپنی نئی نئی بیوی کی قربت

پانے کے لئے تھا جس کے لئے وہ اب اپنے کو بہ ہمہ طور پر پورا پورا حق دار سمجھتا تھا اس کی اس بے تابی کو زرّیں اچھی طرح سمجھ رہی تھی اس لئے خود سپردگی سے بچنے کے لئے وہ ایک نہ ایک بہانہ کرتی رہی۔ کرامت نے کہا ''اچھا پہلے تم دروازے بند کر کے یہاں میرے پاس آؤ''

''اُونہک - پہلے وہ بات بتاؤ'' وہ بولی

''بتا دوں گا۔ بتا دوں گا'' وہ بولا ''دیکھو یہ پانڈے جی دیسی گھی کی تازی بالوشاہیاں رکھ گئے ہیں آؤ پہلے تمہیں مٹھائی کھلاؤں۔ تمہارا منہ میٹھا کروں۔''

''مٹھائی تم کھالو۔ میرا منہ مٹھا ہو جائے گا''

''لو - یہ میں نے کھایا - اب ایک تمہیں کھلاؤں گا اپنے ہاتھ سے کھولو منہ''

زرّیں نے دور ہی سے بیٹھے بیٹھے منہہ کھولا اور کرامت نے ہاتھ بڑھا کر ایک بالوشاہی اس کے منہہ میں گھسیڑ دی۔ زریں کا منہہ پوری طرح بند ہو گیا تو کرامت نے لپک کر اس کی کلائی تھام لی زریں احتجاجاً ''گوں۔ گوں'' کرتی رہ گئی مگر دوسرے ہی لمحہ وہ کرامت کی گود میں تھی۔

''اب کہاں جاؤ گی - یہ مچلنا و چلنا بے کار ہے''

دروازہ تو اندر سے بند نہیں تھا۔ تین چار جوان عورتیں کمرے کا دروازہ بھاڑم بھاڑ کھول کر کھڑی ''کھی کھی'' کر رہی تھیں ''بدھائی ہو - بدھائی ہو''

کرامت نے جھٹ مٹھائی کا ڈبہ ان کی طرف بڑھایا اور دروازہ اندر سے بند کر لیا

''کتنی شرم کی بات ہے ان عورتوں نے ہمیں دیکھ لیا'' وہ برا مان کر بولی

''اور اگر تم انھیں ان کے شوہروں کے ساتھ دیکھ لیتیں تو اور بھی شرم کی بات ہوتی''

''میں تم سے نہیں بولتی'' وہ بولی

''کیوں - کیا کیا ہے میں نے؟''

''وہ سونے چاندی والی بات - مجھ سے چھپا رہے ہو''

''چھپا نہیں رہا۔ بتا دوں گا۔ مگر ابھی نہیں'' کرامت بولا

''پھر کب؟'' اُس نے پوچھا

''جب تم پوری طرح میری دولھنیا بن جاؤ گی تب''

زرّیں نے نیا بہانہ تراشا ''پہلے دولھن بننے والی ساری چیزیں تو لاؤ۔ کپڑے، گہنے، سینٹ عطر مہندی''

''ارے کون سی بڑی بات ہے ابھی لا دوں گا مگر پہلے کہو کہ میں تیری دولھنیا ہوں''

''سمجھو کہہ دیا''

’’کہہ دیا تو پھر آ جاؤ‘‘ وہ آگے بڑھا

’’ہٹو‘‘

کرامت نے اب اپنا بیگ اُٹھایا اور اس میں سے پچاس پچاس روپے والی پانچ گڈیاں نوٹوں کی نکال کر زرّیں کو دکھائیں اور مسکراتا ہوا بولا

’’اچھا میری جان- میں چلا تمہاری فرمائش کا سامان لانے۔ مگر دیکھو جس طرح میں نے تمہاری بات مان لی ہے تو لوٹ کے آنے پر تمہیں بھی ماننا پڑے گا پھر میں ایک نہ سنوں گا۔ اور ہاں تم دروازے کی کنڈی اندر سے بند کر لینا۔ سمجھیں‘‘

مول گنج اور پریڈ کی دوکانوں سے اپنی نئی دولھن کے لئے قیمتی اور خوبصورت ساڑیاں، زیورات اور سنگھار کے لوازمات اور اپنے لئے بھی نئے ڈیزائن کے ریڈی میڈ کپڑے سوٹ شرٹ ٹائیاں جوتے وغیرہ خریدنے میں پندرہ ہزار روپے اور تین گھنٹے صرف کرنے کے بعد جب کرامت علی خوشی خوشی ہوٹل واپس آیا تو زرّیں کو کمرے میں نہیں پایا۔

باہر سے تالا بند تھا اور کنجی پانڈے جی کے پاس تھی۔ پانڈے نے کرامت کو بتایا کہ انور گنج تھانہ کے انچارج انسپکٹر شاکر علی آئے تھے اور وہ زرّیں کو اپنے گھر لے گئے ہیں۔

’’کیوں؟ -اپنے گھر کیوں لے گئے ہیں؟‘‘ کرامت نے سوال کیا

’’میں کیا بتاؤں‘‘ پانڈے نے کہا ’’ویسے وہ انھیں اپنی بہن کہہ رہے تھے تو شاید اسی لئے لے گئے ہوں‘‘

’’آپ نے روکا نہیں اُنھیں؟‘‘

’’میں کیسے روکتا؟‘‘ پانڈے نے کہا ’’میں نے تو تین دن مفت میں ٹھہرانے کو کہا ہے روپئے بھی ان سے نہیں لینے تھے اس لئے روکتا کیسے۔ یہ پولیس کے لوگ ہیں بھیّا۔ ان کے مار کی دہائی نہیں ہوتی‘‘

کرامت اندر ہی اندر کھولتا رہا کوئی جواب نہیں دیا تو پانڈے نے پھر چٹکی لی

’’نہ ان لوگوں کی زبان کا کوئی بھروسہ ہے نہ ہی نیت کا‘‘

’’مطلب؟‘‘ کرامت نے تیوریاں چڑھائیں

’’مطلب یہ کہ منہہ پر بہن کہہ رہے تھے اب دل میں کیا ہے وہ رام جانیں۔ ویسے بھائی صاحب اگر کوئی یہ کہے کہ آپ کی شادی کب ہوئی کس نے نکاح پڑھا تو اس کا کوئی پرمانٹر ہے آپ کے پاس؟ -نہیں نہیں ویسے ہی میں نے ایک بات پوچھی آپ سے‘‘

’’ہاں اب تو ایک بات ضرور پوچھیں گے آپ‘‘ کرامت بولا ’’یہ سارا بکھیڑا تو آپ ہی نے پھیلایا ہے‘‘ آپ ہی نے فون کر کے انھیں بلایا تھا اب کہتے ہو دل میں کیا ہے رام جانیں‘‘

’’واہ صاحب آپ تو الٹا مجھ پر برس پڑے‘‘ پانڈے بولا ’’لیجئے میں چلا جاتا ہوں۔ یہ سنبھالئے اپنے روم کی چابی‘‘

کرامت کو پانڈے کی اس بات میں وزن محسوس ہوا کہ اُس کے پاس نکاح کا کوئی ثبوت نہیں ہے کوئی بھی شک کر سکتا ہے وہ اسی ادھیڑ بُن میں مبتلا اپنے کمرے میں جا کر بیڈ پر گر پڑا اور اسی طرح نہ جانے کب تک پڑا رہا۔

ہوا یہ کہ دوپہر میں جس وقت کرامت اپنی نئی نویلی دولھن کے لئے مول گنج اور پریڈ کی دوکانوں سے کپڑے اور زیورات وغیرہ خرید رہا تھا اُسی وقت انسپکٹر شاکر علی اپنی منہہ بولی بہن زرّیں کے پاس آئے۔

’’بہن- مجھے دیر ہو گئی تمہیں بہت انتظار کرنا پڑا ہو گا۔ کرامت علی کہاں ہیں؟‘‘

’’وہ بازار گئے ہیں‘‘ زریں نے بتایا

’’ٹھیک ہے‘‘ وہ بولے ’’پہلے میں تمہیں یہ بتا دوں کہ ملاّ جی نے سچ مچ نکاح نہیں پڑھا جیسا تم چاہتی تھیں ویسا ہی ہوا ہے۔ تم اپنے دل میں اطمینان کر لو اچھی طرح سے‘‘

’’اس سے پہلے میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ آپ نے آتے ہی مجھے اپنی بہن کیوں کہا اس کے پیچھے کیا کوئی خاص بات ہے یہ بتائیے‘‘ زریں نے کہا

’’یہ جاننے کے لئے تمہیں میرے ساتھ میرے گھر چلنا ہو گا‘‘

’’کیوں؟‘‘ زرّیں نے پوچھا ’’یہاں کیوں نہیں بتاتے۔ گھر جانا کیوں ضروری ہے؟‘‘

’’دیکھو-تم میری طرف سے اپنے دل میں کوئی شک نہ لاؤ۔ جب میں نے تمہیں بہن کہا ہے تو بھائی کے فرائض بھی پورا کروں گا ویسے بھی اب تمہیں کرامت کے ساتھ اکیلی اس ہوٹل میں نہیں رہنا چاہیئے اُنھیں تو اس نکاح کی حقیقت معلوم نہ ہو گی اس لئے تم میرے ساتھ میرے گھر چلو وہاں تمہیں اپنی والدہ سے ملواؤں گا چل کے دیکھو وہ تم سے مل کر کتنا خوش ہوتی ہیں۔‘‘

’’اچھا چلوں گی‘‘ وہ بولی ’’مگر جلدی کیوں ہے دولھا بھائی کو آ جانے دیجئے‘‘

’’اوہو-تم اُنھیں دولھا بھائی کہتی ہو۔ کیا وہ تمہارے بہنوئی ہیں؟‘‘ شاکر نے پوچھا

’’جی ہاں-میری بہن اُن کو بیاہی تھی‘‘

’’چلو-یہ ایک اور نئی بات معلوم ہو گئی‘‘ شاکر علی نے اپنا ماتھا پیٹا

’’ایک اور نئی بات؟‘‘ زریں بولی ’’مجھے لگتا ہے آپ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں یا پھر مجھے دیکھ کر کسی غلط فہمی میں پڑ گئے ہیں۔ بتائیے کیا بات ہے؟‘‘

’’کوئی خاص بات نہیں۔ چلو میں تمہیں راستے میں بتا دوں گا‘‘

’’دولھا بھائی مجھے یہاں نہ پا کر پریشان ہوں گے‘‘

”میں ان کے لئے یہاں پر سندیسہ چھوڑ جاؤں گا۔ وہ میرے گھر آجائیں گے“ انسپکٹر نے کہا
انسپکٹر شاکر علی اُسے اپنی جیپ میں بٹھا کر اپنے گھر لے چلے راستے میں اُنھوں نے زرّیں کو بتایا
”بات صرف اتنی ہے کہ تمہاری صورت میری مرحومہ بہن نجمہ سے بہت ملتی ہے۔ تمہیں ہوٹل میں پہلی بار دیکھا تو دنگ رہ گیا اتنی مشابہت کم ہی دیکھنے میں آتی ہے۔“ اس لئے تمہیں دیکھتے ہی مجھے اپنی بہن یاد آجاتی ہے اور اس نسبت سے اگر میں تم کو اپنی چھوٹی بہن مانوں تو کیا حرج ہے“
زرّیں فرط حیرت سے اچھل پڑی ”تو کیا۔ مدنی پور تھانہ کے داروغہ شیر علی.....“
”ہاں—ہاں—وہ میرے بہنوئی ہیں“ شاکر علی نے کہا
”گاڑی روک دیجئے“ زریں خوف زدہ ہوکر بولی ”میں آپ کے ساتھ نہیں جاسکتی آپ مجھے دھوکہ دے کر لے جارہے ہیں اور پھر شیر علی کے حوالے کردیں گے“
”ڈرومت زرّیں۔ مجھ پر بھروسہ رکھو“ شاکر علی نے کہا ”میں ایک ایمان دار پولیس افیسر ہوں۔ آج تک مجھ پر کسی نے بے ایمانی، بددیانتی یا بدچلنی کے لئے انگلی نہیں اٹھائی۔ دشواری تو یہ ہے کہ میں نے تمہیں اپنی بہن مان لیا ہے مگر تم مجھے اپنا بھائی نہیں سمجھتیں۔ سنو میں نے تم لوگوں کی باتیں ٹیپ پر سن لی ہیں اور یہ جانتا ہوں کہ شیر علی شاید تمہارے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کررہے ہیں اس لئے پہلے تو میں ان کی طرف سے معافی مانگتا ہوں پھر یہ جاننا چاہوں گا کہ اُنھوں نے تمہارے ساتھ کیا زیادتی کی ہے“
”وہ میری مرضی کے خلاف زور زبردستی کے ساتھ مجھ سے نکاح کرنا چاہتے ہیں“ وہ بولی
”تم اطمینان رکھو۔ میرے ہوتے ہوئے وہ ایسا نہیں کرسکتے“ پھر ذرا دیر بعد سمجھا کر بولے
”حالانکہ ان کی اس خواہش کی جو وجہ میری سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ تمہیں دیکھ کر ضرور انھیں نجمہ کی یاد آجاتی ہوگی اسی لئے وہ تمہیں اس کے نعم البدل کے طور پر حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ان کی اس کوشش کو کسی حد تک حق بجانب اور جائز کہا جاسکتا ہے مگر میں تمہیں ان کی اس بات کو مان لینے کے لئے مجبور نہیں کروں گا۔ اچھا اب تم یہ بتاؤ کہ تم کرامت علی کے ساتھ مدنی پور سے کیوں نکلیں جب کہ وہاں تمہارا ایک جوان لڑکا بھی ہے“
”میں ان کے ساتھ جائس جانے کے لئے چلی تھی وہاں میری بیٹی کی شادی ہے“ وہ بولی
”یہ بات تو سمجھ میں آئی مگر اس کیسٹ میں تم لوگوں کی باتیں۔ کرامت علی کا تمہارے ساتھ عقد کی بات کرنا اور تمہارا عقد سے انکار ان سب کو میں کیا سمجھوں۔ تم شیر علی سے بھی بھاگتی ہو اور کرامت کو بھی لٹکائے ہو“
زرّیں نے ان باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ شاکر اُسے لے کر اپنے گھر آگئے۔
انسپکٹر شاکر علی کی ماں آسیہ خاتون ستّر سال کی بوڑھی عورت تھیں صاف رنگ اور پُروجیہہ

چہرہ آنکھوں پر پتلے فریم کا چشمہ اور سر کے بال بہت لمبے مگر سب سفید ہوچکے تھے۔ شاکر علی زرّیں کو لے کر اُن کے پاس آئے
”امّاں۔ ایک بات بتاؤ۔ تمہیں نجمہ کی شکل یاد ہے نا؟“
”ہاں ہاں۔ یاد کیوں نہیں“ ماں نے کہا ”اُس کی صورت تو آج بھی میری نظروں میں گھوم رہی ہے۔ مگر بیٹا یہ کیوں پوچھ رہے ہو“
”اچھا امّاں—اب ذرا ان کی صورت دیکھو۔ دیکھو دیکھو۔ ہے نا بالکل نجمہ کی طرح“
شاکر علی نے زرّیں کو اپنی ماں کے بالکل آگے کردیا۔ زرّیں منہ سے تو کچھ نہ بولی مگر سلام کے لئے ہاتھ اٹھادیئے۔ آسیہ خاتون نے زرّیں کے چہرے کو بغور دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئیں۔ اپنی مرحومہ بیٹی نجمہ سے اتنی مشابہت دیکھ کر وہ دنگ رہ گئیں۔ شدت جذبات سے ان کے منہہ سے کوئی آواز تو نہ نکلی مگر ہاتھ کے اشارے سے اُنھوں نے زرّیں کو اپنے اپنے پاس بیٹھنے کو کہا اور پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگیں
”بتاؤ امّاں—ہیں نا یہ بالکل نجمہ کی طرح“ شاکر علی نے پوچھا
آسیہ خاتون نے اثبات میں سر ہلایا
”چلو تمہیں نجمہ سے ملادیا نا آج“ شاکر نے کہا ”اب ذرا ان کے بائیں ہاتھ کی انگلیاں دیکھو امّاں اور پھر میری دوسری بہن کو دھیان میں لاؤ۔ صبیحہ کو“
آسیہ خاتون ابھی تک تو صرف زرّیں کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھیں شاکر کے کہنے پر اُنھوں نے زرّیں کا بایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تو انگوٹھے سے جڑی ہوئی چھٹی انگلی دیکھ کر وہ مضطرب ہوگئیں بڑی بے تابی سے پوچھنے لگیں
”بیٹی—تمہارا نام کیا ہے۔ تم کہاں کی رہنے والی ہو۔ تمہارے کتنے بھائی بہن ہیں۔ تمہارے ماں باپ کہاں کے ہیں“
اتنے سوالوں کو ایک ساتھ سن کر زرّیں گھبرا گئی اُسے ان سوالوں کے پوچھنے کا بیتابانہ انداز سمجھ میں نہیں آیا وہ یہ بھی نہ سمجھ سکی کہ محض مشابہت کی بنیاد پر یہ لوگ اس قدر پریشان ہوکر اُسے اپنی بیٹی ہی کیوں مانے لے رہے ہیں
”دیکھئے— میری تو صرف ایک بڑی بہن تھی جو مرگئی اور ماں باپ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں“
”مگر تم رہنے والی کہاں کی ہو؟“ آسیہ خاتون نے پوچھا
”یہ بھی پتہ نہیں“ وہ بولی ”میری بڑی بہن جو مجھ سے تین چار سال بڑی تھی یہ بات اُسے بھی نہیں معلوم تھی۔ ہاں کبھی کبھی وہ یہ بتایا کرتی تھی کہ عبدالشکور نامی ایک بنگالی جو بردوان کا رہنے والا تھا وہ

ہم دونوں کو کان پور اسٹیشن سے بردوان لے گیا تھا میری بہن نے یہ بھی بتایا کہ کان پور میں ہندو مسلم فساد میں میرے والد کو بلوائیوں نے مار ڈالا تھا۔ ہم دونوں اس وقت چھوٹے تھے اور بھوک پیاس سے بے سہارا اسٹیشن کے باہر پڑے تھے تو عبدالشکور ہمیں اپنے ساتھ بردوان لے گیا اس کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ اپنی بیوی کے مرنے کے بعد عبدالشکور نے ہم دونوں کو اپنے مالک الطاف حسین عرف اچھّن میاں کے پاس جائس بھیج دیا جہاں ہم دونوں کی پرورش ہوئی۔ بس مجھے اپنے بارے میں اتنا ہی معلوم ہے"

شاکر علی زرّیں کی مختصر روداد سن کر بولے

"اگر عبدالشکور تم دونوں کو کانپور کے ہندو مسلم فساد کے دوران یہاں سے لے گیا تھا تو یقیناً اور سو فیصدی تم ہی میری گم شدہ بہن صبیحہ ہو اُس وقت تمہاری عمر دو ڈھائی سال اور بڑی بہن رقیّہ چھ سال کی تھی"

زرّیں نے شاکر علی کی اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا صرف ان کے چہرے کو بغور دیکھتی رہی ماں نے زرّیں کی پیٹھ پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا

"اور میری صبیحہ کے بائیں ہاتھ میں چھ انگلیاں تھیں یہ اس کی سب سے بڑی پہچان ہے۔ ہاں ایک پہچان اور بتاتی ہوں اس کی گردن کے نیچے ہنسیا کی ہڈی پا ایک کالا تِل بھی تھا"

زرّیں نے ہاں یا نا میں جواب دینے کے بجائے بلاؤز سرکا کر کالا تِل نمایاں کر دیا

"او مائی گاڈ" شاکر علی جیسے سنّاٹے میں آ گئے بڑی زور سے چلا کر بولے "امّاں!"

"میری بچی۔ میری صبیحہ" آسیہ خاتون اس سے لپٹ گئیں "تو ہی میری بچی ہے۔ یہی میری بچی ہے"

ان لوگوں کے یہ سب بتانے پر زرّیں کو بھی یقین ہو چلا پھر بھی وہ حیرت میں ڈوبی رہی

"تمہارا نام صبیحہ تھا اور بڑی بہن کا نام رقیّہ" شاکر علی بتانے لگے "تم مجھ سے دو سال چھوٹی، بڑی بہن رقیہ مجھ سے دو سال بڑی اور تیسری بہن نجمہ مجھ سے چار سال چھوٹی تھی

شاید زرّیں اس ہوش ربا انکشاف کو پوری طور پر قبول کرنے میں ہچکچا رہی تھی کچھ سوچ کر اس نے شاکر علی سے کہا

"کیا آپ اپنی بڑی بہن کی کوئی نشانی بتا سکتے ہیں؟"

شاکر کے بولنے سے پہلے آسیہ خاتون بول اُٹھیں اُنھوں نے بتایا کہ رقیّہ کو بچپن میں چیچک نکل آئی تھی جس کی وجہ سے اُس کے چہرے پر دانوں کے نشان پڑ گئے تھے۔ رنگ گورا تھا۔ یہ نشانی اُنھوں نے بالکل صحیح بتائی زرّیں کو ان لوگوں کی باتوں کا یقین آ گیا۔ آسیہ خاتون کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے وہ برسوں سے کھوئی ہوئی اپنی بیٹی کو پا کر اتنی خوش تھیں کہ وفورِ مسرّت و جذبات سے وہ زار و قطار رونے لگیں اس کے علاوہ اپنی گمشدہ بیٹی کے ساتھ ساتھ گویا انھیں چھوٹی بیٹی نجمہ بھی مل گئی۔ زرّیں نے

ماں کے آنسو پونچھے

"اچھا اب کچھ اپنے بارے میں بھی بتایئے امّاں جی"

شاکر علی زرّیں کے پاس بیٹھ گئے وہ بھی آبدیدہ تھے

"امّاں کو پچھلی باتیں کیا یاد ہوں گی" شاکر بولے "ان کی یادداشت بھی تو بوڑھی ہو گئی ہے۔ تم بیٹھو میں سناتا ہوں ان کی آپ بیتی"

شاکر علی نے سرگزشت سنائی وہ کچھ اس طرح تھی:

پچاس سال قبل ایک بے حد شکیل و وجیہ کشمیری نوجوان علی میر مثال دوشالے بیچتا ہوا شہر الہ آباد میں رانی منڈی کی گلیوں سے گذرا تو آسیہ نام کی خوبصورت آنکھوں والی ایک حسین لڑکی کے تیرِ نظر کا شکار ہو گیا۔ مدرسۂ عاشقان کے نصاب میں داخل داستان محبت کی سب سے پرانی کتاب کے سارے ابواب ان دونوں نے اس طرح حفظ کر لئے کہ ایک دوسرے کے لئے ایک جان دو قالب ہو گئے۔ علی میر نے آسیہ سے شادی کر لی۔ آسیہ کے ماں باپ اس سے ناراض ہو کر بے تعلق ہو گئے۔ سات سال میں ایک بیٹا اور دو بیٹیاں پا کر دونوں ہنسی خوشی کی زندگی گذار رہے تھے۔ کانپور شہر میں ڈپٹی پڑاو پر علی میر کا ایک چھوٹا سا گھر تھا ہرا بھرا خوش حال جو ۱۹۳۱ کے ہندو مسلم فساد میں دیکھتے ہی دیکھتے اُجڑ گیا۔ علی میر اپنی دو بیٹیوں یعنی صبیحہ اور رقیّہ کو لے کر اسپتال جانے کے لئے گھر سے نکلا تھا کہ پھر ان کا کوئی پتہ نہ چلا۔ آسیہ ایک مہینے تک علی میر اور اپنی بچّیوں کا انتظار کرتی رہی مگر کوئی لوٹ کر نہ آیا اور نہ ان کا کوئی پتہ چلا۔ بے سہارا ہو کر اپنے چار سال کے بیٹے شاکر اور پانچ مہینے کا حمل پیٹ میں لئے وہ میکے پہونچی مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ ماں باپ دو سال پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے تن بہ تقدیر اپنی ننہال چائل پہونچی تو ماموں اشرف میاں نے اپنی مرحومہ بہن کی واحد نشانی کو گلے لگا کر بے پناہ شفقتیں نچھاور کیں۔ ماموں زاد بھائی شوکت علی الہ آباد ضلع کے کسی تھانے میں سب انسپکٹر پولیس تھے اور گھر میں ان کا چار پانچ سال کا اکلوتا لاڈلا شیر علی تھا۔ پھر آسیہ کے یہاں ایک چاند سی بچی نے جنم لیا جو شکل و صورت اور رنگ و روپ میں بالکل صبیحہ کو پڑی تھی۔ کارسازِ حقیقی کی طرف سے نجمہ کی شکل میں صبیحہ کا نعم البدل پا کر آسیہ دھیرے دھیرے اپنی گم شدہ بچّیوں کو بھول گئی۔ شاکر علی اور نجمہ اپنی والدہ کے ساتھ چائل میں رہنے لگے۔

۱۹۴۲ء کے بھارت چھوڑو اندولن میں سب انسپکٹر شوکت علی الہ آباد شہر میں تعینات تھے۔ ۱۲/ اگست ۱۹۴۲ء کو یونیورسٹی کے طالب علموں کا ایک بہت بڑا جلوس مہاتما گاندھی اور دوسرے کانگریسی نیتاؤں کی گرفتاری کے خلاف نعرے لگاتا ہوا الہ آباد کلکٹری پہونچا تو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مسٹر ڈکسن اور کپتان پولیس مسٹر انتھونی پہلے ہی سے ہتھیار بند پولیس فورس کے ساتھ کچہری میں موجود تھے۔ مظاہرین انگریز افسروں کی اس انسدادی تیاری کو دیکھتے ہی مشتعل ہو گئے اور ان پر سنگ باری شروع کر دی۔

مجسٹریٹ کی وارننگ کے باوجود سنگ باری شدید سے شدید تر ہوگئی تو بندوق بکف سپاہیوں نے پوزیشن لے کر پہلے ہوائی فائر کئے اور جب مظاہرین پھر بھی منتشر نہ ہوئے تو مسٹر انتھونی جو بڑے سخت گیر پولیس افسر تھے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا کر بڑے طیش میں آگے آ گئے گمّا اینٹوں کے ادّھے ان کی طرف چلے تو وہ چوٹ کھا کر گر پڑے یہ دیکھتے ہی پولیس سب انسپکٹر شوکت علی ان کی حفاظت کے لئے سینہ سپر ہو گئے اور منٹوں میں اس بری طرح زخمی ہوئے کہ اُٹھا کر لے جائے گئے فائرنگ ہوئی تو ایک ہونہار طالب علم لال پدم دھر گولیوں کا نشانہ بن گیا۔ شوکت علی انسپکٹر بھی دوسرے دن سول اسپتال میں جاں بحق ہو گئے۔

انسپکٹر شوکت علی کی جانثاری مسٹر انتھونی کے دل پر نقش ہوگئی تھی اشرف میاں کے پاس وہ اظہار تعزیت کو گئے تو انھوں نے اپنے پوتے شیر علی اور نواسے شاکر علی کو انگریز ایس پی کی خدمت میں پیش کر کے دست بستہ عرض خواہ ہوئے۔

''حضور والا ان نمک خواروں کی دست گیری فرمائیے۔ خادم کی یہی ایک اولاد تھی جس نے حضور کی حفاظت میں اپنی جان دے کر حق نمک ادا کیا ہے۔ میں تو بالکل بے سہارا ہو گیا ہوں جناب''

شیر علی اور شاکر علی دونوں ہی اس وقت پندرہ سولہ سال کے تھے اور جمنا مشن ہائی اسکول کی آٹھویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ مسٹر انتھونی بولے

''ویل مسٹر اشراف - ان ڈونو کو سروس ڈینا ہمارا رسپانسبلٹی ہائے۔ جب یہ بابا لوگ میٹرک کھرے ٹو ہمارے پاس لانا ہم ان کو پولیس میں سروس ڈے گا۔ ٹوم ہمارا سرٹی فکیٹ اپنا پاس رکھو'' پھر انھوں نے ایک سرٹی فکیٹ لکھ کر اشرف میاں کو دے دیا۔

چار سال بعد جب شیر علی اور شاکر علی نے ہائی اسکول کا امتحان پاس کر لیا اور انتھونی صاحب پولیس ہیڈ کوارٹر میں ڈی آئی جی بن کر آ گئے تو بوڑھے اشرف میاں جو ملک سے انگریزوں کے اُکھڑتے ہوئے خیمے ڈیرے سے متوحش ہو رہے تھے جھٹ پٹ اپنے ناتی پوتے کو لے کر مسٹر انتھونی کے بنگلے پر پانچ عدد دیسی مرغ اور ابوبکر پور کے باغ ٹوکرے سفیدہ امرود کی کھیپ لے کر پہونچ گئے۔ سیّد کاظمی پیشکار نے افسر تک رسائی میں مدد کی۔ ۱۹۴۶ء کا زمانہ تھا ملک میں ہندوستانیوں کی نئی عبوری حکومت جلد ہی بننے والی تھی۔ دور اندیش انگریز افسران ملک سے کوچ کرنے کے لئے اپنے اپنے بوریئے بستر لپیٹ رہے تھے۔ مسٹر انتھونی نے اپنی تحریر اشرف میاں سے لے لی پھر ایک سرسری نظر ان دونوں لڑکوں پر ڈالی اور بغیر کچھ بولے ایک کاغذ پر کچھ لکھ کر اپنے سکریٹری کو دیا اشرف میاں اس سرفرازی پر جھک جھک کر فرشی سلام کرنے لگے

''ویل اب ٹُم جا سکٹا''

شیر علی اور شاکر علی ایک مہینے کے اندر سب انسپکٹر پولیس بن گئے۔

اس کام سے فرصت پاتے ہی اشرف میاں نے ایک اور کام یہ انجام دیا کہ اپنی بھانجی آسیہ کی بیٹی نجمہ کا رشتہ اپنے پوتے شیر علی کے ساتھ طے کر دیا۔

★ ★ ★

قدیر کو لکھنؤ کے ریلوے دفتر سے معاوضے میں ملنے والی رقم کے لئے دو دن لگ گئے کیوں کہ اس کلیم کے لئے ریلوے کے ضابطوں کے تکملے اور اپنے دعویٰ کی تصدیق کے لئے کسی ممبر پارلیمنٹ یا ودھائک کے سرٹی فکیٹ کی ضرورت تھی جو تھوڑی تگ و دو کے بعد اُسے مل گیا۔ ریل محکمہ سے پچاس ہزار روپے کا جو چیک اُسے معاوضہ کی شکل میں ملا تھا اُسے قدیر نے کانپور کے الہ آباد بینک شاخ میں جمع کر دیا جہاں پر پہلے سے اس کا اکاؤنٹ تھا۔ اس کام سے فرصت پا کر وہ مدنی پور واپس لوٹا تو گھر کے دروازے میں باہر سے بڑا جیّد تالا بند پایا۔ اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ ماں اتنا بڑا تالا بند کر کے کہاں چلی گئیں مگر تھوڑی ہی دیر بعد پڑوس میں رہنے والے کلّو میاں رنگریز نے آ کر انھیں بتایا کہ گھر کے اندر کوئی نہیں ہے اس کی والدہ بغیر کسی کو کچھ بتائے کہیں چلی گئی ہیں اور گھر کا صدری دروازہ اندر ہی سے بند ہے انھوں نے احتیاطاً باہر سے اپنا تالا بھی بند کر دیا ہے قدیر نے کلّو میاں سے کہا کہ ابھی وہ دروازے میں اپنا ہی تالا لگا رہنے دیں۔

قدیر نے سوچا کہ شاید اُس کی ماں شیر علی کے یہاں گئی ہوں یہ سوچ کر وہ سیدھا تھانہ پہونچا۔ سپاہی گنپت رام اُسے برامدہ میں مل گیا اور بتایا کہ داروغہ شیر علی کا تبادلہ ہو گیا ہے اور وہ نئے سب انسپکٹر کو چارج دے کر آج ہی کانپور چلے جائیں گے

''مہراج - کچھ ہماری انارکلی کے بارے میں بھی بتاؤ'' قدیر نے کہا

''میاں جی بھول جاؤ انارکلی کو۔ وہ بے چاری تو زندہ دیوار میں چنوائی گئی تھی۔ یہ پوچھو کہ مہابلی اکبر کا کیا حال ہے کیوں کہ تمہاری رپورٹ پر تو کپتان صاحب نے ان کا تبادلہ کیا ہے''

''کیا ہوا ہے؟''

''پوچھتے ہو کیا ہوا۔ یعنی کہ گھاؤ پر نمک مرچ چھڑکنے آئے ہو۔ بس میاں مجنوں کھسک لو چپکے سے نہیں تو آج کئی دنوں سے تینوں لاک آپ خالی پڑے ہیں۔ خیریت نہیں''

''مگر گنپت رام جی - میں تو اپنی والدہ کے بارے میں پتہ لگانے آیا ہوں'' قدیر نے کہا

''والدہ - یعنی کہ تمہاری ماتا جی؟ اوئے ہوئے بھولے ناتھ۔ اب وہ یہاں کیوں کر آئیں گی۔ کیا کام ہے ان کا۔ بھیّا وہ تو اُسی رات کو لوٹ گئی تھیں''

''وہ گھر پر نہیں ہیں۔ باہر سے تالا بند ہے'' قدیر نے بتایا

’’ارے تو پڑوسیوں سے پوچھو۔ کسی گھر میں گئی ہوں گی واپس آجائیں گی‘‘ گنپت رام نے کہا

’’اچھا ایک بات کہوں‘‘ قدیر گڑگڑایا ’’تھوڑی دیر کے لئے انارکلی سے ملوادو‘‘

’’واہ بیٹا‘‘ گنپت رام نے کہا ’’ایسے ہی خالی خولی ملوادوں اور جو لکھنؤ سے پچّاس ہزّار کا گچھا لائے ہو وہ کیا اکیلے ہی اکیلے نگلو گے؟۔ کچھ مال پانی یاروں کے لئے بھی تو نکالو‘‘

’’ہاں ہاں۔ نکالوں گا‘‘ قدیر بولا ’’بس ذرا کیش ہاتھ میں آجانے دو پیارے۔ تمہارے لئے بڑھیا سوٹ ایک ریڈی میڈ سوٹ منّا رام کے لئے اور چاچی کے لئے گرم شال۔ سونے کا نکلس اور ایک....‘‘

’’بس بس ڈپورشنکھ‘‘ گنپت رام بولا ’’اتنا ہی بتاؤ جتنا مجھے یاد رہ سکے۔ اچھا تم یہیں ٹھہرو میں دیکھ کر آتا ہوں کہ میدان صاف ہے یا نہیں‘‘

تھوڑی دیر بعد گنپت رام نے لائین کلیر ہونے کی اطلاع دی

ثریّا قدیر کو دیکھتے ہی رو پڑی اس نے بہت بہت پوچھا لیکن ثریّا نے رونے کا سبب نہیں بتایا۔ قدیر کے دل میں یہ چور تو پہلے سے موجود تھا کہ اس نے شیر علی کے خلاف ایس پی کے یہاں درخواست گذاری تھی جس پر خود ایس پی انکوائری کرنے کے لئے مدنی پور آئے تھے اور ابھی ابھی گنپت رام کی زبانی شیر علی کے تبادلہ کا حال بھی معلوم ہوگیا تھا اس لئے اس کی طرف سے ثریّا کی ناراضگی حق بجانب تھی۔ وہ ایک مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑا رہا ثریّا آنسو پونچھتے ہوئے بولی

’’اب بھول جاؤ مجھے۔ میں تم سے نہ مل پاؤں گی۔ ابّا نے بڑی سختی کے ساتھ منع کیا ہے‘‘

’’ان کا تبادلہ بھی ہوگیا؟‘‘ قدیر نے پوچھا

’’ہاں۔ ہم لوگ کل صبح کانپور چلے جائیں گے‘‘ وہ بولی ’’یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ سمجھ لو یہ ہماری آخری ملاقات ہے اور اب تم جلدی سے چلے جاؤ کہیں ابّا نہ آجائیں‘‘

’’میں تمہیں کیسے بھول جاؤں ثریّا۔ تمہارے لئے میں اپنی جان بھی دے سکتا ہوں‘‘ وہ بولا

’’خدا کے لئے اب تم جاؤ‘‘

’’تم کانپور میں کہاں ملوگی۔ میں تم سے ملنے کہاں آیا کروں؟‘‘

’’میں بتا نہیں سکتی‘‘ وہ بولی

’’مجھے خط تو لکھ سکتی ہو‘‘

’’نہیں‘‘ وہ بولی ’’خط لکھوں گی تو تم ملنے چلے آؤ گے اور ابّا نے ملنے کو منع کیا ہے‘‘

’’کیا تمہیں اپنے وعدوں اپنی محبت اور وفاداری کی قسموں کا بھی کوئی خیال نہیں؟‘‘

’’مجھے اور زیادہ نہ رُلاؤ قدیر‘‘ وہ بولی ’’میں تمہارے ہاتھ جوڑتی ہوں خدا کے لیے اب جاؤ‘‘

اچانک داروغہ شیر علی وہاں آپہونچے دروازہ میں اندر سے کنڈی نہیں بند تھی وہ اندر آئے تو

قدیر اور ثریّا کو باتوں میں مصروف پایا۔ پابہ گل دم بخود وہیں کھڑے رہ گئے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کی بیٹی چھپ چھپ کر قدیر سے ملتی ہوگی پستول اس وقت بھی ان کے پاس تھا اور وہ چاہتے تو قدیر کو گولی بھی مار سکتے تھے مگر صورت حال یہ دیکھ کر کہ اُنھیں دیکھتے ہی نہ تو قدیر نے بھاگنے کی کوشش کی اور نہ ثریّا اپنی جگہ سے ہلی بلکہ وہ ایک قدم آگے بڑھ کر قدیر کے سینہ سپر ہوگئی۔ اپنی اکلوتی اور چہیتی بیٹی کی اس والہانہ محبت کو دیکھ کر شیر علی کی نظریں زمین میں گڑ گئیں۔ چند منٹ تک کھڑے کچھ سوچتے رہے پھر سر جھکائے ہوئے باہر چلے گئے۔

داروغہ شیر علی چپ چاپ اپنے آفس کی کرسی پر جا کے بیٹھ گئے۔ گنپت رام ان کے چہرے پر کربناک اُداسی دیکھ کر سمجھ گیا کہ معاملہ گڑبڑ ہوگیا اس لئے وہ وہاں سے کھسک لینے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ شیر علی نے اُسے روک کر پوچھا

’’وہ لڑکا میرے کوارٹر میں کیسے پہونچا؟‘‘

’’کون لڑکا؟‘‘ گنپت رام نے انجان بن کر پوچھا

’’تم قدیر کو نہیں جانتے؟‘‘ اُنھوں نے ڈپٹ کر پوچھا ’’یہاں سے بیٹھے بیٹھے خوب اچھی طرح دیکھ سکتے ہو کہ باہر سے آنے والا کون آدمی میرے کوارٹر میں جاتا ہے۔ شری گنپت رام جی تم نے مجھے لونڈا سمجھ لیا ہے۔ میں خوب سمجھتا ہوں کہ اس سازش میں تم ضرور شامل ہو اور اب انجان بنتے ہو‘‘

’’رام رام رام۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں‘‘ گنپت رام بولا ’’بھلا میں آپ کے خلاف سازش کیوں کروں گا لایئے میں گنگا جلی اُٹھا لوں آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے‘‘

’’مجھے بہلانے کی کوشش نہ کیجئے میں کوئی بچہ نہیں ہوں۔ اس رات بھی تم ڈیوٹی پر تھے اور تمہارے سامنے کوئی باہری آدمی آکر بھوانی پرشاد کے کوارٹر میں گھسا اور اس نے چھپ کر مجھ پر حملہ کیا۔ یہی تمہاری چوکسی ہے۔ پولیس کی نوکری کرتے ہو یا بھاڑ جھونکتے ہو۔ بتاؤ قدیر میرے کوارٹر میں کیسے گیا‘‘

’’میں کیا جانوں‘‘ گنپت بھی اُکھڑ گیا ’’آپ اُسے آنے جانے کے لئے الاؤ کرتے ہیں تب ہی تو وہ آتا ہے۔ ایک بار میں نے آپ کو بتایا بھی تھا کہ وہ آپ کی غزل سننے آیا ہے‘‘

’’بس اب زیادہ صفائی نہ دو‘‘ شیر علی بولے ’’میں تو اب یہاں سے جا رہا ہوں بات بڑھانے سے کیا فائدہ‘‘ گنپت رام اُنھیں کوئی جواب دینا چاہتا تھا کہ دروازے پر قدیر دکھائی دیا۔ وہ سر جھکائے کھڑا تھا شاید اندر آنے میں ہچکچا رہا تھا۔ اُسے دیکھ کر شیر علی نے سر کے اشارے سے اندر بلایا اور گنپت رام سے کہا ’’تم باہر جاؤ‘‘

قدیر کو اُنھوں نے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا لیکن منہ سے کچھ نہیں بولے

’’میں آپ سے معافی مانگنے آیا ہوں‘‘ قدیر نے کہا

شیر علی نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا صرف پینسل سے میز پر کھٹ کھٹ کرتے رہے۔ اُنھوں نے قدیر سے آنکھیں بھی چار نہیں کیں۔ تھوڑی دیر انتظار کے بعد قدیر نے پھر کہا

''آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ مجھے سچ مچ بہت افسوس ہے''

''ہوگا'' شیر علی اس کی طرف دیکھے بغیر بولے ''میرے پاس کیا کرنے آئے ہو''

''آپ سے معافی مانگنے''

''میں نے معاف کر دیا'' وہ بولے ''اپنے کوارٹر کے اندر تمہیں گولی نہیں ماری یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے۔ لیکن آئندہ مجھے کیا کرنا ہے اس پر ابھی مجھے غور کرنا ہے اور اپنی بیٹی سے باتیں بھی کرنی ہیں۔ اس لئے اب تم جا سکتے ہو۔ میں کل صبح کان پور چلا جاؤں گا۔ دو چار دن بعد تم چاہو تو مجھے انور گنج تھانہ کے شاکر علی پولیس انسپکٹر کی معرفت مل سکتے ہو۔''

★★★

زریں کے اچانک اس طرح چلے جانے پر کرامت علی کے کلیجہ میں جو ٹھیس لگی تھی اس کے صدمے سے وہ دو دن تک ہوٹل کے کمرے میں چپ چاپ پڑا رہا۔ اس تکلیف پر مزید ذہنی پریشانی اُسے اس بات کی تھی کہ پانڈے جی کے بقول اُس کے پاس نکاح کا کوئی ثبوت بھی نہیں تھا۔ اگر وہ کسی کے خلاف پولیس میں رپورٹ درج کرائے تو نکاح نامہ یا معتبر گواہوں کی عدم موجودگی کے باعث وہ یہی ثابت نہ کر سکے گا کہ زرّیں کے ساتھ اس کا عقد ہوا ہے۔ وہ کسی اور کو مجرم ثابت کرنے کے بجائے خود ہی قانون کی زد میں پھنس سکتا ہے۔ اس کے علاوہ جس مُلّا نے اس کا نکاح پڑھایا تھا نہ تو اس کا کوئی اتہ پتہ تھا اور نہ ہی یہ ممکن تھا کہ پولیس انسپکٹر کا آوردہ مُلّا خود پولیس انسپکٹر کے خلاف گواہی دے گا۔ وہ دو دن تک اسی اُدھیڑ بن میں تھا کہ وہ کرے تو کیا کرے۔ اُسے اس بات کا وہم و گمان بھی نہ تھا کہ یہاں آنے کے بعد پھر ایک پولیس ہی والا اس کے اور زرّیں کے بیچ رقیب بن کر مسلّط ہو جائے گا۔ پانڈے کے بیان سے یہ بھی ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ زرّیں کو اس کی مرضی کے خلاف ہوٹل سے لے جایا گیا ہے۔ بہت سوچ بچار کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہونچا کہ کچھ بھی ہو اس طرح پولیس کے ڈر سے خاموش بیٹھ جانا کسی طرح مناسب نہیں کم از کم زرّیں کا پتہ تو لگانا ہی چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ اُس کے ساتھ زور زبردستی کی گئی ہو اس لئے اُسے داروغہ کے چنگل سے چھڑانا اس کی اخلاقی ذمہ داری ہے یہ سوچ کر وہ انور گنج تھانہ جانے کے لئے ہوٹل سے نکل پڑا۔ ابھی وہ تھوڑی ہی دور گیا ہوگا کہ راستے میں اُسے قدیر دکھائی دیا۔ قدیر بہت خوش دکھائی دیتا تھا۔ کرامت کو دیکھتے ہی وہ بڑی گرم جوشی سے بولا

''ارے خالو۔ تم تو یار بالکل اپٹوڈیٹ بن گئے۔ واہ کیا سوٹ ہے۔ کیا ٹائی ہے۔ اور داڑھی مونچھ بالکل صفاچٹ۔ ایک دم ڈپٹی کلکٹر لگتے ہو خالو قسم سے۔''

کرامت نے قدیر کو لپٹا لیا ''اور بیٹا تم اتنے خوش کیوں ہو؟''

''خالو۔ تم نے بالکل ٹھیک کہا تھا'' قدیر بولا ''شہزادی کے ریل سے کٹ کر مرنے پر مجھے سرکار سے پچاس ہزار کا معاوضہ ملا ہے''

''مل گیا؟''

''ہاں۔ یہ دیکھو بینک سے روپے لے کر چلا آ رہا ہوں'' اُس نے انگوچھے میں لپٹے نوٹوں کے بنڈل دکھائے

''ارے ارے۔ کیا کرتے ہو؟'' کرامت نے ڈانٹا ''بیچ بازار میں اس طرح روپے نہیں نکالتے''

''مگر خالو۔ میں تم سے بہت خفا ہوں'' قدیر بولا

''کیوں۔ کیوں؟''

''اب کیوں کیوں کرتے ہو'' قدیر بولا ''سونے کے بسکٹوں والی بات یاد کرو ابھی تک وعدہ پورا نہیں کیا''

''اچھا اچھا۔ تمہیں سونا چاہیئے نا'' کرامت ہنس کو بولا ''آؤ چلو۔ ابھی دیئے دیتا ہوں۔ مگر پہلے ایک کام یہ کرو یہ نوٹوں کے بنڈل جو تم انگوچھے میں لپیٹے گھوم رہے ہو یہ مجھے دیدو۔ کان پور میں رہزنوں اور گرہ کٹوں کی کمی نہیں ہے۔ اس طرح جان کو خطرہ ہے بیٹا۔'' میں کلکٹر گنج کے ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوں وہاں پہونچ کر تمہیں دے دوں گا۔ لاؤ''

کرامت نے کچھ اس پدرانہ شفقت سے بات کہی تھی کہ قدیر نے جھٹ نوٹوں والا بنڈل اُسے تھما دیا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد کرامت نے ایک ٹیکسی بلائی اور اُس سے پھول باغ چلنے کو کہا۔ ٹیکسی میں بیٹھنے کے بعد راستے میں قدیر نے کہا

''خالو۔ میں مدنی پور ہو گیا تھا مگر اماں مجھے گھر پر نہیں ملیں اور نہ میر صاحب ہی کا پتہ چلا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ بغیر کسی کو بتائے ہوئے کہاں چلی گئیں۔ اب میں اُنھیں کہاں کہاں ڈھونڈوں'' کرامت نے ابھی تک یہ بات قدیر کو نہیں بتائی تھی کہ زرّیں اُسی کے ساتھ مدنی پور سے کان پور آئی تھی مگر جب قدیر نے ماں کے بارے میں اپنی تشویش ظاہر کی تو اس نے بتایا

''زرّو تو مدنی پور سے میرے ساتھ یہاں تک آئی تھی اُسے جائس جانا تھا لاڈلی بیٹا کی شادی ہو گئی ہے نا یہاں آنے پر اس کے ایک منہہ بولے بھائی صاحب مل گئے پولیس انسپکٹر شاکر علی جو کہ انور گنج تھانہ میں ہیں۔ زرّو اُنھیں کے گھر چلی گئی''

''انسپکٹر شاکر علی!'' قدیر نے تعجب سے کہا ''اچھا اچھا - داروغہ شیر علی اُنھیں کے یہاں تو ٹھہرے ہیں اُن کا تبادلہ مدنی پور سے کان پور ہوگیا ہے پرسوں اُنھوں نے مجھے بتایا تھا کہ وہ انور گنج تھانہ کے انسپکٹر شاکر علی کے یہاں رہیں گے''

''اوہ میرے خدا'' کرامت علی اپنا ماتھا پیٹ کر اچھل پڑا۔ ایک سکنڈ سے بھی کم عرصہ میں پورا پلان اس کی سمجھ میں آ گیا۔ ٹیپ ریکارڈ کے کیسٹ میں شاکر علی نے ان دونوں کی باتیں سنیں پھر یہ جاننے کے بعد کہ شیر علی سے بھاگ کر زرّیں جا رہی ہے تو اُنھوں نے اُسے پکڑ کر پھر شیر علی کو دینے کا جال پھیلایا ہے

''کیا ہوا خالو'' قدیر نے پوچھا ''آپ کو حیرت ہوئی کیا؟''

''کچھ نہیں قدیر'' کرامت نے کہا ''چلو پہلے میں تمہیں سونا دے دوں اُس کے بعد تم داروغہ شاکر علی کے یہاں جا کر اُسے اپنے ساتھ لے آؤ ہمیں جائس جانا ہے''

ایک بڑے جوئیلر کی دوکان کے پاس پہونچ کر کرامت علی نے ٹیکسی رکوائی۔ سوٹ بوٹ سے مزیّن اور کلین شیو کرامت علی منہہ میں موٹی سی سگار دبائے اور ہاتھ میں خوبصورت بریف کیس لئے ٹیکسی سے باہر آ کر قدیر سے بولا

''قدیر تم ٹیکسی میں میرا انتظار کرنا میں دس پندرہ منٹ میں آتا ہوں''

یہ کہہ کر کرامت علی جوئیلر کی دوکان کی سیڑھیوں پر بڑی تمکنت کے ساتھ چڑھنے لگا۔ دوکان سے پہلے سیڑھیوں پر اُس نے ایک منٹ کے لئے بریف کیس کھول کر دیکھا۔ قدیر کے دیئے ہوئے روپے سوسو روپے والی پانچ اسٹیپلر کی ہوئی نئی نئی گڈیاں اسمیں بحفاظت رکھی تھیں۔ دوکان پہلی منزل پر تھی جس میں تین بڑے بڑے کمرے تھے ایک کے بعد ایک دو کمروں سے ہوکر وہ تیسرے کمرے میں آیا وہاں شیشوں والی دیوار کے پارٹیشن سے ملا ایک خوبصورت کیبن تھا جس میں ایک جوان مگر بے حد دبلا پتلا اور منحنی سا آدمی دو تین ٹیلی فون اپنے سامنے رکھے بیٹھا تھا۔

کرامت نے اُسے دیکھتے ہی سر کے اشارے سے سلام کیا سگار اس کے منہہ میں اسی طرح لگی رہی

''آیئے سر۔ کیا سیوا کروں'' دبلے پتلے جوان نے پوچھا

کرامت نے اپنا بریف کیس اس کی میز پر رکھا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا

''مجھے سونا خریدنا ہے۔ مگر جلدی میں ہوں'' کرامت نے کہا

''حکم کیجئے۔ کتنا سونا چاہئے''

''کیا ریٹ ہے؟''

''دس گرام کا ڈھائی ہزار'' دوکان والا بولا ''آج صبح کا یہی بھاؤ ہے''

''ٹھیک ہے'' کرامت نے کہا ''مجھے دوسو گرام چاہئے۔ اور کمیشن کیا ہوگا میرا؟''

''جو دوسروں کو دیتا ہوں'' جوئیلر نے کہا'' آج آپ پہلے گاہک ہیں کچھ اور سیوا بھی کردوں گا''

''صاف صاف بتایئے کیا دیں گے آگے بھی آپ سے لین دین رہے گا''

''آپ ہی بتا دیجئے'' اس نے کہا ''کوئی سنکوچ نہ کیجئے گا یہ دوکان آپ ہی کی ہے۔ ویسے میں دوسرے بیوپاریوں کو ایک پرسنٹ دیتا ہوں''

''اوہنک۔ نہیں چلے گا'' کرامت جلدی سے بولا ''ڈیڑھ دینا ہو تو بیٹھوں''

یہ کہہ کر کرامت کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا

''سر آپ بیٹھئے تو'' دوکاندار بولا ''میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ سنکوچ نہ کیجئے گا۔ اب آپ نے خود اپنے منہہ سے کہہ دیا ہے تو ٹھیک ہے دے دوں گا۔ سونا کتنا چاہئے۔ دوسو گرام نا؟''

منٹوں میں دوسو گرام سونا تول کر پیک کر دیا گیا۔ کرامت نے بریف کیس سے سوسو روپے کے نوٹوں والی پانچ گڈیاں نکال کر اس کی میز پر رکھ دیں پانچوں گڈیاں تانبے کے تار سے اسٹیپلر کی ہوئی تھیں اور سب نئی تھیں۔

''رسید بنوا دیجئے'' کرامت نے روپے آگے سرکاتے ہوئے کہا۔

دوکان والا ان بندھی گڈیوں کو ذرا سا الٹ پلٹ کر دیکھنے اور نظروں سے تول کر مطمئن ہو گیا رسید بنانے کے بعد سونے کا پیکٹ اور رسید اُس نے کرامت کی طرف سرکایا

''کچھ پینے کے لئے منگواؤں؟'' اس نے پوچھا

''میرا کمیشن؟'' کرامت نے پوچھا

منحنی سیٹھ نے روپوں کی گڈیاں پہلے اپنے پشت پر لگی تجوری میں رکھیں پھر اپنے میز کی دراز سے مختلف مالیت کے ایک ہزار روپے کے نوٹ کرامت کو دینے کے بعد اخلاقاً ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا اور مسکراتا ہوا بولا ''اور کوئی سیوا میرے لائق''

سونے کا پیکٹ لے کر کرامت علی دوکان سے نیچے آیا۔ قدیر ٹیکسی میں بیٹھا ہوا بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ کرامت نے وہ پیکٹ قدیر کو دے کر چپکے سے کہا

''ہوٹل مے فسلا ئیٹ کلکٹر گنج میں کمرہ نمبر نو ۹ میں میرا انتظار کرنا میں تھوڑی دیر میں آرہا ہوں۔ یہ لو کمرے کی کنجی اور ٹیکسی کا کرایہ بھی دے دینا'' یہ کہہ کر اُس نے قدیر کو سو کا نوٹ دیا

قدیر کو سونے کا پیکٹ دے کر کرامت علی پھر اُلٹے پیروں جوئیلر کی دوکان میں واپس آ گیا اور آتے ہی منحنی سیٹھ سے بولا ''سیٹھ جی دوسو گرام سونا اور دے دیجئے'' سیٹھ کی باچھیں کھل گئیں بولا ''پلیز۔ تشریف رکھئے''

دوسو گرام سونے کا نیا پیکٹ پاتے ہی کرامت بولا ''اچھا۔ چلتا ہوں''

سیٹھ سمجھا کرامت علی دل لگی کر رہا ہے اس لئے وہ بھی از راہ انکساری ہنس کر بولا

''آپ ہی کی دوکان ہے شری مان''

مگر جب روپئے دیئے بغیر کرامت علی شان بے نیازی کے ساتھ اس کمرہ سے باہر نکل گیا تو سیٹھ بھی گھبرا کر باہر نکل آیا ''شری من۔روپئے آپ نے نہیں دیئے''

''روپئے تو میں پہلے ہی آپ کو دے چکا ہوں'' کرامت نے کہا

''اجی جناب میں اس سونے کی قیمت مانگ رہا ہوں''

''جی ہاں۔اس سونے کے دام میں آپ کو دے چکا ہوں اور روپوں کی رسید بھی میرے پاس ہے'' سیٹھ گھبرا گیا اور چلا کر نوکروں سے کہا کہ باہر جانے والے سب ہی دروازے بند کر دیئے جائیں کرامت پر اس کے چلانے کا کوئی اثر نہیں ہوا وہ اطمینان سے ایک صوفہ پر بیٹھا رہا۔سیٹھ نے ایک بار پھر اس سے مخاطب ہو کر تیز لہجہ میں کہا

''آپ روپے دیں گے یا پھر............''

''چیخئے مت'' کرامت بولا ''میں بیٹھا ہوں آپ پولیس کو ٹیلی فون کر کے بلا لیجئے''

''آپ نہ مانیں گے؟''

کرامت نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا تو سیٹھ نے اپنے کیبن سے ٹیلی فون کر کے پولیس کو ڈاکہ پڑنے کی اطلاع کر دی۔پندرہ منٹ بعد تین سپاہیوں کے ساتھ حلقے کا سب انسپکٹر آ گیا اُسے گیٹ ہی پر سیٹھ نے ساری روداد سنا دی۔سب انسپکٹر جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا اُسے دیکھتے ہی کرامت علی کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی مگر اس سراسیمگی کے عالم میں بھی اُس نے اپنے چہرے پر گھبراہٹ کا کوئی نشان نہیں آنے دیا چپ چاپ اطمینان کے ساتھ اپنی بجھی ہوئی سگار،کو پینا شروع کر دیا۔یہ داروغہ شیر علی تھے جو اس کلین شیوڈ جنٹلمین کو بڑے غور سے اور بھویں سکوڑ سکوڑ کر پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔کرامت دل ہی دل میں برابر یہی سوچ رہا تھا کہ یہ کم بخت یہاں کیسے آ ٹپکا مگر خوش مزاجی کا مظاہرہ کرتا ہوا بولا

''انسپکٹر صاحب۔آپ تو مجھے اس طرح سونگھ رہے ہیں جیسے بڑی پرانی ملاقات ہو''

وہ ہنسنے لگا مگر شیر علی اس کے زہر خند سے اتنا ہی متاثر ہوئے کہ اور تن کر اکڑ گئے

''کیا معاملہ ہے؟'' وہ ڈپٹ کر بولے۔سیٹھ کے سارے نوکر چاکر اکٹھا ہو گئے تھے

''معاملہ یہ ہے کہ سیٹھ بے ایمان ہے اور مجھے ٹھگنا چاہتا ہے'' کرامت بولا ''دیکھئے میں نے دوسو گرام سونا ان کے یہاں سے خریدا۔پچاس ہزار نقد انھیں دے کر رسید اور سونا لے لیا۔اب ان کے دل میں بے ایمانی سما گئی تو مجھ سے پھر روپے مانگنے لگے۔یہ دیکھئے۔یہ رہی رسید اور یہ سونا۔اور پچاس

ہزار روپوں کی پانچ گڈیاں سو روپے والے نئے نوٹوں کی شکل میں ان کی تجوری میں دیکھ لیجئے۔بس جناب اتنا ہی معاملہ ہے''

''یہ جھوٹ بولتے ہیں'' سیٹھ بولا

''جھوٹ بولنے والے کے سر پر سینگ تو نہیں ہوتے۔آپ مجھ سے زیادہ نمبری جھوٹے ہیں'' کرامت نے کہا

''ٹھہریئے ٹھہریئے'' شیر علی نے کہا اور کرامت سے مخاطب ہوئے ''آپ رسید دکھایئے پہلے کرامت نے جیب سے رسید نکال کر دکھا دیا

''ہوں'' داروغہ نے کہا ''معاملہ تو صاف ہے۔یعنی رسید تو آپ نے لے لی مگر روپے ان کو نہیں دیئے''

''جی ہاں۔جی ہاں'' سیٹھ جلدی سے بولا

''جناب روپے میں ان کو دے چکا ہوں'' کرامت نے بہت ٹھہر ٹھہر کر کہا'' پچاس ہزار نئے نوٹ۔سو سو کے نوٹوں کی پانچ نئی گڈیاں۔تار سے بندھی ہوئی۔اب آپ ان سے کہیئے یہ اپنی تجوری کھول کر دکھائیں۔کون جھوٹا اور کون سچا ہے ابھی معلوم ہو جائے گا''

''سیٹھ جی۔آپ اپنی تجوری کھولئے'' شیر علی نے بڑی نرمی سے کہا

''جی!'' وہ بغلیں جھانکنے لگا ''بات یہ ہے انسپکٹر صاحب کہ۔یہ آدمی واقعی جھوٹا ہے''

''ارے تو آپ گھبراتے کیوں ہیں'' شیر علی نے اور بھی نرمی سے کہا ''اب یہ میرے چنگل سے بچ کر جا نہیں سکتے۔میں ایک میل سے جرم کی بو سونگھ لیتا ہوں اس لئے آپ خاطر جمع رکھئے مگر پہلے اپنی تجوری دکھا دیجئے تا کہ بات کہنے کو نہ رہے انھیں بھی صفائی کا موقع چاہئے''

سیٹھ نے بادل ناخواستہ تجوری کھولی۔سو سو والی نوٹوں کی پانچ گڈیاں سامنے رکھی تھیں ''وہ دیکھئے'' کرامت نے دور سے اشارہ کیا ''یہی ہیں میرے نوٹ۔گن لیجئے''

''کیوں سیٹھ جی؟'' شیر علی نے اپنی بید ہتھیلی پر بجاتے ہوئے کہا ''یہ ٹھیک کہتے ہیں؟''

''جناب یہ بالکل ٹھیک نہیں کہتے'' سیٹھ بولا ''یہ روپے تو پہلے والے سونا کے دام ہیں اور وہ سونا یہ تھوڑی دیر پہلے لے جا چکے ہیں۔جو سونا انھوں نے دوبارہ خریدا ہے مجھے اس کی قیمت چاہیئے۔''

''میں نے تو صرف یہی سونا خریدا ہے اور اس کی قیمت ادا کر چکا ہوں'' کرامت نے کہا

داروغہ شیر علی دو قدم آگے بڑھے کرامت کے بالکل روبرو کھڑے ہو کر اسے بغور دیکھنا شروع کیا۔کرامت کا دل دھڑ دھڑانے لگا مگر جلد ہی شیر علی اُسے دیکھ کر مسکرانے لگے جیسے معاملہ کی تہہ تک پہونچ گئے ہوں۔کرامت جلدی سے بولا

''دیکھئے اب اگر آپ کو اطمینان ہو گیا ہو تو مجھے جانے دیجئے''

''ٹھیک ہے۔ آپ جائیے'' یہ کہہ کر وہ سیٹھ سے مخاطب ہوئے'' روکڑ وامل جی۔ آپ کو کچھ اپنے نام کا بھی لاج رکھنا چاہیئے۔ اتنی بڑی دوکان اور اس میں یہ کھلّم کھلاّ ٹھگی۔ کوئی سیدھا سادا آدمی ہوتا تو آپ نے جپ لیا تھا اُسے۔ جائیے مسٹر آپ''

کرامت علی باہر جانے لگا تو سیٹھ تلملا کر بولا

''واہ صاحب۔ آپ انھیں ایسے ہی جانے دے رہے ہیں''

''تو کیا آپ کے کہنے سے انھیں پھانسی پر لٹکا دوں؟۔ بولئے'' شیر علی نے کہا

''ٹھیک ہے میں ترویدی جی سے آپ کی شکایت کروں گا''

جوئیلر کی دوکان سے نکل کر کرامت علی تھوڑی دور گیا ہوگا کہ پیچھے سے داروغہ شیر علی کی جیپ آ گئی اور کرامت کے پاس آ کر رک گئی شیر علی نے جیپ میں بیٹھے بیٹھے مسکرا کر کرامت کو اپنے پاس بلایا

''بھائی صاحب آیئے جیپ میں بیٹھ جائیے قیمتی سامان لے کر پیدل جانا ٹھیک نہیں ہے''

کرامت علی اخلاقاً ذرا سا مسکرا کر جیپ میں بیٹھ گیا مگر جیپ میں بیٹھتے ہی ایک لمحہ کو اس کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ اگر شیر علی نے اُسے پہچان لینے کے بعد اس طرح جانے دیا ہے تو وہ ضرور ان کی جال میں پھنس گیا ہے اب سونا تو جانا ہی جانا ہے وہ بھی جیل کی ہوا کھائے گا۔ جیپ چلی تو شیر علی نے کہا'' بھائی صاحب میں نے پہلے ہی آپ کو پہچان لیا تھا'' پھر ہنستے ہوئے پوچھا

''آپ ٹھاکر گوری شنکر سنگھ ہیں نا؟''

''ارے مان گیا صاحب آپ کی نظر کو'' کرامت بولا'' مجھے تو گمان بھی نہ تھا کہ آپ مجھے پہچان لیں گے''

اس پر شیر علی جی کھول کر ہنسے ''نہیں بھائی نہیں۔ مجھے پہچاننے میں تھوڑا تامل ضرور تھا کیوں کہ میں نے آپ کو ہمیشہ دھوتی کرتا یا لمبے کوٹ ہی میں دیکھا ہے پھر آپ کی بچھّو مار کہ مونچھیں۔ وہ بھی ندارد۔ مگر پہچان لیا میں نے۔ آپ کے احسانات بھی تو اس خادم پر بے حد ہیں۔''

کرامت نے کوئی جواب نہیں دیا صرف مسکراتا رہا۔ شیر علی پھر بولے

''بھابھی کیسی ہیں؟۔ میں نے سنا تھا اُنھیں گٹھیا......''

''بھابھی اب نہیں رہیں شیر علی بھائی'' کرامت نے بڑے افسردہ لہجے میں کہا

''شیر علی!'' یک بیک وہ اپنا نام اس کے منہ سے سنتے ہی حیرت میں پڑ گئے۔ جیپ کو یک لخت بریک لگا کر وہ کرامت علی کو غور سے دیکھنے لگے'' آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہوا؟۔ کون ہیں آپ؟''

''جی۔ میں۔ وہ۔ ابھی آپ ہی نے کہا تھا کہ آپ مجھے پہچان گئے ہیں''

''بکواس ہے'' وہ زور سے بولے'' میں آپ کو بالکل نہیں جانتا۔ صرف آپ کا دل ٹٹولنے کے لئے میں نے گوری شنکر سنگھ کے فرضی نام سے آپ کو مخاطب کیا تھا۔ مگر آپ تو مجھے میرے نام سے جانتے ہیں۔ کون ہیں آپ؟۔ صاف صاف بتایئے۔ آپ مجھے کیسے جانتے ہیں؟ بولئے بولئے''

''تو کیا سچ مچ آپ نہیں جانتے؟'' کرامت نے پوچھا

''نہیں بھائی نہیں'' وہ بولے ''یقین مانئے میں آپ کو بالکل نہیں جانتا''

''تعجب ہے'' کرامت نے کہا'' ارے صاحب میں وہی ہوں''

''وہی ہیں۔ کون وہی؟'' شیر علی جلبلا گئے

''وہی جسے آپ اچھی طرح سے جانتے ہیں'' کرامت بولا

شیر علی کو غصہ آ گیا بولے ''مجھ سے منہہ لگی مت کیجئے گا۔ سمجھے بتایئے آپ کون ہیں۔ کیا نام ہے''

''ارے آپ تو ناراض ہو گئے شیر علی بھائی'' کرامت سنجیدگی سے بولا'' صاحب آپ سے تھوڑا مذاق کا رشتہ بھی تو ہے نا اسی لئے گستاخی ہو گئی۔ خیر جانے دیجئے۔ میں معافی مانگتا ہوں''

''افّوہ۔ مگر آپ ہیں کون'' اُنھوں نے پھر ڈانٹا ''مجھ سے آپ کا کیا رشتہ ہے۔ بتایئے''

''کیا بتاؤں'' کرامت بولا'' آپ ہی نے ایک بار کہا تھا کہ آپ میرے ہم زلف ہونے والے ہیں۔ تو اگر اس بہانے آپ سے تھوڑی ہنسی کر لی تو کون سا گناہ کیا''

اب شیر علی نے اُسے بڑے غور سے دیکھا کچھ کچھ پہچان کر بولے

''ارے!۔ آپ!۔ یعنی کہ۔ شیخ کرامت علی ۔ ارے میاں یہ آپ کی داڑھی مونچھوں پر زوال کیسے آ گیا؟''

''داڑھی مونچھوں کو چھوڑیئے۔ یہ بتایئے کہ آپ کی گاڑی پلیٹ فارم پر لگ گئی یا نہیں۔ آپ تو میرے ساڑھو بھائی ہیں نا؟'' کرامت نے ہلکا سا قہقہہ لگایا

''بہت نہ ہنسو شیخ جی'' وہ بولے ''تمہاری سالی مجھے دغا دے گئی۔ اوڑنچھو ہو گئی اپنے کسی یار کے ساتھ بے شرم''

''ہہ ہہ ہہ!!!'' کرامت پھر ہنسا'' لگتا ہے اُسے پولیس والوں کی دوستی بہت پسند ہے''

''کیا؟'' شیر علی کو حیرت ہوئی ''پولیس کی دوستی؟''

''جی ہاں اس بار وہ تھانہ انور گنج کے داروغہ شاکر علی کے ساتھ گئی ہے''

''آپ کو کیسے پتہ چلا؟'' شیر علی نے جلدی سے پوچھا'' ارے بھائی شاکر تو میرا سالا ہے''

''ہاں جناب اسی لئے تو سالے ہیں کیوں کہ انھوں نے زرّیں یعنی آپ کی بیوی کو بہن بنا لیا ہے''

''کیا؟۔ یہ کیا بے پر کی اڑا رہے ہیں آپ''

"بس جناب اب مجھے یہیں پر اتار دیجئے" کرامت بولا "اور جو کچھ میں نے بتایا ہے اس کی تصدیق کر لیجئے شاکر علی صاحب سے" یہ کہہ کر وہ جیپ سے اتر گیا۔

★★★

ہوٹل مےفسلائیٹ میں قدیر کرامت علی کا انتظار کرتے کرتے تھک گیا سب سے زیادہ اُسے اپنے اُن روپوں کی فکر تھی جو اس نے کرامت کو حفاظت کے خیال سے رکھنے کے لئے دیئے تھے جیسا جیسا دیر ہوتی جاتی تھی اتنی ہی اس کی بے قراری میں اضافہ ہو رہا تھا۔ جو پیکٹ کرامت نے اُسے ٹیکسی میں تھمایا تھا وہ بعینہ بستر پر رکھا تھا جب بہت دیر ہوئی تو عاجز آ کر اس نے پیکٹ کو احتیاط کے ساتھ کھولا پھر یہ دیکھ کر وہ دنگ رہ گیا کہ پیکٹ میں سونے کے بسکٹ تھے۔ دوسو گرام سونے کی گرمی بہت جلد اس پر طاری ہو گئی پہلے تو اس نے سوچا کہ موقع غنیمت ہے کرامت علی سے ملے بغیر وہاں سے پھوٹ لے مگر عقل نے سمجھایا کہ یہ سخت بیوقوفی ہوگی ابھی تو کرامت سے پچاس ہزار روپے واپس لینے ہیں پھر چوروں کی طرح بھاگنے کی کیا ضرورت ہے سونا دینے کا اقرار تو خود کرامت نے کیا ہے اور ویسے بھی سارے کا سارا سونا تو سچ مچ اُسی کو ملنا چاہئے کیوں کہ شہزادی کا شوہر ہونے کی وجہ سے وہی ان بسکٹوں کا اصلی حق دار ہے کرامت کو کچھ بھی نہ ملنا چاہیئے پھر بھی اس ڈر سے کہ کہیں کرامت سونا واپس نہ مانگ لے اُس نے سونے والے پیکٹ کو کسی محفوظ جگہ پر چھپا دینے کو سوچا اور بہت دیر سوچنے کے بعد اُسے سب سے مناسب اور محفوظ جگہ ہوٹل میں سیڑھی کے پاس رکھے کوڑے کا ڈسٹ بن معلوم ہوا۔ اُس نے وہ پیکٹ ڈسٹ بن میں چھپا دیا کہ موقع ملتے ہی نکال لے جائے گا۔

ایک گھنٹہ کے بعد کرامت ہوٹل واپس لوٹا تو اس کے ہاتھوں میں ویسا ہی ایک پیکٹ تھا جیسا قدیر ہوٹل کے کوڑا والے ڈرم میں چھپا آیا تھا۔ کرامت کے ہاتھوں میں یہ پیکٹ دیکھ کر قدیر کو سخت حیرت ہوئی ساتھ ہی کرامت کی ہوشیاری پر غصہ اور اپنی کم عقلی پر رونا بھی آیا اُس کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ کرامت کوڑے کے ڈرم سے وہ پیکٹ نکال لے گا

کرامت کمرے میں آتے ہی دروازے اندر سے بند کرتا ہوا بولا

"ہاں برخوردار تم نے مجھے پچاس ہزار دیئے تھے نا؟"

قبل اس کے کہ قدیر کچھ کہتا کرامت سونے کا پیکٹ اس کی طرف بڑھاتا ہوا بولا

"یہ لو۔ پچاس ہزار کا سونا یہ رہا اور پچاس ہزار کا مال تمہیں پہلے ہی دے چکا ہوں"

"کیا؟" قدیر چڑھ کر بولا "کون سا مال؟۔ مال تو تمہارے ہاتھ ہی میں ہے"

"ارے بیٹا وہ پیکٹ جو میں نے تمہیں ٹیکسی کے اندر دیا تھا۔ وہ پیکٹ کہاں ہے؟"

قدیر نے وہی پیکٹ پھر کرامت کو تھما دیا "وہ پیکٹ یہ ہے"

"تو کیوں مجھے ستا رہا ہے" کرامت نے التجا کی "بتا کہاں رکھا ہے میں خود لے لوں گا"

"بتاؤں کہاں رکھا ہے؟" قدیر غصّہ میں بولا

قدیر کے اکھڑے تیور دیکھ کر کرامت خاموش ہو گیا وہ سمجھ نہیں سکا کہ قدیر کیوں ناراض ہے

"وہ جو سیڑھی کے پاس ہاتھ روم کے باہر کوڑے کا ڈرم رکھا ہے اسی میں پڑا ہے تمہارا پیکٹ۔ جاؤ جا کر نکال لو"

"اب اگر تم نے بے تکی باتیں کہیں تو ایک چانٹا لگا دوں گا۔ سمجھے؟" کرامت بولا

"واہ خالو واہ" قدیر نے کہا "بڑے ایماندار ہو میرا روپیہ دینے کے بجائے اتنی دیر سے جھک لگائے ہو کہ پیکٹ کہاں ہے۔ ارے پیکٹ تو یہ ہے جو تم لئے بیٹھے ہو جسے میں نے کوڑے دان میں پھینک دیا تھا اور جسے تم نکال لائے ہو"

کرامت بڑی سنجیدگی اور ٹھنڈے دل کے ساتھ چپ چاپ قدیر کو دیکھتا رہا اور جب اس کے چہرے پر جھوٹ بولنے کا کوئی ہلکا سا تاثر بھی نہ پایا تو چپ چاپ اٹھا اور کمرے کے باہر نکل گیا۔ برامدے کے آخری سرے پر سیڑھی کے کنارے ہاتھ روم کے پاس کوڑے کا جو ڈرم رکھا تھا وہ کرامت کے کمرے سے بھی دکھائی دیتا تھا۔ قدیر وہیں سے بیٹھا بیٹھا دیکھ رہا تھا کرامت کے ہاتھ میں ایک پتلی سی ڈنڈی تھی جس سے وہ ڈرم میں پڑے کوڑے کو کھنگیر رہا تھا تھوڑی دیر بعد قدیر والا پیکٹ اُسے دکھائی دیا جسے نکال کر وہ کمرے میں لے آیا

"شاباش بیٹا" کرامت آتے ہی بولا "بڑے سمجھدار معلوم ہوتے ہو۔ ابے الّو اللہ نے تھوڑی بہت کچھ عقل دی ہے یا نہیں۔ دوسو گرام سونا اٹھا کر کوڑے دان میں پھینک دیا۔ اگر صفائی والا نکال لے جاتا تو؟"

قدیر تھوڑی دیر چپ رہا پھر نیا شوشہ نکالا کیوں کہ اس کے پاس کرامت کی بات کا کوئی جواب نہ تھا

"یہ نقلی سونا تمہیں رکھو اپنے پاس"

"نالائق" کرامت کو غصہ آ گیا" لے یہ رسید دیکھ۔ بالکل اصلی سونا ہے اور اس کی قیمت ہے پچاس ہزار روپے۔ دونوں پیکٹوں میں ایک لاکھ کا سونا ہے۔ لے سنبھال" کرامت نے دونوں پیکٹ قدیر کی گود میں پھینک دیئے۔ قدیر نے دونوں پیکٹ اٹھا لئے۔

"مگر ایک بات سن لو برخوردار" کرامت پلٹ کر بولا "میں نے اپنے وعدے پر تم کو پچاس

ہزار کا سونا دیا اب آگے تم بھی میرا کہنا ماننا۔ میری کسی بات میں کھُر پیچ نہ نکالنا۔ کوئی مخالفت نہیں کروگے۔ سمجھ گئے۔ ارے بیٹا۔ میرا مطلب ہے میں باپ ہی کے درجہ پر ہوں۔ تیرا خیال رکھتا ہوں۔ ہے کہ نہیں؟''

سونے کے دونوں پیکٹ پانے کے بعد قدیر ٹھنڈا پڑا تھوڑی دیر تک دونوں پیکٹوں کو ہاتھ میں لے کر باری باری تولتا رہا کرامت نے کہا

''اب اگر تم میرے ساتھ انور گنج تھانہ چلنا چاہو تو چلو تمہاری ماں وہیں ملیں گی مجھے بھی ذرا شاکر علی صاحب انسپکٹر سے باتیں کرنی ہیں''

قدیر نے کہا ''ایسا ہے خالو کہ تم چلو میں بعد میں آجاؤں گا۔ امّاں سے بتا دینا''

''تم کہیں اور جا رہے ہو کیا؟''

''ہاں'' قدیر بولا ''اور خالو یہ ایک پیکٹ تم رکھے رہو لوٹ کر لوں گا''

''جلدی واپس لوٹنا میں تمہارا انتظار کروں گا'' کرامت نے کہا

سونے کا پیکٹ پانے کے بعد قدیر نے یہ سوچا کہ اس سونے کو اسی سیٹھ کی دوکان پر کچھ کم داموں میں بیچ کر اپنا پیسہ نقد کر لے اُسے کرامت کی ہتھ پھیری کا کوئی علم نہیں تھا اس کے علاوہ سونا خریدنے کی رسید بھی وہ کرامت علی سے لے کر اپنے قبضے میں کر چکا تھا اس لئے بلا خوفِ وخطرہ وہ اسی جوئیلر کی دوکان پر پہونچ گیا۔ قدیر نے سیٹھ سے کہا

''یہ سونا آج دن میں آپ کی دوکان سے خریدا گیا ہے اسے آپ واپس لے لیں گے؟''

سیٹھ نے پیکٹ اس کے ہاتھ سے لے لیا اس پر اسی دوکان کا لیبل چپکا تھا وہ خوشی سے کِھل اُٹھا اُسے اس کا ذرا بھی شائبہ نہ تھا کہ اس کا سونا اتنی جلدی اُسے واپس مل جائے گا۔

''ہاں ہاں واپس ہو جائے گا'' سیٹھ بولا ''کتنے میں لے گئے تھے۔ اس کی رسید ہے آپ کے پاس؟''

قدیر نے جھٹ رسید نکال کر اُسے دے دیا

''آپ سو دو سو روپے کم بھی دیں گے تو دے دوں گا'' قدیر نے کہا

سیٹھ نے رسید دیکھی۔ پیکٹ کھول کر مال دیکھا۔ پرکھا۔ پھر بڑی خوش دلی سے بولا

''ارے سو دو سو کی کیا بات ہے۔ یہ تو ہمارا روز کا کام ہے۔ آپ تشریف رکھئے''

یہ کہہ کر سیٹھ نے آواز دی ''ارے رام موہن - ذرا بھلّے۔ کلّو۔ لو گوپال اور پہاڑی کو بلا لاؤ۔ کہنا بہت ضروری کام ہے دو منٹ کو آجائیں''

پھر قدیر سے پوچھا ''آپ چائے یا کافی کیا لیں گے؟''

''کوکا کولا منگوا لیجئے بس'' قدیر صوفہ پر بیٹھتے ہوئے بڑی تمکنت سے بولا

''میرے خیال میں تو یہ مال کوئی دوسرے صاحب لے گئے تھے۔ آپ کے کوئی رشتہ دار ہیں کیا؟''

''جی ہاں وہ میرے خالو ہیں۔ خالو سمجھتے ہین نا آپ؟۔ موسا۔'' قدیر نے بتایا

''اچھا اچھا۔ آپ کا شبھ نام کیا ہے؟'' اس نے پوچھا

''میرا نام قدیر ہے'' وہ بولے

تھوڑی دیر بعد چار ہٹے کٹے بدمعاش اندر آئے اور سیٹھ کا اشارہ پاتے ہی قدیر کے ارد گرد کھڑے ہو گئے۔ سیٹھ نے ان لوگوں سے کہا

''بھلّے۔ قدیر صاحب کو اندر لے چل کے چائے پانی کراؤ۔ میں روپے لے کر آتا ہوں''

بھلّے نے پیچھے سے قدیر کا کالر پکڑ کر صوفہ سے اٹھا دیا دوسرا اس کو شانے سے دھکّا دیتا اندر لے چلا قدیر اس غیر متوقع خاطر داری پر ''ارے۔ ارے'' کرتا رہ گیا۔

''بتاؤ جو آدمی یہاں سے سونا لے گیا تھا وہ کہاں رہتا ہے مجھے اس کا پتہ چاہئیے'' سیٹھ نے پوچھا قدیر کے جواب سے پہلے ہی دو غنڈے چاقو نکال کر کھڑے ہو گئے۔

''آخر بات کیا ہے؟۔ آپ لوگ میرے ساتھ ہاتھا پائی کیوں کر رہے ہیں؟'' قدیر نے پوچھا

''زیادہ سوال جواب نہیں شریمان'' سیٹھ بولا ''جو آدمی یہاں سے سونا لے گیا ہے جب تک وہ خود نہیں آتا نہ سونا تمہیں ملے گا نہ روپئے۔ اور نہ تم یہاں سے جا سکتے ہو''

''واہ صاحب'' قدیر بولا ''اچھی زبردستی ہے۔ آپ لوگ دن دہاڑے لوٹ رہے ہیں''

''پہلے اس آدمی کا پتہ بتاؤ'' ایک غنڈہ بولا ''جب تک نہ بتاؤ گے میں جانے نہ دوں گا''

''کیوں بتاؤں۔ میں تمہارا نوکر ہوں کیا؟''

گوپال اور پہاڑی آگے بڑھے اور قدیر کے دونوں بغلوں میں ہاتھ دے کر اُسے سر وقد اٹھا لیا اور اسی طرح لئے ہوئے بالکونی کی طرف چلے۔ بھلّے پیچھے سے بولا

''تین منزلہ چھجّے سے گرے بیٹا۔ تو ہڈیاں سرمہ ہو جائیں گی۔ دیکھ لو۔ اب بھی خیریت ہے۔''

''بتاؤ اس آدمی کا پتہ'' کلّو دھاڑا

''بتاتا ہوں'' قدیر جلدی سے بولا

ان لوگوں نے اُسے فرش پر کھڑا کر دیا اور بولے ''جلدی بتاؤ''

''ہوٹل مے فسلا ئیٹ۔ کمرہ نمبر سات'' قدیر نے بتایا

''شاباش۔ اور نام کیا ہے اس کا؟''

''کرامت علی''

سیٹھ نے قدیر کو ایک کمرے میں بٹھالیا اور بھلّے و پہاڑی کو کرامت کی تلاش میں ہوٹل روانہ کردیا۔

کرامت علی اپنے ہوٹل کے کمرے میں بڑی بے چینی و فکر مندی کے ساتھ پڑا زرّیں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اُسے شاکر علی کے ساتھ گئے تیسرا دن تھا ابھی تک تو وہ اسی امید اور آسرے میں تھا کہ شاکر علی زرّیں کو ہوٹل واپس لے آئیں گے یا اس بارے میں اپنے اخلاقی فرض کو محسوس کرکے خود ہوٹل آکر اُسے بھی اپنے گھر لے جائیں گے یا کم از کم ٹیلی فون کے ذریعہ پیغام بھیجیں گے مگر ابھی تک ان میں سے اُس کے توقع کے برخلاف کوئی بات نہیں ہوئی پھر اس بے قراری و بے چینی میں مزید اضافہ اس طرح ہوگیا کہ قدیر کی اطلاع کے بموجب داروغہ شیر علی ٹرانسفر ہو جانے پر شاکر علی کے یہاں مقیم تھے وہ ضرور زرّیں کی واپسی کے لئے اڑنگا لگائیں گے۔ اس طرح وہ اب اپنی ذمّہ داری کو اور بھی شدّت کے ساتھ محسوس کرنے لگا۔ اُس نے لیٹے لیٹے یہی طے کیا کہ وہ قدیر کی واپسی کا انتظار کئے بغیر تھانہ انور گنج جاکر شاکر علی سے ملے اور زرّیں کے بارے میں معلوم کرے۔ ابھی وہ جانے کے لئے تیار ہی ہو رہا تھا کہ ہوٹل کے مینیجر پانڈے جی نے آکر اطلاع دی

''بھائی صاحب۔ آپ کو انسپکٹر شاکر علی نے تھانہ انور گنج میں بلایا ہے۔ ابھی ان کا ٹیلی فون آیا تھا وہ دو دن سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔''

''دو دن سے انتظار کر رہے ہیں۔ اور ٹیلی فون آج کیا ہے'' کرامت علی بڑبڑایا پانڈے کے جاتے ہی جوئیلر سیٹھ کے فرستادہ غنڈے بھلّے اور پہاڑی اندر آگئے

''کیوں بھائی صاحب آپ ہی ہیں قدیر کے خالو؟''

''ہاں بھائی مگر آپ لوگ کون ہیں۔ قدیر کو کیوں پوچھ رہے ہیں؟'' کرامت نے پوچھا

''قدیر کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے'' بھلّے نے بتایا ''وہ چلتی ہوئی بس سے نیچے گر کر ایک موٹر کار سے ٹکرا گئے۔ کافی زخمی ہیں۔ اُرسلا اسپتال میں بھرتی ہیں۔ ہوش آگیا ہے گھبرانے کی بات نہیں ہم لوگ انھیں کے بتائے ہوئے پتہ پر یہاں تک آئے ہیں۔''

کرامت علی جلدی جلدی کمرے کا دروازہ بند کرکے ان دونوں کے ساتھ ہوگیا۔

☆☆☆

داروغہ شیر علی کی تقرری عارضی طور پر شہر کے ایک تھانے میں ہوگئی تھی مگر وہ مدنی پور سے آنے کے بعد اپنے سالے شاکر علی کے یہاں ٹہر گئے تھے اور کھانا پینا بھی سردست اُنھیں کے یہاں تھا۔ اس دن دوپہر میں کھانے پر شیر علی نے شاکر علی سے کہا۔

''وہ جو عورت مدنی پور سے آکر تمہارے گھر میں ٹھہری ہے اُسے بلاؤ''

''اوہو۔ تمہارا مطلب ہے.........'' شاکر علی نے پوچھا

''ہاں ہاں وہی'' شیر علی بولے

''وہ میری بہن صبیحہ ہے'' شاکر علی نے کہا ''ابھی بلاتا ہوں''

شاکر علی نے اپنی بیگم کو آواز دے کر کہا کہ وہ صبیحہ کو لے کر آجائیں۔ زرّیں اندر آئی تو شیر علی نے اُسے دیکھا اور بلا تعارف شاکر علی سے مخاطب ہو کر بولے

''یہی تمہاری بہن ہیں؟۔ کیا تم نے مجھے الّو سمجھ لیا ہے شاکر؟''

''نہیں تو'' شاکر علی نے جلدی سے کہا

''کیا نہیں تو'' شیر علی بولے ''یہ تمہاری بہن نہیں ہیں یا تم مجھے الّو نہیں سمجھتے''

''کیوں شیر علی۔ انھیں دیکھتے ہی تم چراغ پا کیوں ہوگئے۔ انھیں جانتے ہو کیا؟''

''بہت اچھی طرح جانتا ہوں'' شیر علی نے کہا ''یہ یہاں کس کے ساتھ آئی ہیں؟''

''اپنے بہنوئی کرامت علی کے ساتھ۔ تمہارے ہم زلف کے ساتھ'' شاکر صاحب نے بتایا

''کرامت علی کے ساتھ'' شیر علی طنزیہ بولے ''وہ کم بخت شیخ زادہ۔ کہتا ہے انھیں پولیس والوں کی دوستی میں بڑا مزہ آتا ہے''

''تو کیا کرامت علی تمہیں ملے تھے؟'' شاکر نے پوچھا

''یار ایسے ایسے بدمعاش ہمیں روز ملتے ہیں۔ حرامزادہ شہر میں ٹھگی کرتا پھرتا ہے''

''خیر خیر'' شاکر علی بولے ''مگر ایک بات تم اچھی طرح نوٹ کرلو کہ صبیحہ میری بہن ہے سگی بہن اور جو رویّہ سابق میں تمہارا اس کے ساتھ رہا ہے وہ غیر پسندیدہ اور نہایت معیوب تھا''

''سبحان اللہ'' شیر علی نے کہا ''آتے ہی سب کچھ گوش گذار کردیا۔ میں کہتا ہوں شاکر یہ عورت تمہاری بہن ہے یا نہیں مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں مگر میرے بارے میں کون سی معیوب بات تم نے سنی ہے؟ ذرا مجھے بھی بتاؤ''

شاکر علی نے اپنی بیگم اور زرّیں کو اندر جانے کا اشارہ کیا

''عورتوں کے سامنے ایسی باتیں نہیں کرتے'' شاکر علی نے کہا

''تم نے عورتوں کی موجودگی میں میرے کردار کو غیر پسندیدہ و معیوب کیوں کہا۔ بولو۔ کیا اس کے ساتھ عقد کی خواہش کرنا غیر پسندیدہ فعل ہے۔ خلاف شرع بات ہے؟''

''اگر وہ اس پر رضامند نہیں ہے تو ضرور لائق اعتراض بات ہے'' شاکر نے کہا

''واہ!۔ دو ہی دن میں اتنے ہمدرد ہوگئے شاکر صاحب'' شیر علی کھڑے ہوگئے ''ٹھیک ہے

وہ چاہے میر صاحب کے ساتھ رہے چاہے آپ کے ساتھ۔ رکھیل ہمیشہ رکھیل کہی جائے گی''

''کیوں فضول بات منہ سے نکالتے ہو شیر علی۔ میں کہہ چکا ہوں کہ وہ میری بہن ہے''

''بہن بہن بہن'' شیر علی تنک کر بولے ''کتنی بار دوہراؤ گے اس بات کو مجھے پاگل یا بیوقوف مت سمجھو شاکر۔ نجمہ کو مرے کتنے سال ہو گئے آج اس کی ہم شکل کو دیکھ کر تم نے حواس کھو دیئے۔ جھٹ بہن بنالیا۔ مگر میں اُسے دیکھ کر بدحواس نہیں ہوا وہ نجمہ کی جگہ تو لے سکتی ہے نجمہ نہیں بن سکتی یہ میں اچھی طرح سمجھتا ہوں''

''شیر علی تم میری بات سمجھنے کی کوشش کرو'' شاکر نے کہا

''میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں'' شیر علی بولے ''تم نے کرامت کو میرا ہم زلف کہا ہے تو میں تمہارے دل کی بات سمجھ گیا میرے ساتھ نکاح پر نہ تمہاری بہن راضی ہیں نہ تم۔ تو پھر بات صاف ظاہر ہو گئی کہ تم دونوں اس بھڑوے شیخ زادے کی طرف راغب ہو اور مجھے مفت میں ہم زلف بنا کر تسلّیاں دے رہے ہو''

اتنا کہہ کر شیر علی غصہ میں بھرے اُٹھے اور بڑبڑاتے ہوئے باہر چلے گئے

''اور میں نے اگر اس کرامت کے بچے کی ہڈیاں کتّوں سے نہ نچوائیں تو شیر نہیں بکری سمجھنا''

شیر علی کے جانے کے بعد شاکر بڑی فکر مندی کے ساتھ چپ چاپ بیٹھے رہے دراصل جو تحیّر وہ شیر علی کو زرّیں کی اصلیت بتا کر دینا چاہتے تھے وہ ممکن نہ ہو سکا بلکہ معاملہ کچھ زیادہ سنگین ہو گیا۔ کرامت کی طرف سے شیر علی کے دل میں اس قدر غم و غصہ دیکھ کر وہ بڑے مضطرب ہوئے یہی نہیں بلکہ زرّیں کے بارے میں بھی ان کے خیالات بڑے فکر انگیز تھے وہ انھیں تصوّرات میں تھے کہ ان کی بیگم کے ساتھ ثریّا اور زرّیں کمرے میں آئے تو اُنھیں مضمحل بیٹھا دیکھ کر ثریا نے پوچھا

''ماموں جان- ابّا جی کیوں ناراض ہو کر چلے گئے؟''

شاکر علی کسی قدر بناوٹی ہنسی کے ساتھ بولے ''کچھ نہیں بیٹی مجھ پر بگڑنا ان کی پرانی عادت ہے''

''میں سمجھتی ہوں'' زرّیں نے کہا ''مجھے اس گھر میں دیکھ کر وہ ناراض ہوئے ہیں۔ بھائی صاحب آپ نے میری وجہ سے یہ برائی لی ہے اچھا ہے کہ میں یہاں سے چلی جاؤں''

''یہ سوچنا تمہارا کام نہیں صبیحہ'' شاکر بولے ''تم میری بہن ہو۔ تمہیں تو میرے ساتھ رہنے کا حق ہے تم فکر مند کیوں ہو''

''میں کہتی ہوں صبح تک وہ بالکل نارمل ہو جائیں گے'' شاکر کی بیگم نے کہا ''تم لوگ ان کے بگڑنے کا بالکل برا نہ مانو۔ اب آویں گے تو میں سمجھ لوں گی اُن سے''

''آپ نے دولھا بھائی کا نام بھی بتا دیا ہے اس غصہ میں اگر انھوں نے کچھ کر ڈالا تو کیا ہو گا

آپ اُنھیں روکئے وہ اس وقت بہت غصے میں گئے ہیں۔''

''ہاں ماموں جان۔ آپ انھیں سمجھا بُجھا کر لے آیئے۔'' ثریا نے کہا

''میں دیکھتا ہوں وہ کہاں گئے ہیں'' شاکر نے کہا ''تم لوگ فکر نہ کرو''

شاکر علی تیار ہو کر باہر چلے گئے۔

★★★

شیر علی کے سپاہیوں نے دوپہر میں کرامت علی کا تعاقب کر کے یہ بات معلوم کر لی تھی کہ وہ ہوٹل مے فسلائیٹ میں ٹھہرا ہے اور اُسی کی اطلاع کے بموجب اس وقت شاکر علی کے گھر میں جب انھوں نے زرّیں کو دیکھا اور یہ بھی سن لیا کہ وہ کرامت کے ساتھ مدنی پور سے آئی ہے تو یک بیک اُن کا دماغ گرم ہو گیا یہ بات بھی ان پر یقین کی حد تک واضح ہو گئی تھی کہ اس رات بھوانی پرشاد کے کوارٹر میں ان پر حملہ کرنے والا کرامت کے سوا کوئی اور نہیں تھا اس لئے اُسے سزا دینے کے ارادے سے شیر علی چل پڑے جب وہ ہوٹل میں نہیں ملا تو جوئیلر کی دوکان سے سونا کی خریداری میں مبیّنہ دھوکہ بازی پر گرفتاری کا میدان اُنھیں صاف دکھائی دیا وہ جیپ لے کر سیدھا جوئیلر کی دوکان پہونچ گئے۔ انھیں دیکھتے ہی سیٹھ نے دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر اور خوشی میں دانت چمکاتے ہوئے نمشکار کیا

''آپ نے دن والے وقوعہ کی رپورٹ کیوں نہیں لکھائی؟'' شیر علی نے پوچھا

''اس کی اوشکتا ہی نہیں ہوئی انسپکٹر صاحب'' سیٹھ نے کہا

''کیا مطلب؟'' شیر علی نے ڈپٹ کر پوچھا ''اوشکتا کیوں نہیں ہوئی؟''

''مطلب یہ کہ وہ سجّن مال واپس کر گئے۔ ارے صاحب بھول چوک تو مُنش سے ہو ہی جاتی ہے دیر آید درست آید۔ چلئے کوئی بات نہیں''

''کوئی بات نہیں؟'' شیر علی کو تاؤ آ گیا ''آپ نے گھاس تو نہیں کھائی۔ میں پوچھتا ہوں یہ فیصلہ آپ نے کیسے کر لیا۔ ایں: کیا قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے اور خود ہی فیصلہ کرنے کا اختیار آپ کو ہے۔ صبح تو دوبے جی سے شکایت کرنے کی دھمکی دے رہے تھے۔ رپورٹ بھی نہیں لکھائی اور اوپر سے ملزم کو چھوڑ بھی دیا۔ یہ من مانی میرے ساتھ نہیں چلے گی سیٹھ جی آپ اخفائے واردات کر رہے ہیں'' سیٹھ جی ان کی ہڑک میں جلد ہی آ گئے

''ارے صاحب مجھے نہیں معلوم تھا'' وہ گھبرا کر بولا ''وہ دونوں تو ابھی اندر ہی بیٹھے ہیں''

''کون دونوں؟'' شیر علی نے پوچھا

''ارے وہی آدمی-اوراس کے ساتھ اس کا بھتیجا''

قدیر تو پہلے ہی سیٹھ کی قید میں تھا۔کرامت کو بھی اس نے دھوکہ سے بلا کر دونوں کو ایک کمرہ میں بند کرر کھا تھا اس طرح وہ کرامت علی سے سونے کا دوسرا پیکٹ بھی حاصل کرنا چاہتا تھا۔چند منٹ بعد قدیر اور کرامت شیر علی کے سامنے پیش ہوئے تو قدیر کو وہاں دیکھ کر سخت تعجب ہوا شیر علی کو یہ امید نہیں تھی کہ کرامت کے ساتھ قدیر بھی ہوگا ایک نظر قدیر کو دیکھنے کے بعد شیر علی نے دوبارہ اس کی طرف نہیں دیکھا اور نہ کوئی بات کی البتہ کرامت کی طرف دیکھ کر انھوں نے اپنی مونچھوں کے کناروں کو مروڑ کر بل دیا

''کیوں مسٹر فورٹونٹی۔ٹھگی کرنے کے بعد پھر سونا واپس کر کے اپنی ایمانداری اور نیک چلنی کا جھنڈا کھڑا کرنے یہاں آئے تھے؟۔میں پوچھتا ہوں جب تم اتنے دودھ کے دھلے پار سا تھے تو یہ برا کام کیا ہی کیوں تھا''

کرامت ان کے اس جملے پر جلبلا کر بولا

''جناب آپ نے مجھے ٹھگ اور فورٹونٹی کہہ دیا مگر ان سیٹھ صاحب کی کھلّم کھلاّ ڈکیتی پر غور نہیں کیا۔انھوں نے اپنے بدمعاش نوکروں کے ذریعے ہم دونوں کو یہاں بلوا کر گھنٹوں سے قید کرر کھا ہے اور ہم پر بے جا سختی کرر ہے ہیں۔جو سونا ہم نے خریدا تھا وہ بھی انھوں نے زبردستی چھین لیا''

کرامت نے بتایا

''میں کچھ نہیں سنوں گا''شیر علی گرج کر بولے''اب جو صفائی دینا ہوگا وہ عدالت میں دینا''

''ٹھیک ہے''کرامت نے کہا''مگر انھوں نے جو ہم لوگوں کو یہاں قید کرر کھا ہے اس کی کوئی پوچھ گچھ نہ ہوگی؟''

''پہلے چل کے حوالات کی سیر کرو مسٹر جانسٹن ساری پوچھ گچھ وہیں ہو جائے گی''

کرامت علی ابھی تک یہی سمجھ رہا تھا کہ شیر علی اس کے ساتھ دکھاوے کی سختی کرر ہے ہیں۔

''سونا اور رسید ان سے واپس دلا دیجیے میں چلنے کو تیار ہوں''کرامت نے کہا

''ابھی تو یہ قیمتی پن ہیڈ کا گرم سوٹ جو آپ نے زیب تن کرر کھا ہے مجھے اس کے بارے میں پوچھنا ہے''

یہ کہہ کر شیر علی سیٹھ سے مخاطب ہوئے

''کیا سونا اور رسید انھوں نے آپ کو دیا ہے؟''

''جی نہیں''سیٹھ گھبرا کر بولا

''جی نہیں؟''شیر علی بولے''ابھی تو آپ نے کہا تھا کہ مال انھوں نے واپس کر دیا ہے''

''جی ہاں۔جی ہاں''وہ ہکلانے لگا

''ہم نے واپس نہیں کیا بلکہ انھوں نے زور زبردستی اور دھوکہ دے کر ہم سے چھین لیا ہے''

کرامت بولا

''زبردستی چھینا ہے؟''شیر علی نے سیٹھ سے مخاطب ہو کر بڑی نرمی سے پوچھا

''جی نہیں۔ہم نے کوئی زبردستی نہیں کی۔انھوں نے خود سے واپس کیا ہے''سیٹھ بولا

''ایک ہی بات ہے''شیر علی نے فیصلہ سنایا''تو آپ مال اور اس کی رسید انھیں فوراً واپس کر دیجیے کیونکہ جب تک آپ ان کے خلاف ایف آئی آر نہ درج کرائیں گے اس وقت تک نہ تو آپ کی کوئی بات سنی جائے گی اور نہ یہ مال چھیننے کا آپ کو حق ہے۔اور مسٹر آپ دونوں میرے ساتھ تھانہ چلیے وہاں آپ کی خاطر مدارات کی جائے گی''

شیر علی کو دل ہی دل میں پھر ڈیڑھ سو گالیاں دے کر سیٹھ نے جبراً وقہراً سونے کا پیکٹ اور رسید لاکر کرامت کو دے دیا۔کرامت نے پیکٹ کا وزن ہاتھ پر محسوس کر کے تسلّی کر لی۔

شیر علی ان دونوں کو اپنی جیپ میں بٹھا کر تھانہ لے چلے۔جوئیلر کی دوکان پر شیر علی کی اتفاقیہ اور غیر متوقع آمد کو کرامت نے اپنے حق میں حسب سابق بے حد عافیت بخش اور من جانب اللہ ایک مدد تصوّر کیا تھا کیوں کہ اسے اس بات کی ذرا بھی امید نہیں تھی کہ شیر علی نجات دہندہ بن کر اچانک وہاں آجائیں گے۔جیپ چلی تو کرامت بولا

''مان گئے ہم آپ کی پہونچ کو''

''چوب بے!''شیر علی نے اُسے بڑے زور سے ڈانٹا''پہلے تھانے چل پھر دکھاؤں گا اپنی پہونچ کو۔ساری ہتھ پھیریاں نکال دوں گا بیٹا تمہاری''

''ہم سے کوئی غلطی ہوئی کیا؟''کرامت نے ڈرتے ڈرتے پوچھا

''نہیں نہیں۔تم سے کوئی غلطی نہیں ہوئی''شیر علی طنزاً بولے''تم تو بالکل بے گناہ ہو''

شیر علی کے لہجے میں چھپی تلخی کو کرامت نے محسوس کر لیا

''میں اپنی غلطیوں کے لئے آپ سے معافی چاہتا ہوں''کرامت بولا

''کون سی غلطی کی معافی مانگ رہے ہو شیخ جی''شیر علی نے پوچھا''میرے سر پر جو ڈنڈا مارا تھا اُسی غلطی کی نا؟''

''جی!''آواز کرامت کے گلے میں پھنس گئی

شیر علی نے اب قدیر کی طرف دیکھا اور بڑے طنزیہ لہجہ میں بولے

''واہ بیٹے واہ۔کیا شرافت دکھائی ہے تم نے-ٹھیک ہی ہے جس صحبت میں رہو گے اس کا اثر تو ضرور ہی پڑے گا۔اچھی ٹریننگ لے رہے ہو شیخ جی سے''

قدیر نے کوئی جواب نہیں دیا سر جھکائے بیٹھا رہا مگر کرامت نے پوچھا

''آپ مجھے کس الزام میں گرفتار کر کے لے جا رہے ہیں؟''

''نہیں بتاؤں گا'' وہ حلق کے بل ڈپٹ کر بولے

اس کے بعد کرامت علی نے کوئی سوال نہیں کیا۔ شیر علی کی جیپ تھانے پہونچی تو انسپکٹر شاکر علی وہاں پہلے سے موجود تھے شیر علی نے ان کی طرف دھیان دیئے بغیر ایک سپاہی کو حکم دیا کہ وہ ان دونوں کو حوالات میں بند کر دے۔ شاکر علی کرسی پر بیٹھے ہی بیٹھے بولے

''ایس او صاحب – میں اپنے بہنوئی اور بھانجے کی ضمانت لینے آیا ہوں''

''کون ہیں وہ لوگ۔ نام بتایئے'' شیر علی انجان بن کر بولے

''وہ لوگ – جنھیں ابھی ابھی آپ نے حوالات میں بند کیا ہے'' شاکر علی بولے

''اچھا! یہ دونوں – ہاں ہاں صاحب۔ ضرور لیجئے ان کی ضمانت۔ لے جایئے لے جایئے۔ نئے نئے رشتے گڑھے۔ بہن اور بھانجے کی نوعیت تو سمجھ میں آتی ہے مگر اس کھڑوس کو بار بار اپنا بہنوئی اور میرا ہم زلف بتانے میں کون سی طرفگی ہے یہ میں نہیں سمجھ سکتا۔ خیر آپ مجھے چڑ کے لگانے اور میرے کار منصبی میں مداخلت کرنے آئے ہیں تو ٹھیک ہے۔ لے جایئے اپنے بدکار رشتے داروں کو میں بلا ضمانت کے چھوڑ رہا ہوں''

شاکر علی قدیر اور کرامت کو اپنے ساتھ لے کر اپنے گھر لوٹ آئے۔

★★★

جائس میں ہادی میاں نے اپنے اکلوتے فرزند وقار کے لئے سسرال کی طرف رخ نہ کرنے کا جو نادر شاہی حکم نامہ کچھ دنوں پہلے صادر کیا تھا اس پر دو تین روز تو وقار نے عمل کیا لیکن تیسرے دن جوان بیٹا اپنی دولھن سے ملنے کی تمنا میں ماں باپ کی سب ہی بندشیں توڑا کر چپکے سے سسرال پہونچ گیا۔ میر فدا حسین داماد کے دو دن تک نہ آنے سے متفکّر تو ضرور تھے مگر اُنھیں یہ بات نہیں معلوم تھی کہ ہادی نے اپنے بیٹے کو سسرال جانے سے روک رکھا ہے۔ دو دن نہ آنے کی وجہ پوچھنے پر وقار نے میر صاحب کو صرف اتنا بتایا ''پھوپھا جان اُس دن یہاں سری پائے کھا لئے تھے تو پیٹ گڑ بڑ ہو گیا۔ ڈاکٹر زیدی نے کھانے کی پرہیز اور گھر پر آرام کرنے کو بتایا تھا اسی لئے نہیں آ سکا''

''تمہیں یہاں کہلا دینا تھا بیٹے۔ اچھا جاؤ اندر جاؤ۔ اب ٹھیک ہو نا؟''

''جی ہاں۔ اب بالکل ٹھیک ہوں'' وہ بولا

مگر لاڈلی نے اس غیر حاضری کو سرسری طور پر معاف نہیں کیا۔ دیکھتے ہی پوچھا

''آ گئے آپ؟''

''بڑی دقتوں سے آ پایا ہوں لاڈلی'' اس نے کہا

''کیوں؟ کسی نے قید کر رکھا تھا آپ کو؟ – کون سی مصیبت آ پڑی تھی؟''

''تم نہیں جانتیں لاڈلی'' وقار نے سمجھایا ''ابّا نے یہاں آنے پر روک لگا دی تھی۔ بڑے سخت مزاج ہیں۔ کہا تھا اگر سسرال گئے تو تمہارے پیر تڑوا ڈالوں گا''

لاڈلی طنزاً بولی ''اچھا اچھا لنگڑا ہونا شاید آپ کے یہاں کی روایتی ضروریات میں داخل ہے اسی لئے انھوں نے کہا ہوگا''

''لیکن اگر میں یہاں نہیں آ سکا تو تم خود میرے گھر کیوں نہیں آ گئیں۔ اب تو تم میری شریک حیات ہو، تمہارے لئے تو کوئی رکاوٹ نہیں ہے'' وقار نے کہا

''سوال تو یہ ہے کہ آپ کیوں نہیں آئے۔ کیوں نہیں آ سکے۔ ابّا نے آپ کو کیوں منع کر رکھا تھا۔ آپ نے اس بندش پر کوئی آواز کیوں نہیں اُٹھائی۔ احتجاج کیوں نہیں کیا۔ ان باتوں کا جواب تو آپ کو دینا ہی ہے اس کے بعد آپ کے ابّا جان سے تو میں کچھ دنوں بعد پوچھوں گی کہ دولھا بن کر اور گھوڑے پر بیٹھ کر میرے دروازے پر کیوں آئے تھے۔ پوچھوں گی ضرور پوچھوں گی۔ میں سکینہ آپا نہیں ہوں کہ چپ چاپ بیٹھ جاؤں گی''

''چھوڑو لاڈلی۔ اب تو میں آ گیا ہوں'' وہ بولا

''چھوڑوں گی نہیں'' لاڈلی نے کہا ''آپ کو بتانا پڑے گا کہ کس لئے یہ روک لگائی گئی تھی''

''تمہاری کوئی بات نہیں لاڈلی'' وقار نے بتایا ''وہ تو پھوپھا جان سے ناراض ہیں''

آپ اس وقت بھی چوروں کی طرح چھپ چھپا کر آئے ہیں؟''

''ہاں'' وہ بولا

''اچھا ٹھیک ہے۔ اب تین دن تک میں آپ کو یہاں سے نہ جانے دوں گی'' لاڈلی نے کہا

''نہیں نہیں۔ یہ مت کرنا لاڈلی۔ میں اسی طرح چھپ چھپ چھپا کر آ جایا کروں گا''

''بس خاموش رہئے'' لاڈلی سخت لہجہ میں بولی ''مجھے یہ چوری اچھی نہیں لگتی۔ ہماری شادی ہوئی ہے کسی سے ڈرنا کیسا''

''تم سمجھنے کی کوشش کرو لاڈلی'' وہ بولا ''میں ابّا کی حکم عدولی کیسے کر سکتا ہوں''

''اچھا – یاد کیجئے اپنے وہ الفاظ جس میں آپ نے کہا تھا کہ تمہارے کہنے پر چلوں گا ابّا کے حکم پر نہیں''

''ہاں ہاں- کہا تو تھا'' وہ سر جھکا کر دھیرے سے بولا

''تو ابھی اپنے ساتھ مجھے گھر لے چلئے'' وہ بولی ''انھوں نے آپ کو یہاں آنے کے لئے منع کیا ہے مجھے اپنے ساتھ لے جانے کو تو نہیں منع کیا''

''مگر میں تمہیں اپنے ساتھ کیسے لے چلوں'' وقار نے کہا ''ایسا کرو کہ تم نائین کے ساتھ ڈولی میں بیٹھ کر آ جانا''

''نہیں'' وہ بولی

''تو پھر میں سکینہ آپا سے کہوں گا۔ وہ تمہیں اپنے ساتھ لے جائیں گی''

عین اسی وقت کسی نے دروازے پر دھیرے سے آواز دی ''وقّن'' یہ سکینہ کی آواز تھی وقن نے گھبرا کر کمرے کا دروازہ کھولا چھت پر سکینہ آپا کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا

''ابّا آفت مچائے ہیں کہتے ہیں تم ضرور یہاں ہوگے اس لئے مجھے پتہ لگانے کو بھیجا ہے''

''اب کیا کروں اپّی۔ کہئے تو یہاں سے بھاگ جاؤں چپکے سے'' وقار نے کہا

''نہیں۔ بھاگو نہیں'' سکینہ بولی ''میں کہہ دوں گی تم یہاں نہیں ہو۔ بس''

''اور بعد میں اُنھیں پتہ چل گیا تو؟'' وقار نے ڈرتے ڈرتے کہا

''افّوہ'' سکینہ اپنا ماتھا پیٹ کر بولی ''تمہیں کوئی بہانہ بھی نہیں آتا۔ ارے کچھ بھی بک دینا''

سکینہ جانے لگی تو وقّن خوشامدانہ لہجہ میں بولا

''اے اپّی۔ میری اپّی۔ دیکھو تم ابّا کو نہ بتانا میری بہن''

''بتاؤں گی۔ خوب بتاؤں گی'' وہ ہنس کر زینہ سے اترنے لگی ''بدّھو کہیں کا''

اس رات بہت دیر تک وقار کا انتظار کرنے کے بعد ہادی کا پیمانۂ ضبط وصبر چھلک پڑا۔ اگر چہ سکینہ نے انھیں بتا دیا تھا کہ وقن سسرال میں نہیں ہے بلکہ کسی ضروری کام سے رائے بریلی گیا ہے لیکن جہاندیدہ ہادی نے اس بات کا یقین نہیں کیا وہ خوب اچھی طرح اس بات کو سمجھ گئے تھے کہ تاکید کے باوجود لڑکا اپنی سسرال پہونچ گیا ہے جوان کے لئے باعث توہین ہے۔ وہ چپکے سے اٹھے اور بیساکھی ٹیکتے ہوئے میر فدا حسین کے دروازے پہونچ گئے۔ رات کے دس بج چکے تھے مگر میر صاحب کا دیوان خانہ کھلا تھا جس میں بجلی کا کم پاور والا بلب روشن تھا اور میر صاحب گاؤ تکیہ کے سہارے تخت پر نیم دراز تھے۔ ہادی کی بیساکھیوں کی کھٹ کھٹ سنتے ہی وہ اٹھ بیٹھے۔ ہادی نے باہر ہی سے کڑک کر پوچھا ''وقّن یہاں آیا ہے؟''

''ہاں ہاں۔ آیا ہے'' میر فدا حسین بولے ''اندر آرام کر رہا ہوگا''

''آرام گیا اس پر'' وہ چنگھاڑے ''نکالو مردود کو باہر''

اتنا کہہ کر ہادی کمرے میں داخل ہوگئے میر فدا حسین اخلاقاً اُٹھ کھڑے ہوئے

''کیسی باتیں کرتے ہو ہادی اس کی نئی نئی شادی ہوئی ہے''

میر صاحب اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ ہادی نے غصہ میں جلبلا کر پہلے نئی نئی شادی کو ماں کی ایک غلیظ گالی سے نوازا پھر داہنے ہاتھ والی بیساکھی اُٹھا کر میر صاحب کے بڑے نازک مقام پر اتنی زور کا ٹھوکر مارا کہ وہ بلبلا کر زمین پر گر پڑے۔ ہرنیا کے مریض تو پہلے ہی تھے اس ناگہانی حملہ سے ان کی آنتیں الجھ کر نیچے اتر پڑیں اور وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگے ہادی وہاں سے چپ چاپ کھسک لئے۔

میر صاحب رات ہی میں لاو پھاند کر اسپتال لے جائے گئے۔ لکھنؤ کے ڈاکٹر زیدی بڑے ہوشیار اور ماہر سرجن تھے اسپتال کے چھوٹے سے آپریشن روم میں پیٹرومیکس جلا کر میر صاحب کے ایمرجنسی آپریشن میں لگ گئے تو ڈیڑھ دو گھنٹے تک مصروف رہے۔ میر فدا حسین ہوش میں آئے تو کسی کو اصل واقعہ نہیں بتایا سب یہی سمجھے کہ اچانک آنتیں اتر آئی تھیں۔

★ ★ ★

انسپکٹر شاکر علی کے گھر پر کرامت علی غصّہ میں منھ پھولائے بیٹھا تھا ایک سے زائد بار وہ شاکر علی سے پوچھ چکا تھا کہ وہ نکاح کے بعد اس کی منکوحہ کو اپنے گھر کیوں لے آئے لیکن شاکر علی اس کو ایک نہ ایک بہانے سے ٹالتے رہے آخر مجبور ہو کر انھیں بتانا پڑا

''بھائی کرامت علی۔ میں نے یہ بات ابھی تک آپ کو نہیں بتائی تھی''

اتنا کہہ کر وہ ذرا دیر رکے تھے کہ کرامت بڑی بیتابی سے بولا ''کون سی بات؟''

''وہی جو آپ بار بار مجھ سے پوچھ رہے ہیں'' شاکر علی نے بتایا ''آپ ناراض نہ ہوں۔ بات یہ ہے کہ آپ کا نکاح میری بہن کے ساتھ نہیں ہوا میں نے مصلحتاً ابھی تک نہیں بتایا تھا''

''کیا؟'' کرامت علی بڑی بڑی آنکھیں نکال کر ایک دم کھڑا ہو گیا ''دیکھئے میں آپ کی بہن کو نہیں جانتا اور نہ اس سے میرا نکاح ہوا ہے۔ میرا نکاح زرّیں کے ساتھ ہوا ہے''

''ایک ہی بات ہے کرامت علی صاحب'' شاکر نے کہا ''زرّیں میری بہن ہے اور اس کے ساتھ آپ کا نکاح ابھی تک نہیں ہوا''

''کیا کہہ رہے ہیں آپ؟'' وہ بولا ''ایسا بھیانک اور تکلیف دہ مذاق مت کیجئے شاکر علی صاحب میرا تو دم ہی نکل گیا تھا''

''یہ مذاق نہیں ہے'' شاکر بولے ''نکاح نہ ہونے کی بات سولہ آنہ سچ ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ہوٹل مے فسلائیٹ میں زرّیں کو دیکھتے ہی اس کی اپنی مرحومہ بہن نجمہ سے ہو بہو مشابہت اور اس

کے ہاتھ کی چھٹی انگلی کو دیکھ کر میں اس نتیجے پر پہونچا کہ ہو نہ ہو وہ ضرور میری گم شدہ بہن صبیحہ ہے اس لئے میں نے ہوٹل میں آپ کے ساتھ اس کے فرضی نکاح کا ڈرامہ رچا تا کہ پہلے اُسے اپنے گھر لے آؤں پھر امّاں سے ملانے کے بعد ان کی اور خود صبیحہ کی مرضی جان لینے کے بعد اس کا نکاح کرادوں''

''اور اس بیچ شیر علی صاحب آپ کو مل گئے تو میرا پتّہ آپ نے کاٹ دیا۔ واہ صاحب واہ۔ سمجھ رہا ہوں میں آپ کی نیت کو۔ ایک غریب آدمی ہوں نا اس لئے آپ لوگ مجھے پسند نہیں کرتے'' اتنے میں شاکر علی کی ماں آسیہ خاتون آگئیں انھیں دیکھتے ہی شاکر علی نے کہا

''امّاں۔ آپ ہی سمجھائیے انھیں''

''میں کیا کہوں بیٹا'' آسیہ خاتون نے کہا ''یہ بھی میرے داماد اور شیر علی بھی میں کس کے حق میں بولوں اور کس کے حق میں نہ بولوں''

''آپ صرف حق بات بولئے کسی کی طرف داری مت کیجئے'' کرامت نے کہا

''تو بیٹا حق بات یہ ہے کہ صبیحہ کی مرضی مقدّم ہے۔ جو وہ کہے اُسی کو ماننا چاہئے'' آسیہ نے کہا

''یہی سہی'' کرامت بولا ''وہ تو خوشی خوشی میرے ساتھ آئی ہے۔ پوچھئے اُسی سے''

''ہاں ہاں پوچھوں گا'' شاکر نے کہا

''صرف پوچھنا ہی نہیں۔ میرے حالات کو جان لینے کے بعد آپ کو میرا ساتھ بھی دینا چاہئیے۔ میں زرّیں کو پیار کرتا ہوں۔ بیس برس میں نے اس کے انتظار میں کاٹے ہیں اور اب جب کہ وہ مجھے مل رہی ہے تو خدا کے لئے اس میں روڑے مت اٹکائیے''

''یقین کیجئے میں اس معاملہ میں بے ایمانی نہیں کروں گا'' شاکر نے کہا ''مگر ایک بار میں اس بارے شیر علی سے میں پھر بات کرنا چاہوں گا''

''کر لیجئے'' کرامت نے کہا ''لیکن انھیں یہ ضرور بتائیے گا کہ زرّو کا نکاح میرے ساتھ ہو چکا ہے۔ بس یہیں سے آپ کی ایمانداری شروع ہوتی ہے''

''نہیں۔ یہیں پر بے ایمانی ختم ہوتی ہے'' شاکر نے کہا ''اور میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں وہی کروں گا جو صبیحہ کی مرضی ہوئی''

کرامت علی کو انسپکٹر شاکر علی کے گھر میں اپنی مرحومہ بیوی رانی، زرّیں اور شیر علی کی بیوی نجمہ کے بارے میں جو تحیّر انگیز کہانی سنائی گئی اُسے سننے کے بعد اُس میں خود کرامت علی نے اپنی آپ بیتی کا پیوند لگا کر جو رنگ آمیزی کی اُس نے پوری کہانی کو اور بھی دلچسپ بنا دیا۔ اپنے بارے میں اُس نے گھر والوں کو بتایا کہ اب سے پچاس سال پہلے سن ۱۹۲۱ء میں جائس سے جگدیش پور اور تلوئی جانے والی روڈ پر بھیکی پور نام کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں اچانک ایک بڑے خدا رسیدہ بزرگ نمودار ہوئے جو

بندھیا چل یا مدھیہ پردیش کے جنگلوں میں اپنے مرشد کی خدمات کے صلے میں اس کرامت سے فیض یاب ہو گئے تھے کہ اگر کسی بیماری کو اپنی معجز نما انگلیوں سے مَس کیا ہوا پانی پلا دیں تو وہ بھلا چنگا ہو جائے گا۔ بابا جی کا یہ معجزہ بجلی کی طرح پورے ہندوستان بلکہ بیرون ملک بھی مشہور ہو گیا اور جائس ریلوے اسٹیشن سے بھیکی پور تک کی سات آٹھ میل سڑک ایک بڑے بارونق میلے کی شکل میں بدل گئی۔ مہینوں تک یہ سلسلہ جاری رہا دور دور سے اسپشل ٹرینیں جائس تک آنے لگیں لاکھوں کی تعداد میں یاتری اور مسافر ریل گاڑی اور دوسری سواریوں کے ذریعہ بھیکی پور پہونچ کر بابا جی کے درشن اور ان کا کراماتی پانی حاصل کرتے رہے۔ آس پاس کے نہ جانے کتنے کنوؤں سے ان کا پانی نچوڑ نچوڑ کر لوگوں میں بٹتا رہا یہاں تک کہ دھیرے دھیرے بابا جی کا معجزہ کچھ عرصہ بعد انھیں جذام جیسی لعنت میں مبتلا کر کے رخصت ہو گیا۔ اس معجزہ کے پرچار کرنے والوں میں بابا جی کا معتمد خاص جائس میں شاہ قطب شہید کے مزار کی مجاوری کرنے والا تکیہ دار عبداللہ شاہ درویش سب سے آگے تھا اس لئے کہ بابا جی کا چمت کار پہلے اُسی کے گھر میں جلوہ نما ہوا تھا اور اس کی بانجھ عورت کراماتی پانی پیتے ہی حاملہ ہو گئی تھی پھر نو مہینے بعد جڑواں بیٹا بیٹی جنم دیتے وقت وہ اللہ کو پیاری ہو گئی۔ بیٹی کو تو اس کی نانی لے کر چلی گئی مگر بیٹے کو عبداللہ نے اپنے ہی پاس رکھا اور اس کا نام پیر بخش رکھ دیا۔ عبداللہ درویش جائس کے میر الطاف حسین عرف اچھّن میاں کے گھرانے کا پروردہ بھی تھا اور انھیں کے باغ میں شاہ قطب شہید کے مزار پر مجاوری کے فرائض انجام دے کر ہر جمعرات کو شیرینی ملیدہ کے علاوہ دس بارہ روپوں کا چڑھاوا بھی پایا جاتا تھا اسی لئے اس پشتینی رعایت پر وہ اچھّن میاں پر نہ صرف اپنی جان چھڑکتا تھا بلکہ اپنی رعیتی کی سند میں اس نے اپنے اکلوتے فرزند پیر بخش کو اچھّن میاں کی کفش برادری میں دے دیا تھا جہاں اس کا نام پیر بخش سے بدل کر اچھّن میاں نے کرامت علی رکھ دیا۔ اچھّن میاں کے یہاں پیٹ بھر کھانا کھانے کے ساتھ ان کے چہیتے فرزند ہادی کی کفش برداری کرتے کرتے وہ ان کے ساتھ اسکول بھی جانے لگا۔ اسکول کے ماسٹر منشی چندر کشور کو اگر ہادی کی تنبیہ مد نظر ہوتی تو وہ انھیں کے سامنے کرامت علی کو بانس کی چھڑی سے پیٹ ڈالتے تھے تا کہ ہادی اس سے عبرت لیں۔ عبداللہ درویش مر گیا تو کرامت علی مزار کی مجاوری کے ساتھ ہادی کی مستقل خدمت گاری پر مامور ہو گیا یہاں تک کہ بیس سال کی عمر آتے آتے وہ گبرو جوان ہادی کا سچّا جاں نثار ہو گیا۔ ایک بار برگدّی تالاب میں نہاتے وقت ہادی میاں پانی میں ڈوبنے لگے تو کرامت نے اپنے سر کا پگڑّ ان کی طرف پھینکا اور اپنی طرف گھسیٹ کر انھیں ڈوبنے سے بچا لیا۔ گھر آنے پر اچھّن میاں کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو انھوں نے کرامت کو سینے سے لگا لیا اور اس خوشی میں اُسے انعام و اکرام سے نوازے نے کے لئے بڑی فراخدلی سے فرمایا

''بیٹا کرامت۔ میرے روئیں روئیں سے تیرے لئے دعا نکل رہی ہے۔ میں بے حد خوش

ہوں۔آج تو جو کچھ بھی مانگے گا میں تجھے بے شک دوں گا۔بول کیا چاہئے؟''

کرامت نے حماقت یہ کی کہ گرم لوہے پر فوراً چوٹ نہیں ماری بلکہ اُسے کچھ اور تپنے کے لئے چھوڑ دیا۔بڑی لجاجت کے ساتھ بولا''ابّا جی۔میں سوچ کر بتاؤں گا''

بات یہ تھی کہ اچھّن میاں کے کچھ رشتے دار بیر بھوم (بنگال) میں رہتے تھے جنھوں نے ۱۸۹۱ء کے قحط میں ایک غریب ولا وارث لڑکا عبدالشکور انھیں ''عطا'' کیا تھا۔عبدالشکور بڑا ہوکر مرشد آباد ہی میں رہنے لگا وہ کانپور کے ہندو مسلم فساد کے دوران دو خورد سال اور لاوارث بچّیوں کو کانپور ریلوے اسٹیشن کے آس پاس بے سہارا پا کر انھیں مرشد آباد لیتا گیا اُس کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی۔جب اس کی بیوی مرگئی اور وہ خود بھی بیمار رہنے لگا تو اس نے دونوں لڑکیوں کو اپنے آقا اچھّن میاں کے پاس جائس پہونچا دیا۔یہ لڑکیاں رانی اور زرّیں جوانی کی دہلیز تک آتے آتے فتنہ وقیامت میں بدل گئیں چھوٹی یعنی زرّیں پر ہادی دل وجان سے فدا تھے اور باپ سے چھپ چھپا کر اپنی محبت کی سب ہی نوازشیں اس پر لٹایا کرتے تھے۔کرامت بھی اس بات کو اچھی طرح سے جانتا تھا پھر بھی اس نے سوچا یہی وقت ہے اچھّن میاں سے زرّیں کو مانگ لیا جائے اس لئے رات میں جب وہ اچھّن میاں کے پیر دبانے بیٹھا تو دھیرے سے بولا

''ابّا جی۔آپ نے مجھے انعام دینے کو کہا ہے نا؟''

''ہاں ہاں۔کہا ہے۔ابھی صبح ہی کی تو بات ہے'' پھر اچھّن میاں نے بڑی شفقت کے ساتھ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا''مانگ لے۔کیا مانگنا ہے بیٹے؟''

''آپ ناراض تو نہ ہوں گے ابّا جی؟'' کرامت نے پوچھا

''نہیں بے۔ناراض کیوں ہوں گا'' وہ بولے

''تو ابّا جی-ہی ہی ہی-میری شادی-زرّیں کے ساتھ......'' وہ شرمانے لگا

''زرّیں کے ساتھ؟'' اچھّن میاں نے تصدیق کے خیال سے دوہرایا''یعنی کہ چھوٹی والی کے ساتھ؟''

''ہاں ابّا جی'' وہ اور بھی لجاجت سے بولا

''ابے تو اتنا گڑگڑا کیوں رہا ہے'' اچھّن میاں بولے'' میں انعام دے رہا ہوں بھیک نہیں۔بس سمجھ لے ہوگئی تیری شادی۔چل اب جلدی جلدی دبا پیر۔زرّیں کے میاں''

کرامت کو جیسے یقین ہی نہ آیا ہو وہ خوشی اور حیرت کے جذبہ سے اچھّن میاں کا منھ تکنے لگا

''مگر بیٹا کرامت علی۔ایک بات اچھی طرح کان کھول کر سن لو۔بغیر نکاح کے اگر لونڈیا کو ہاتھ لگایا تو سالے زندہ گڑوا دوں گا۔'' کرامت نے اس اخلاقی بندش کو صمیم قلب سے مان لیا

تھوڑی دیر بعد زرّیں اچھّن میاں کی چلم لے کر آئی تو وہ تخت پر لیٹے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے چلم اُس کے ہاتھ سے لے کر بولے''نیچہ تر کر کے لے آ''

زرّیں نیچہ بھگو کر واپس لوٹی تو اچھن میاں بولے''سُن سُن۔'' زرّیں کھڑی ہوگئی

''تجھے کرامت اچھا لگتا ہے؟''

زرّیں نے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔مسکرائی۔اور اندر بھاگ گئی۔اچھّن میاں سمجھ گئے۔

ہادی کو اپنے باپ کی سخاوت کا پتہ چلا تو تلملا گئے۔زرّیں کو وہ اپنا کھلونا سمجھتے تھے اور یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کے گھر کا ایک معمولی اور حقیر نمک خوار انھیں کی نظروں کے سامنے اتنا زبردست ڈاکہ ڈالے گا۔اُن کی محبوبہ اُنھیں کے سامنے اُڑا لی جائے گی۔اُنھوں نے کرامت سے پوچھ گچھ کرنے کے بجائے پہلے ابّا جان سے باتیں کیں''ابّا آپ نے بڑی بہن کو چھوڑ کر چھوٹی کی شادی طے کر دی''

''تم کس کے بارے میں پوچھ رہے ہو ہادی بیٹا؟'' اچھن میاں نے پوچھا

''آپ نے کرامت کی شادی زرّیں کے ساتھ طے کی ہے؟'' ہادی نے وضاحت کی

''اوہو۔ہادی وہ تو میں نے کرامت کو انعام دیا ہے'' اچھن میاں نے سمجھایا''بھائی اُسے میں نے زبان دی تھی کہ جو مانگے گا وہ میں دوں گا۔تمہیں تالاب میں ڈوبنے سے بچایا تھا نہ اس نے'' ہادی جھٹ ان پر حاوی ہوگئے''مشکل تو یہ ہے کہ آپ کچھ سوچ سمجھ کر کام نہیں کرتے۔دیکھئے اس سے کیا ہوگا۔اس سے یہ ہوگا کہ بڑی بہن کا دل ٹوٹ جائے گا۔اس کی بدنامی ہوگی۔رنگ روپ میں چھوٹی سے کم ہے اس لئے کوئی اس سے شادی نہ کرے گا۔کتنی بری بات ہوگی'' اور یہی ہوا کہ اچھن جلدی سپر انداز ہونے لگے

''ہاں ٹھیک تو کہتے ہو۔یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا'' پھر کچھ سوچ کر بولے'' تو ایسا کیا جائے ہادی کہ میں بڑی کا رشتہ بھی طے کر دوں پھر دونوں کو ایک ساتھ بدا کیا جائے''

''نہیں نہیں'' ہادی جلدی سے بولے''یہ بھی ٹھیک نہیں''

''ارے تو پھر تم ہی کچھ بتاؤ نا'' اچھن میاں بولے''بھائی میں نے کرامت کو منھ مانگا انعام دینے کو کہا تھا اُس نے جو مانگا میں نے ہاں کہہ دیا۔اور میں کیا کرتا''

''میں یہ کہتا ہوں'' ہادی کچھ سوچنے کی غرض سے کھنکھارنے لگے''دیکھئے ابّا۔کرامت نے میری جان بچائی تھی نا۔تو انعام بھی مجھی کو دینا چاہیئے''

''ہاں یہ تو ہے'' وہ بولے''تم بھی کچھ دے دو نا''

''توبہ-پھر آپ بیچ میں بول پڑے'' ہادی بولے''میں کہتا ہوں انعام آپ کو نہیں دینا چاہیئے''

''نہیں دینا چاہیئے؟'' اچھن میاں بالکل سپر انداز ہوگئے'' مگر اب تو میں دے چکا ہادی۔زبان ہار چکا ہوں۔اب میں کیا کر سکتا ہوں''

''ہاں اب کیا ہوسکتا ہے۔ یہ غلطی سدھر نہیں سکتی تاوقتیکہ خود کرامت ہی اس غلطی کا ازالہ نہ کردے۔ میرا مطلب ہے کرامت ہی کوئی حل نکالے تو نکالے''

یہ کہہ کر ہادی سر جھکائے وہاں سے چلے گئے۔ مگر اُسی رات کرامت مجرمانہ انداز میں سر جھکائے اچھن میاں کے آگے ہاتھ جوڑ کر گڑ گڑایا

''ابّا جی۔ مجھ سے ایک بھول ہوگئی ہے''

''بھول ہوگئی؟'' اچھن میاں بولے ''ارے تو ہو جانے دے تو روندھا کیوں ہے بتا کیا بات ہے۔ کون سی مصیبت آ گئی''

''آپ نے ابّا جی مجھ سے کہا تھا کہ جو انعام مانگو وہ میں دوں گا''

''ہاں تو میں نے دیا'' وہ گڑ بڑا کر بولے'' دیا کہ نہیں دیا؟''

''اُسے اب واپس لے لیجئے'' کرامت بولا

''کیا؟۔ اب تو بولا گیا ہے کیا۔ دے کر واپس کیسے لوں'' اچھّن میاں خفا ہوئے

''مجھے زرّیں نہ چاہیئے ابّا جی۔ میں خود لوٹا رہا ہوں''

''تیری مرضی۔ میں زبردستی نہیں کرتا۔ مگر یہ تو بتا کہ اتنی جلدی تو نے رائے کیسے بدل دی''

''کیوں کہ ہادی بھیّا نے مجھے بہت مارا ہے۔ یہ دیکھئے ابا جی یہ چوٹ۔ یہ دیکھئے۔''

''کیوں مارا ہے؟''

''کیوں کہ میں نے زرّیں کو آپ سے انعام مانگا تھا''

''تو اس میں مار پیٹ کی کیا ضرورت تھی۔ کیا کہتے تھے ہادی؟'' اچھن نے پوچھا

''کہتے تھے مجھے زرّیں کی جگہ رانی کے ساتھ بیاہ کرنا ہوگا'' کرامت نے بتایا

''اور تو نے ان کی بات نہیں مانی۔ بس یہی نا؟''

''ہاں ابّا جی۔ اسی پر مجھے ڈنڈے سے مارا''

''انھوں نے کام بالکل صحیح کیا'' اچھن میاں بولے ''دیکھو بڑی بہن سے پہلے چھوٹی کی شادی کر دینا معیوب بات ہوتی ہے اگر تم نے ہادی کے نیک مشورے پر عمل کیا ہوتا تو وہ کیوں مارتے کبھی کبھی تو انسان میں مار کھانے کے بعد عقل آتی ہے۔ ہادی تمہارے بڑے بھیّا ہیں۔ تمہارے خیر خواہ ہیں۔ بات تمہارے ہی بھلے کی کہی تھی۔ چلو جو ہوا اُسے بھول جاؤ میں ہادی کو بھی سمجھا دوں گا۔ ہاں تو بیٹا زرّیں کے بجائے رانی تمہاری ہوگئی نا۔ چلو اب ذرا ہنس تو دو۔ ہنسو ہنسو''

اس طرح کرامت اپنا دل مسوس کر رانی کے ساتھ بیاہ پر راضی ہوگیا۔ بستر پر جا کر گر پڑا اور لحاف میں منہہ ڈھانپ کر ہادی کو دل ہی دل میں خوب خوب کوسا۔ اے اللہ۔ تو نے کیسا انصاف کیا ہے۔

میں نے اس شیطان کی اتنی خدمت کی اُسے تالاب میں ڈوبنے سے بچایا اور اُسی نے میرے کلیجے پر یہ گھونسہ مارا۔ مجھے لنگی ماری۔ میری ٹانگ گھسیٹی۔ خداوندا اگر تو نے انصاف نہ کیا۔ تو میں ایک نہ ایک دن اس ظلم کا بدلہ ضرور لوں گا۔ اس کی ٹانگ گھسیٹوں گا۔ اُسے لنگی ماروں گا۔ پھر ایک دن رانی کے ساتھ اس کا بیاہ ہوگیا۔ پھر کیا معلوم اچھّن میاں نے اپنی دور اندیشی یا ہادی کی بدنیتی کا خطرہ محسوس کر کے کچھ عرصہ بعد زرّیں کو بھی اپنے گھر سے رخصت کر دینے میں بھلائی سمجھی۔ میری فدا حسین کسی موقع پر جب اپنے گاؤں مدنی پور سے جائس آئے تو اچھّن میاں نے انھیں بلا کر زرّیں کو ان کے سپرد کر دیا ''فدّن میاں۔ اس درشنی ہنڈی کو تم اپنے گاؤں لیتے جاؤ اور وہیں دیکھ سن کر کسی کھاتے پیتے لونڈے کے ساتھ اس کا نکاح پڑھا دو۔ میں بھی یہ کام کر سکتا تھا مگر اس کا اس گھر میں رہنا اب مناسب نہیں۔ میرا لڑکا جوان ہو چکا ہے۔ تم سمجھ دار ہو اسی لئے تم سے کہا ہے''

میر فدا حسین اُسے اپنے ساتھ جائس سے مدنی پور لے آئے اور اپنے کارندے رحمان کے ساتھ اس کی شادی کر دی۔

آسیہ خاتون نے کرامت کی سرگذشت بڑے غور سے سُنا پھر آبدیدہ ہوگئیں اور بڑے پیار وشفقت سے کرامت کے سر پر ہاتھ پھیر کر اُسے تسلّی دی

''تم نے صبیحہ کی خاطر اتنے دکھ جھیلے۔ میرا بس چلے تو میں اسی دم اس کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دے دوں لیکن کیا کروں جب تک صبیحہ نہیں کہتی ہم اُسے کیسے مجبور کر سکتے ہیں۔''

''اماں جی۔ میں ایک غریب آدمی ہوں لیکن میرے پاس پیار کی جو دولت ہے وہ کبھی نہ ختم ہونے والی ہے۔ آپ کی بڑی بیٹی میرے ساتھ بہت دنوں نہ رہ سکی اُس کی جدائی کا داغ اب بھی میرے سینے میں سلگ رہا ہے۔ آج بھی اس کی یاد آتی ہے تو لگتا ہے جیسے سب کچھ کل ہی کی بات ہو۔ میں نے اُسے بہت پیار دیا امّاں جی۔ بہت پیار دیا۔ صبیحہ یعنی زرّو کے لئے بھی میرے دل میں پیار کا اتھاہ سمندر ہے اس سے زیادہ اور میں کیا کہہ سکتا ہوں''

شاکر علی جو ابھی تک سب کچھ بڑے غور سے سن رہے تھے بولے

''کرامت بھائی۔ ابھی صبیحہ سے بات چیت کا موقع نہیں مل سکا ہم لوگ اس سے باتیں کریں گے اس کو سمجھائیں گے تب تک تم تھوڑا صبر سے کام لو''

''میں اس کے لئے تا زندگی انتظار کر سکتا ہوں۔ لیکن شیر علی صاحب جو بیچ میں آ گئے ہیں''

''مجھے ان سے بھی باتوں کا موقع دیجئے کرامت بھائی''

''کر لیجئے باتیں میں منع نہیں کرتا۔ لیکن انصاف سے کام لیجئے گا''

اتنے میں شیر علی آ گئے۔ بڑے غصّے میں تھے۔ کرامت علی کو گھر والوں کے ساتھ بیٹھا دیکھ کر

اور بھی صبر وسکون کھو بیٹھے۔ آسیہ خاتون نے شیر علی کی بے چینی محسوس کر کے ان کا ہاتھ پکڑا اور گھر کے دوسرے کمرے میں لے گئیں۔ تھوڑی دیر بعد شیر علی کے چلانے کی آواز سن کر شاکر علی اور کرامت بھی اس کمرے میں پہونچ گئے

''میرے ساتھ اس کا نکاح ہو چکا ہے'' وہ اپنی انگشت شہادت آسیہ خاتون کو دکھا کر گرجنے لگے''اور امّی جان میں بتائے دیتا ہوں۔ سب لوگ کان کھول کر سن لیں کہ اگر آپ لوگوں نے اس کے برعکس کوئی قدم اُٹھایا تو میں کسی کو بخشوں گا نہیں۔ قیامت آجائے گی اس گھر میں۔ خون کی ندّیاں بہہ جائیں گی''

شاکر علی بھی طیش میں آ گئے قدرے سخت لہجہ میں بولے

''کیوں اتنا چراغ پا ہو رہے ہو شیر علی۔ ذرا اپنے آپے میں رہو۔ کیا سمجھتے ہو تمہارے گرجنے چنگھاڑنے سے ہم لوگ تمہارے رعب میں آجائیں گے۔ مجھے تمہارے نکاح کی حقیقت معلوم ہے''

''کیا معلوم ہے؟۔ کیا جانتے ہیں آپ۔ ذرا میں بھی سنوں''

''میں یہ جانتا ہوں کہ تمہارا نکاح صبیحہ کے ساتھ قطعی نہیں ہوا'' شاکر علی بولے

''صبیحہ؟ - ہاں ٹھیک ہے۔ اس نام کی عورت کے ساتھ نکاح نہیں ہوا میرا نکاح زرّیں کے ساتھ ہوا ہے وہ تمہاری بہن ہو کہ نہ ہو''

''یہ بھی سراسر جھوٹ ہے'' شاکر نے کہا'' مجھے صبیحہ بتا چکی ہے اور خود تم بھی اقرار کر چکے ہو کہ تم اس کے ساتھ نکاح کرنا چاہتے ہو۔ یعنی ابھی نکاح نہیں ہوا۔ اور جب نہیں ہوا تو یہ فتنہ وفساد کس لئے اُٹھا رہے ہو۔ میں کہہ چکا ہوں کہ صبیحہ یعنی زرّیں میری سگی بہن ہے۔ اس کی مرضی جان لینے کے بعد ہی تمہارے یا کرامت بھائی جس کے ساتھ وہ رضامند ہوگی اسی کے ساتھ نکاح ہو جائے گا''

''کرامت بھائی!'' شیر علی بڑے طنزیہ لہجہ میں بولے ''یہ سالا کرامت بیچ میں کہاں سے آٹپکا۔ شاکر تم سچ مچ گھاس کھا گئے ہو میں کہتا ہوں یہ فرضی کہانی گڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ کہاں سے بن گئی وہ تمہاری بہن۔ کون ہے یہ کھوسٹ کرامت علی جس پر آپ لوگ اتنے مہربان ہیں۔ میں اس روسیاہ کو گولی کیوں نہ ماردوں کہ قصہ ہی ختم ہو جائے''

''قبلہ - میں وہی ہوں جو آپ نے بتایا تھا - یعنی آپ کا ہم زلف'' کرامت نے دھیرے سے بتایا

''تو مجھ سے مخاطب ہوا حرام زادے تو سارے دانت توڑ دوں گا تیرے۔ بس نکل جا یہاں سے کتّے''

''کیوں گالیاں بک رہے ہو شیر علی'' کرامت بولا ''لڑنا ہو تو ویسا بتاؤ''

''ارے!۔ ارے!۔ ابے تیری یہ ہمّت ۔ دیکھا شاکر رزیلوں کو سر چڑھانے کا نتیجہ۔ اب یہ کم ظرف مجھ سے مقابلے کی بات کر رہا ہے۔ ہاں کیوں نہیں۔ تمہاری شہ جو مل گئی ہے نا اِسے'' معاملہ بگڑتے دیکھ کر شاکر علی مصالحت کرانے لگے

''دیکھو۔ دیکھو۔ اس طرح لڑنے جھگڑنے سے بات نہیں بنتی ۔ میں کسی کی طرف داری نہیں کروں گا۔ دونوں میرے بہنوئی ہیں اس لئے اگر آپ دونوں راضی ہوں تو یہ معاملہ صرف صبیحہ یعنی کہ زرّیں کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے اس کا جو بھی فیصلہ ہوگا وہ سب کو ماننا پڑے گا۔ کیوں کیا کہتے ہیں آپ لوگ؟''

''میں کچھ نہیں کہتا'' شیر علی غصہ میں بولے

''میں راضی ہوں'' کرامت نے کہا

شیر علی نے پلٹ کر اُسے سر سے پیر تک دیکھا پھر بڑی حقارت سے بولے

''تم ضرور راضی ہو گے کیوں کہ ابھی تمہاری کھال کھنچائی نہیں ہوئی۔ کیسا جھٹ سے راضی ہو گئے''

''تو تم بھی راضی ہو جاؤ نا'' شاکر نے کہا

''میں اتنا بیوقوف نہیں ہوں۔ سمجھے؟'' شیر علی نے کہا ''اور دیکھو شاکر تم بیچ میں اپنی ٹانگ مت اڑاؤ۔ چھوڑ دو ہم دونوں کو۔ میں اس ناخواندہ سے نپٹ لوں گا''

''یار میں تو اس پر بھی راضی ہوں'' کرامت ہنس کر بولا ''ہو جائے کشتی دنگل۔ جو جیتے اُسی کے ساتھ نکاح ہو جائے۔ کیوں شیر خاں؟''

''ابے ٹھیک سے نام لے نہیں تو سالے گدّی سے زبان کھنچوالوں گا۔ میرا نام شیر علی ہے۔''

''شیر اور علی'' کرامت بولا ''علی ہیں تو اس کے ساتھ شیر کہنے کی کیا ضرورت۔ علی کہہ دینا کافی ہے کیوں کہ وہ تو خود ہی شیر خدا ہیں پھر شیر کیا حضرت علی سے بڑھ کر ہے؟''

''دیکھ رہے ہو شاکر اس کی بدزبانی'' شیر علی بولے

''چھوڑو یہ فضول کی تکرار'' شاکر نے کہا ''تم یہ بتاؤ کہ صبیحہ کے فیصلے کو مان لو گے؟''

''کبھی نہیں بتاؤں گا'' یہ کہتے ہوئے شیر علی غصّہ میں باہر چلے گئے اور قدیر کو اندر سے بلوا کر اپنی جیپ میں بٹھایا۔ کچھ دور جا کر قدیر سے بولے

''میں نے تم سے کہا تھا کہ کانپور میں انسپکٹر شاکر علی کے یہاں مجھ سے ملنا''

''جی ہاں'' قدیر نے کہا

''مگر تم مجھ سے ملنے کے بجائے اس بھڑ بھونجے کرامت علی کے پاس کیوں پہونچ گئے۔ میں

نے تم کو اس روز اپنے کوارٹر میں دیکھ کر گولی کیوں نہیں ماری۔ چھوڑ کیوں دیا۔ جانتے ہو اس کا مطلب؟''

''جی ہاں'' قدیر نے کہا

''کیا جانتے ہو؟''

''آپ کے ریوالور میں گولی نہ رہی ہوگی''

''شاباش'' شیر علی نے طنز کیا'' مگر اس وقت میرے ریوالور میں چھ گولیاں پوری ہیں۔ اور میں اس وقت بھی تمہیں گولی نہیں ماروں گا۔ بتاؤ کیوں؟''

کیوں کہ اس وقت میں آپ کے کوارٹر میں نہیں ہوں۔''

''غلط'' وہ بولے ''تم اگر میرے کوارٹر میں بھی ہو تب بھی نہیں ماروں گا۔ بولو کیوں؟''

''کیوں کہ آپ میرے خالو ہیں'' قدیر بولا

''یہ بھی نہیں۔ سوچ کر بتاؤ''

''اب آپ ہی بتا دیجئے'' قدیر نے کہا

''کیونکہ میں تمہیں اپنی فرزندی میں لینا چاہتا ہوں'' شیر علی نے کہا

''تو پھر میں آپ کو گولی ماروں گا'' قدیر بولا ''ابھی تک آپ کے دماغ کا کیڑا نکلا نہیں پھر وہی کھیل شروع کر دیا''

''نہیں نہیں۔ تم غلط سمجھے قدیر۔ میں تمہیں اپنا داماد بنانا چاہتا ہوں''

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔ بنا لیجئے میں راضی ہوں'' قدیر نے کہا

''تم ابھی اور اسی وقت جاؤ اور جا کر اپنی والدہ کو میری بات بتاؤ اور دیکھو وہ کیا کہتی ہیں جو کچھ وہ جواب دیں مجھے آ کر بتاؤ''

''بس میں ابھی گیا اور ابھی آیا'' قدیر نے کہا ''آپ سمجھ لیجئے وہ اس رشتہ پر راضی ہیں۔''

انسپکٹر شاکر علی زرّیں کو نشیب و فراز نیک و بد سمجھاتے رہے

''دیکھو صبیحہ۔ مجھے تم پر زور زبردستی کرنے کا حق تو نہیں البتہ تمہاری بھلائی کے لئے کچھ باتیں بتا دینا نہایت ضروری ہے۔ شیر علی اور کرامت دونوں سے تم بخوبی واقف ہو اور یہ دونوں بھی تمہیں پسند کرتے ہیں۔ ان میں تمہارے لئے کون بہتر ہے اس بات کا فیصلہ تمہیں کو کرنا ہے۔ تم جس کے حق میں فیصلہ دو گی اسی کا ساتھ تمہارا عقد ہو جائے گا۔ ویسے دانش مندی اسی میں ہے کہ تم شیر علی کو پسند کر لو''

زرّیں جواب تک سر جھکائے سن رہی تھی اس نے نظریں اٹھا کر شاکر کی طرف دیکھا

''کیوں؟۔ کس لئے؟'' اس نے پوچھا

''مصلحتاً'' شاکر بولے ''تم نے مجھے بتایا ہے کہ قدیر اور ثریّا دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں یہ ایک اچھا موقع ہے اگر تم چاہتی ہو کہ دونوں کی شادی ہو جائے تو اس کے لئے تمہیں کچھ ایثار برتنا ہوگا۔ کچھ قربانی دینی ہوگی''

''کیسی قربانی؟'' زرّیں نے پوچھا

''شیر علی کی بات ماننی پڑے گی''

زرّیں آبدیدہ ہوگئی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو پونچھ کر بولی

''آپ میرے بڑے بھائی ہیں مجھے اس سودے بازی پر مجبور نہ کیجئے بلکہ خلوص دل سے صرف یہ بتایئے کہ کیا میرے لئے مناسب ہوگا۔ کیا مجھے ایسا کرنا چاہئے۔ جوان بیٹا اور جوان بیٹی۔ یہ دونوں میرے بارے میں کیا سوچیں گے۔ ان کی نگاہ میں میری کیا عزّت ہوگی۔ میں انھیں کیا منہ دکھاؤں گی۔ پھر اس عمر میں عقد کرنے پر دنیا مجھے کیا کہے گی۔ آپ ہی بتایئے''

''دیکھو صبیحہ۔ دنیا تمہیں کیا کہے گی اور تمہارے لئے کون سی بات بہتر ہے یہ تو تمہیں کرامت کے ساتھ آنے اور ہوٹل میں ٹھہرنے سے پہلے ہی سوچنا تھا۔ تم اس بات کا اقرار کر چکی ہو کہ کرامت تمہارے ساتھ عقد کے خیال سے تمہیں مدنی پور سے لایا تھا پھر اب مجھ سے کیا پوچھنا۔ میں تمہیں کیا مشورہ دوں بولو''

''کیا میرے لئے اس عمر میں عقد کرنا مناسب ہوگا؟'' زرّیں نے پوچھا

''صبیحہ۔ میں نے ہوٹل میں تو تمہاری یہ بات مان لی تھی کہ اس وقت سچ مچ نکاح کی بات کسی طرح ٹال دی جائے لیکن سچ پوچھتی ہو تو میں تمہیں دنیا اور دنیا والوں کی پرواہ کئے بغیر صحیح مشورہ یہ دوں گا کہ تم عقد کر لو۔ اس بات میں کوئی برائی نہیں کوئی بے شرمی نہیں۔ اسلام نے عقد ثانی کو منع نہیں کیا اسلام میں عورت اور مرد کا درجہ برابر ہے نکاح کرو اور نسل بڑھاؤ۔ یہ حکم اللہ کا ہے اور ہمارے رسول نے بھی کہا ہے کہ قانون شریعت کے مطابق نکاح کرنا میری سنّت ہے۔ خود پیغمبر اسلام کا عمل اور تاریخ اسلام اس کی گواہ ہے کہ تم سے زیادہ عمر کی عورتوں نے عقد کیا ہے۔ رسول مقبول نے بھی سن رسیدہ خواتین سے عقد فرمایا ہے۔ پھر تم کیوں ڈرتی ہو۔ تمہیں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہمّت سے کام لو۔ اپنا گھر بساؤ۔ ایک شریف اور نیک چلن خاتون کی طرح ایماندارانہ زندگی بسر کرو''

زرّیں کچھ دیر سوچتی رہی پھر بولی

''اگر میں آپ کا مشورہ مان لوں تو کیا یہ ضروری ہے کہ مجھے شیر علی صاحب کو ہی پسند کرنا چاہیے؟''

''نہیں نہیں۔ بالکل نہیں'' شاکر نے کہا ''تم کو پسند کرنے کا پورا حق ہے یہی تو نکاح کا بنیادی

اصول ہے کہ فریقین میں اگر کوئی ایک راضی نہ ہو تو نکاح ہو ہی نہیں سکتا ایجاب و اقرار ضروری ہے"
زریں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ "بھیّا" کہہ کر شاکر کے بازو پر سر رکھ کر رونے لگی۔

☆☆☆

ہوٹل مے فسلا ئیٹ میں کرامت علی اور قدیر کے بیچ گرما گرم مباحثہ ہو رہا تھا قدیر اس بات پر بضد تھا کہ اپنے کئے ہوئے وعدے کے مطابق سونے کے بسکٹوں میں سے آدھے بسکٹ کرامت اُسے دے اور کرامت کا کہنا تھا کہ اب وہ اسے کچھ نہ دے گا

"تم بے انتہا جاہل بدعقل اور بیوقوف ہو" کرامت نے اُسے ڈانٹا "پہلی حماقت تم نے یہ کی کہ پچاس ہزار روپے کا سونا ہوٹل کے کوڑے دان میں پھینک دیا قسمت کے سکندر تھے کہ کسی کی نظر نہیں پڑی دوسری غلطی یہ ہوئی کہ اُسی سیٹھ کے پاس سونا لے کر پہونچ گئے جہاں سے خریدا تھا۔ ایک تو خود بلاسبب حیران و پریشان ہوئے اور دوسرے کو بھی مفت میں ذلیل کیا۔ بس اب تم جاؤ۔ پھوٹ لو یہاں سے تمہارے حصے کا میرے پاس اب کچھ نہیں ہے ایک لاکھ کا سونا تمہارے پاس ہے چین سے کھاؤ"۔ اور جو بسکٹ میرے پاس ہیں وہ میری بھانجی اور اس کی بیٹی کے ہیں۔"

"جو رقم سرکار سے ملی اس میں تمہارا کیا احسان۔ تم بے ایمانی کر رہے ہو وہ سارے بسکٹ میرے ہیں"

"وہ کیسے بیٹے جان؟" کرامت نے پوچھا

"شہزادی کے ساتھ تم نے میرا نکاح پڑھا تھا کہ نہیں؟"

"ہاں پڑھا تھا" کرامت نے کہا "جب ہی تو سرکار سے تمہیں معاوضہ ملا۔ اب جو میرے پاس ہے وہ اس کی بیٹی روشن کا ہے اس کا حق نہ مارو اصل وارث تو وہی ہے"

"وہی ہے نا؟" قدیر نے کہا "تو تمہارا اس سے کیا واسطہ۔ تم کون ہوتے ہو اس کے؟"

"میں اس کا کون ہوں؟" کرامت بولا "بیٹے جان سنو گے تو یقین نہ آئے گا۔ وہ میری اکلوتی بہن کی نواسی ہے۔ شہزادی میری سگی بھانجی تھی۔ بس اب تم جا سکتے ہو میں بھی اسی وقت ہوٹل چھوڑ رہا ہوں۔ مجھے جائس جانا ہے"

☆☆☆

شیر علی چپ چاپ اپنے بستر پر لیٹے قدیر کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ بار بار دروازے کی

طرف دیکھتے جاتے تھے کہ کب قدیر زرّیں کا جواب لے کر آتا ہے۔ دراصل اُنھوں نے ایک مدبّرانہ چال چلی تھی کہ ثریا کے ساتھ قدیر کی شادی پر اپنی رضامندی دے کر وہ بیک وقت زرّیں اور قدیر دونوں کی ہمدردی حاصل کر لیں اور پھر اپنے اصل مقصد کے حصول کے لئے کوشش کریں۔ شاکر کی اس تجویز پر کہ معاملہ زرّیں کی رضامندی پر چھوڑ دیا جائے اور کرامت علی کا اسے جھٹ سے قبول کر لینا ان کے اس واہمہ کو تقویت دے رہا تھا کہ زرّیں کسی حالت میں ان کے حق میں فیصلہ نہ دے گی یہی وجہ تھی کہ انھوں نے قدیر کو اپنا داماد بنا لینے کی سیاست سے کام لیا۔ اس وقت وہ قدیر کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے تھے مگر قدیر کے بجائے دروازے پر شاکر علی کی آواز سنائی دی۔

"شیر علی۔ سو گئے کیا؟"

شیر علی کے جواب کا انتظار کئے بغیر شاکر اندر آ کر شیر علی کے بستر پر بیٹھ گئے۔

"مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں" شاکر نے کہا تو شیر علی صرف ان کی طرف مخاطب ہو گئے۔

"صبیحہ کے بارے میں تو تمہیں ساری باتیں معلوم ہو چکی ہیں مجھے تمہارے جذبات کا صحیح احساس ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اُسے دیکھنے کے بعد تمہارے دل میں نجمہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور تم اُسے پانے کے لئے مضطرب ہو جاتے ہو جو یقیناً فطری ہے۔ اس لئے میں اس بارے میں تمہیں کچھ سمجھانا چاہتا ہوں۔ کیا تم سننا چاہو گے؟"

"ضرور سنوں گا" شیر علی اٹھ کر بیٹھ گئے" مگر شرط یہ ہے کہ وہ بات صرف میرے حق میں ہوں بیچ میں اس جاہل فقیر کا نام نہ آنے پائے"

"چلو مان لیا" شاکر نے کہا "مگر برادر ذرا دیر کو تم بھی یہ درغائی دبنگی چھوڑ کر ایک عام انسان کی طرح بن جاؤ۔ کچھ نرمی دکھاؤ۔ کچھ معاملہ فہمی اور حکمت عملی سے کام لو۔

کسی عورت کا دل جیتنے کے لئے پہلے اُس کی خواہشوں کو پورا کیا جاتا ہے۔ اُسے خوش رکھنے کی باتیں کی جاتی ہیں مگر تم - پولیس کے لٹھ کسی سے کبھی عشق کیا ہو تو جانو"

"ہاں اور کیا" شیر علی بولے "مجنوں اور فرہاد کی روح تمہارے ہی اندر تو حلول کر گئی ہے۔ چلو معاملہ کی بات کرو"

"معاملہ کی بات یہ ہے کہ آج سے بلکہ اسی وقت سے اپنے چہرے پر اور اپنے معاملات میں، بات چیت میں حتی الامکان ملائمیت پیدا کرو - یہ تھوبڑا اور ویلن والی سختی اور اکڑا یکدم ختم ہو" شاکر نے سمجھایا

"اچھا پھر؟"

"پھر یہ کہ ثریا بیٹی کی شادی قدیر کے ساتھ کر دو۔ بس یہی تمہارا ٹرمپ کارڈ ہے"

"یہ میرا ٹرمپ کارڈ ہے یا تمہارا چوہے دان جس میں تم مجھے پھنسا رہے ہو" شیر علی بولے

’’شیر علی کہہ دیا کہ تم اپنی دروغائیت کو بیچ میں مت آنے دو۔ دیکھو سمجھ داری سے کام لو۔ تھوڑا رِسک لو۔ کچھ جوکھم اُٹھاؤ بہت سے معاملات ذرا سی حکمت عملی سے سدھر جاتے ہیں‘‘

شیر علی کوئی جواب دینے کے بجائے یک ٹک اُن کی صورت دیکھتے رہے۔ شاکر آگے بولتے گئے ’’اس لئے بھائی شیر علی فٹافٹ شادی کرادو دونوں بچّوں کی۔ اسی میں تمہاری بھلائی ہے‘‘

’’بھلائی ہے؟‘‘

’’ہاں ہاں- بالکل بھلائی-‘‘ شاکر نے کہا ’’میں تمہارا بہی خواہ ہوں بس مان جاؤ میری بات‘‘

’’شادی کرادوں؟‘‘

’’ہاں‘‘

’’اور میں- ایسے ہی الّو کی طرح بیٹھا رہوں؟‘‘

’’نہیں‘‘ شاکر بولے ’’اُس کے بعد تم صبیحہ کا دل جیتنے کی کوشش کرو‘‘

’’دل جیتوں؟‘‘ شیر علی بولے ’’اور بچّوں کی شادی کے بعد وہ مُکر گئی تو؟ کرامت بیچ میں لنگی مارنے کو بیٹھا ہے۔ اگر اس نے لنگی ماردی تو؟ نہیں بھائی نہیں میں یہ رِسک جان بوجھ کر نہیں لوں گا۔ یا تو تم وعدہ کرو کہ کرامت نے کوئی حرکت کی تو اس کے ہاتھ پیر تڑوا دوگے یا پھر مجھے اجازت دو میں سالے کو ابھی گرفتار کر کے حوالات میں ڈال دوں۔ کم از کم آٹھ سال کے لئے حرامزادے کو جیل خانہ تو بھجوا ہی دوں گا‘‘

’’پھر وہی دروغا پن شروع کر دیا‘‘ شاکر نے کہا ’’یار تم سمجھتے کیوں نہیں۔ ارے پولیس کی اکڑ تو اب تک بہت دکھا چکے اب ذرا انسانیت سے کام لو اور ایسا کام کرو کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ بس یہی دانش مندی ہے وراسی کا نام ہے ڈپلومیسی یعنی حکمتِ عملی‘‘

’’شاکر تمہاری ڈپلومیسی میں خطرہ پھر بھی باقی رہتا ہے‘‘ شیر علی نے کہا ’’میں مثلث کے تینوں زاویوں کو اپنی گرفت میں لینے کی ڈپلومیسی پر غور کر رہا ہوں‘‘

’’وہ کیسے- میں سمجھا نہیں‘‘ شاکر نے کہا

’’وہ ایسے کہ اگر کسی کے دل ہی جیتنے پر معاملہ اٹکتا ہے تو میں زرّیں، قدیر اور کرامت تینوں کے دل کیوں نہ جیت لوں۔ ایک بار وہ کندۂ ناتراش میری مٹھی میں آ گیا تو سمجھ لو نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری‘‘

’’یار کوڑی تو بہت دور کی لائے ہو‘‘ شاکر بولے ’’مگر یہ کام تم کروگے کیسے؟‘‘

’’سوچوں گا- سوچوں گا‘‘ شیر علی مسکرا کر بولے ’’تم دیکھنا شاکر میں اس کاٹھ کے الّو شیخ جی کو چٹکی بجاتے کس طرح رام کرتا ہوں‘‘

’’یہ ہوئی بات‘‘ شاکر نے کہا ’’شیر علی تمہاری ڈپلومیسی تو بڑی پاور فل لگتی ہے‘‘

’’دیکھتے جاؤ بس‘‘

اتنے میں قدیر آ گیا اُس نے آتے ہی شیر علی کو خبر دی کہ خالو کرامت علی ہوٹل چھوڑ کر جائس چلے گئے

’’کوئی بات نہیں‘‘ شیر علی نے کہا ’’وہ بغیر بتائے چلے گئے تو مجبوری ہے مگر تم کل دن میں نکاح کے لئے تیار رہنا-‘‘

’’جی؟- یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں‘‘ قدیر نے کہا

’’ارے بھائی تمہارا عقد- میری بھانجی ثریّا کے ساتھ- اب سمجھے؟‘‘ شاکر نے ہنس کر کہا

’’تم نے اپنی والدہ کو بھی بتایا کہ نہیں؟‘‘ شیر علی نے پوچھا

’’ابھی باتیں نہیں ہوئیں- بتا دوں گا اُنھیں بھی‘‘ قدیر نے کہا

’’بھائی کرامت علی بھی اگر اس موقع پر موجود ہوتے تو کتنا اچھا ہوتا‘‘ شیر علی نے کہا

’’گڈ- واہ شیر علی- مان گئے بھائی تمہاری حکمتِ عملی کو‘‘ شاکر نے کہا

’’دیکھتے جاؤ آگے آگے‘‘ شیر علی ہنس کر بولے

★ ★ ★

ذی الحجہ کا مہینہ تھا، جائس میں حضرت مخدوم سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ کی درگاہ پر بہت بڑا میلہ لگا تھا۔ کھانے پینے، مٹھائیوں، پھلوں کی دور تک دورویہ دوکانیں انواع و اقسام کی تفریحات کے سامان کھلونے، چُوروک، جھولے، سرکس، کارنیوال، پیسہ کمانے والے ٹھگوں کے خیمے، چھوٹے چھوٹے رنگین غبّاروں پر بندوق سے نشانہ لگانے کے اسٹال، ہنسی کے بھنڈارے، جادوگروں کی منڈلیاں، سانپ بچھو دکھانے والے مداری، بندر اور بھالو کے ناچ، جوان بوڑھے بچّے عورتوں مردوں کا جم غفیر اور درگاہ کے اندر دور دراز سے آنے ولی جوان ہٹّی کٹّی ہسٹیریا کی مریض عورتوں کے گھر والے اور رشتہ داران کے سروں سے بھوت پریت اور بدروحوں کو اتروانے کے لئے درگاہ کے وسیع صحن میں جگہ جگہ منڈلیاں بنائے مقامی ڈفالیوں کے گھیرے میں بیٹھے تھے۔ یہ ڈفالی اپنے دَف کے سمع خراش ڈھپ ڈھپ اور اپنے بے معنی اور بے تکے گانوں سے درگاہ کو سر پر اُٹھائے تھے۔ ان کے درمیان آسیب زدہ تندرست و جوان عورتیں سروں کے بال بکھرائے جھوم جھوم کر ’’کھیل‘‘ رہی تھیں اور ہر عمر کے تماشبین اس مزیدار کھیل کو دیکھنے کے لئے ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ مخدوم صاحب کی درگاہ کے اندر بھوت پریت بھگانے کا پروگرام ہر سال ہوتا تھا اور سیکڑوں مریض شفایاب ہو کر بھلے چنگے اپنے اپنے گھروں کو واپس

جاتے تھے۔ کہتے ہیں حضرت مخدوم سیّد اشرفؒ نے اس مقام پر چلّہ کشی فرمائی تھی جس کی برکت سے خدا نے اُن کے اندر ایسی روحانی طاقت عطا کی تھی کہ آسیب زدہ مریض اس درگاہ سے اچھے ہو جاتے تھے۔ مگر آج درگاہ میں بے پناہ بھیڑ اس لئے زیادہ تھی کہ ملک یمن سے ایک عربی خاندان اسی مقصد سے یہاں آیا ہوا تھا۔ ریاض بھائی کی کبوتر بازی پشتینی شوق ہونے کی وجہ سے پورے قصبہ میں مشہور تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ اس شوق کو اس لئے اپنے کلیجے سے لگائے ہوئے ہیں کہ یہ انھیں وراثت میں ملا ہے۔ اس دن وہ دو کبوتر ایک ہاتھ میں اور دو کبوتر دوسرے ہاتھ میں دبائے سفید چُنی ہوئی آستینوں والا تن زیب کا لکھنوی کرتا اور رنگین تہمد پہنے نوگزی قبر کے پاس سے گذرے تو ایک خوبصورت بدیشی کار کے پاس بھیڑ بھاڑ دیکھ کر از راہ تجسّس اس طرف لپکے۔ موٹر کار کے پاس وقار کے دوست ظفر، یوسف اور متین پہلے سے موجود تھے کار کی پچھلی سیٹ پر ایک عربی اس کی بیوی اور اس کی بیٹی بیٹھے تھے اور ڈرائیور کے پاس اگلی سیٹ پر سوٹ بوٹ اور ٹائی سے مزیّن مقطّع مگر انتہائی خوش نما داڑھی والا ایک جوان تھا جس نے کار سے اُتر کر نہایت سلیس اردو میں لوگوں کو بتایا کہ یہ عربی خاندان ملک یمن سے آیا ہے۔ اس کی بیٹی پر آسیب کا اثر ہے اس لئے وہ مخدوم صاحب کی درگاہ پر دفع آسیب کے لئے جانا چاہتا ہے۔ کچھ لوگ کہہ رہے تھے

”آپ ہمارے ساتھ تشریف لے چلئے۔ آپ لوگ چیرمین صاحب کے مہمان ہوں گے“

ایک دوسرے صاحب بولے ”ارے اتنی دور جانے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ سامنے حاجی صاحب کا دولت خانہ ہے آپ سب لوگ وہاں ٹھہر سکتے ہیں“

ریاض بھائی اپنے کبوتروں سمیت بھیڑ کو ہٹا کر آگے بڑھے

”آپ کہیں مت جایئے۔ آپ میرے مہمان ہیں غریب خانہ پر تشریف لے چلئے۔ شیخ عبد الرحیم عرف بُھندا میاں کی کوٹھی یہاں سے بہت دور نہیں ہے“

سوٹ بوٹ والا ہندوستانی نوجوان ریاض بھائی کو دیکھ کر قدرے مسکرایا پھر بولا

”ریاض صاحب۔ یہ عربی شیخ کبوتروں سے الرجک ہے اس لئے آپ سامنے سے چلے جایئے“

بھیڑ میں پیچھے ہٹنے کے ساتھ ساتھ ریاض بھائی یہ سوچنے لگے کہ اس اجنبی کو ان کا نام کیسے معلوم ہو گیا۔ کہیں سن لیا ہے یا انھیں پہلے سے جانتا ہے۔ کوئی یقینی فیصلہ تو نہیں کر سکے مگر اس نتیجے پر ضرور پہنچے کہ شناسائی کا ثبوت پا لینے کے بعد پھر ذرا سی بات کے لئے پیچھے ہٹ جانا بُری بات ہے اس لئے اپنے چاروں کبوتر اُنھوں نے عیدو گدّی کے لونڈے خیراتی کو تھمایا اور پھر بھیڑ میں گھس پڑے۔ وہ جوان یوسف اور ظفر سے کہہ رہا تھا ”کوئی سیّد ہادی صاحب ہیں۔ ہمیں ٹھہرنے کے لئے اُنھیں کے گھر کا پتہ دیا گیا ہے۔“ یہ سنتے ہی ریاض بھائی چہک کر آگے بڑھے ”ہاں ہاں ہادی۔ اپنا لنگوٹیا دوست ہے۔ آیئے چلئے“ پھر ظفر اور یوسف سے مخاطب ہو کر بولے ”سنو۔ تم لوگ بنگلہ والے گھوگھرے سے لپک کر آگے جاؤ

اور ہادی کو اطلاع کر دو۔ میں ان لوگوں کے ساتھ موٹر میں بیٹھ کر جامع مسجد کے پاس پہونچتا ہوں“ پھر اس ہندوستانی نوجوان سے بولے ”برادرم آپ میرا نام تو جانتے ہی ہیں۔ اپنا نام بھی بتا دیجئے“

”میرا نام عبدالرحمٰن مَسندی ہے“ وہ مسکرا کر بولا

”تو آیئے مسندی صاحب موٹر کار میں بیٹھ کر بائی روڈ چلتے ہیں ہادی کے مکان پر“ ریاض بھائی جھٹ موٹر میں اگلی سیٹ پر بیٹھ کر اسٹیرنگ گھمانے لگے

”دیکھئے ریاض بھائی۔ ہم لوگ پہلے درگاہ شریف جائیں گے جس کام کے لئے یہ لوگ آئے ہیں پہلے وہ کرنا ہے پھر ہادی صاحب کے گھر چلیں گے۔ آپ نے اطلاع تو کرا ہی دی ہے“

درگاہ پہونچنے پر ایک بڑے استاد ڈفالی نے یہ انکشاف کیا کہ آسیب والے مریض کو نواح درگاہ شریف میں ہی خیمہ یا کریا ڈال کر رہنا ہوگا اور کسی جگہ نہیں ٹھہر سکتے اس لئے عبدالرحمٰن مسندی نے فوراً ایک ہزار روپے نکال کر اُسے دیئے۔ ریاض بھائی کی نگرانی میں جلد ہی درگاہ کے عقب میں تالاب کے کنارے ایک پرسکون جگہ پر ان کا خیمہ لگ گیا نواڑ کی پلنگیں، میز کرسیاں، لوٹے برتن اور دوسری آسائش کی چیزیں اسی میں پہونچ گئیں۔

ریاض بھائی عبدالرحمٰن مسندی کو لے کر ہادی میاں کے گھر آئے ظفر اور یوسف اُنھیں ایک عربی خاندان کی مہمانداری کا مژدہ پہلے ہی سنا چکے تھے جس کی ناپسندیدگی کے بے محابہ اظہار پر وہ ریاض بھائی کے ساتھ ساتھ ان دونوں کو بھی صلواتیں سنا چکے تھے ”نادانو۔ بدعقلو۔ کم بختو میں پوچھتا ہوں تمہارے منھ میں زبان نہیں تھی کہ ریاض کو منع کرتے یہ مفت کرم داشتن والی مہمان نوازی ہادی کو پسند نہیں ہے“

”اب تو جو ہونا تھا وہ ہو گیا بڑے ابّا“ ظفر نے کہا ”مہمانوں کے منھ پر کچھ نہ کہئے گا“

”مہمانوں۔ مہمانوں۔ آخر کون ہیں یہ لوگ اور مجھے کیسے جانتے ہیں۔ میرے خیال میں تو یہ ریاضوا کی شرارت ہے مجھے زیر بار کرنے کے لئے یہ چال چلی ہے“

”چھوڑیئے اب ان باتوں کو“ یوسف نے سمجھایا ”اب تو جھٹا جھٹ ان لوگوں کے کھانے پینے کا انتظام کرایئے میرے خیال سے تو ایک چھوٹا موٹا بکرا ذبح کرا دیجئے میں باورچی بلا لاتا ہوں“

”بس بس۔ آور چی باورچی کی کیا ضرورت ہے آدھا سیر گوشت گھر ہی میں پک جائے گا“

”آپ کس خواب و خیال میں ہیں بڑے ابّا“ ظفر بولا ”ایک پاؤ بوٹیاں تو عربی کے ایک لقمہ میں جاتی ہیں۔ دو کلو گوشت فی نفر رکھئے تو آٹھ کلو ہو گئے“

”تو کیا اونٹ کٹوا دوں؟“ ہادی تپ گئے ”کم بختو تم سب لائق گردن زدنی ہو“

”مگر ہمارا گوشت حرام ہوگا چچا جان“ یوسف نے کہا ”البتہ آپ کی اونٹ والی تجویز بہت مناسب رہے گی وہ لوگ خود سیر ہو کر مزے میں اونٹ کھائیں گے اور ہم نے سنا ہے چچا جان کہ اونٹ کا

گوشت کھانا سنّت ہے تھوڑا آپ بھی چکھئے گا''

''اب تم دونوں میری نظروں سے دور ہو جاؤ - جاؤ وقار کو ڈھونڈھ کر لاؤ'' ہادی بولے

''چچا جان - وہ تو اپنی میڈم کے نیفے میں گھسا ہوگا چھوڑیئے اس کو'' یوسف نے کہا

جب ریاض بھائی عبدالرحمٰن مسندی کو لے کر آئے تو ہادی ایک صاف تہد اور صاف کرتا پہنے تخت پر تکیہ لگائے لیٹے تھے اُنھیں دیکھتے ہی عبدالرحمٰن نے بڑھ کر مصافحہ کیا

''السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہٗ''

ہادی نے ایک گورے چٹّے نوجوان اور اس کی خوش نما سیاہ مقطّع داڑھی کو دیکھ کر اس پر سو فیصدی عربی ہونے کا گمان کیا بڑی خوش اخلاقی سے مودبانہ مصافحہ کر کے ریاض سے بولے

''ابے او چڑیمار - اتنے بڑے قصبے میں تجھے میرا ہی گھر ان بدوؤں کی مہمانی کے لئے ملا تھا''

''ہادی بھائی - یہ عبدالرحمٰن صاحب ہیں۔ بھوپال کے رہنے والے ہیں'' ریاض نے بتایا

''بھوپال؟'' پھر فوراً ہی اپنی غلطی محسوس کر کے ہادی نے دانتوں تلے زبان دبالی

''جی ہاں چچا جان'' عبدالرحمٰن نے کہا ''آپ کی بہت تعریف میں نے سنی ہے''

''کہاں سنی ہے؟'' ہادی نے پوچھا ''بھوپال میں؟''

''بھوپال میرا وطن ضرور ہے لیکن میں ایک عرصہ سے یمن میں رہتا ہوں اور قریب قریب وہی میرا وطن ہوگیا ہے۔ مجھے آپ کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ بڑے تعلیم یافتہ مہذّب خوش اخلاق منکسر مزاج اور مہمان نواز ہیں اور قصبہ میں لوگ آپ کی بڑی عزّت کرتے ہیں''

ہادی اخلاقاً مسکرائے ''ہاں بھائی وہ تو ہے'' پھر اپنی مہمان نوازی کی سند پکّی کرنے کی خاطر بڑے انکسار کے ساتھ بولے ''میاں یہ آپ ہی کا گھر ہے شوق سے رہئے مجھے خوشی ہوگی''

''شکریہ شکریہ'' کہتے ہوئے عبدالرحمٰن نے اُٹھ کر پھر ایک بار ان سے مصافحہ کیا

شام کو مغرب کے وقت سکینہ گھر میں مہمانوں کے لئے کھانا تیار کر رہی تھی کہ نادرہ نائین خوشی خوشی آ کر اس کے پاس بیٹھ گئی

''ندو بوا - لو بیٹھی بیٹھی ذرا پلاؤ کے لئے چاول تو چُن ڈالو''

''ہاں ہاں لاؤ'' نادرہ چہک کر بولی ''ارے بٹیا گھر میں مہمان آ گئے ہیں تو کام کاج کے لئے بھوجائی کو بلا لیا ہوتا اور نہیں تو میں کیا کہیں چلی گئی تھی''

''ارے کون بہت کام میں کام ہے - ابھی سب پک جائے گا منٹوں میں''

چاول چُنتے چُنتے نادرہ سکینہ کو دیکھ دیکھ کر ہنسے جاتی تھی آخر نہ رہا گیا تو بولی

''بھائی تمہارے مہمان تو ہمیں بہت اچھے لگے جانتی ہو کیا ہوا ہمیں دیکھ کر انگلی کے اشارے

سے پاس بلایا پہلے ہم سے نام پوچھا پھر پچاس روپیہ کا نوٹ نکال کر ہمیں دے دیا۔ ہی ہی ہی''

''ارے واہ'' سکینہ بولی ''بس ایسے ہی دے دیا؟ کچھ کام نہ دھام''

''ہاں بس دے دیا'' نادرہ نے کہا ''ارے لینے دینے کو ہزار موقع بہانے ہوتے ہیں بٹیا۔ گھر کے پرجا اور نوکر چاکر کو بڑے لوگ خوش رکھنے کے لئے انعام اکرام دیتے ہی ہیں''

''ارے تو کون سا کام کر دیا تم نے - کون سی خدمت انجام دی مجھے بھی تو بتاؤ''

''ہی ہی ہی'' کر کے نادرہ ایک بار پھر ہنسی

''اے لو خوب یاد دلایا - میں تو بھول ہی گئی تھی'' پھر اپنے آنچل میں بندھا کاغذ نکال کر بولی

''یہ خط تمہارے مہمان نے تمہارے لئے دیا ہے''

خط ہاتھ میں لینے سے پہلے سکینہ نے کہا ''اچھا - تو یہ خدمت انجام دی ہے تم نے - کیوں؟

سکینہ کو خط لینے میں تامل ہوا آج تک اُسے کسی اجنبی نے خط نہیں لکھا تھا وہ بدنامی کے خیال سے ڈرتے ڈرتے بولی ''یہ خط تم اُنھیں کو واپس کر دینا - بلکہ نہیں لاؤ میں اسے چولھے میں ڈال دوں تمہارا کوئی بھروسہ نہیں اسے لئے لئے دنیا بھی میں ناچتی پھرو گی''

''ارے نہیں بٹیا - میں کیا کسی سے کہنے جاتی ہوں، لے کر پڑھ لو پھر آگ میں ڈال دینا''

سکینہ نے اِدھر اُدھر دیکھ کر ڈرتے ڈرتے اس کے ہاتھ سے خط لیا اور ایک کونے میں جا کر پڑھنے لگی۔ خط پڑھنے کے بعد دل کی تیز دھڑکن کو چھپاتے ہوئے نادرہ سے بولی

''خبردار ندّو بوا - تمہیں امام حسین کی قسم ہے کسی کو اس خط کے بارے میں....''

''ارے توبہ کرو بٹیا - میں ایسی پیٹ ہلکی نہیں ہوں قسم ہے جو کسی کو بتاؤں'' نادرہ بولی

اس کے بعد سکینہ نے اُسے کچھ کپڑے اور روپے دیئے تو وہ خوش خوش وہاں سے چلی گئی

رات میں مخدوم صاحب کی درگاہ پر عربی لڑکی کے سر سے بھوت اتارا جانے لگا۔ پچیس چھبیس سال کی خوبصورت اور تندرست لڑکی درگاہ کے صحن میں زمین پر آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔ چار پانچ ڈفالی اُسے اپنے گھیرے میں لئے دف بجا بجا کر نہ سمجھ میں آنے والے گیت گا رہے تھے۔ چاروں طرف تماشبینوں کی بھیڑ اکٹھا ہوگئی تھی۔ ڈفالی گا رہے تھے

مخدوم شاہ داتا - تمہرے قدم کے آسا

کوئی چڑھاوے سنّی ملیدا - کوئی چڑھاوے بتاسا - تمہرے قدم کے آسا

اپوا تو لیٹے شہر پھوچھے - جائس میں پنجہ لگائیو شاہ داتا

شہر کے بیچ مار وضہ بنائے - روضہ بنائے بہت بھاری ولی داتا - تمہرے قدم کے آسا

درگاہ کے صحن میں جگہ جگہ ایسی بہت سی ٹولیاں بیٹھی تھیں جن کے شور وغل اور ڈفلیوں کی سمع

خراش آواز سے ایک ہنگامہ برپا تھا عربی لڑکی کے پاس والی ٹکڑی میں ایک بوڑھا ڈفالی دف بجاتے بجاتے کھڑا ہو گیا

عظمت کے بلہاری ولی حضرت کھول دیو صندل کنواڑی

باون سیڑھی پورب دروازہ بیچ ماروضہ بنائے بہت بھاری۔ کھول دو صندل کنواڑی

تھوڑی دیر تک چپ چاپ بیٹھی رہنے کے بعد عربی لڑکی کے بدن سے تشنج کے آثار ظاہر ہونے لگے پھر اس نے دھیرے دھیرے جھومنا شروع کیا۔ دف بجانے والوں میں اور بھی سرگرمی آ گئی یہاں تک کہ وہ سب ایک ساتھ اچھل اچھل کر زوروں کے ساتھ ڈفلیاں پیٹنے لگے۔ لڑکی سر کے کھلے بالوں کے ساتھ تیزی سے جھومنے لگی اوپر نیچے اِدھر اُدھر سنہرے لمبے بال کی لٹوں کو لہراتی ہوئی وہ دیوانوں کی طرح جھومنے لگی۔ یمن کا عربی شیخ اور اس کی بیوی اس پروگرام میں خود نہ آ کر عبدالرحمٰن مندی کو بھیج دیا تھا جو ریاض بھائی، ظفر، یوسف اور متین کے ساتھ وہاں پر موجود تھے۔ لڑکی کے جھومنے کا جوش وخروش دیکھ کر عبدالرحمٰن نے اس کی صحت کا یقین کر کے ریاض بھائی سے کہا

''ریاض صاحب آپ یہیں رہیئے گا۔ میں ذرا شیخ کو اطلاع کر آؤں''

مگر شیخ کو اس کے خیمہ میں اطلاع دینے کے بجائے مندی چپ چاپ میلے سے نکل کر اپنے میزبان کے گھر پہونچ گئے۔ ہادی مکان کے باہری کمرے میں بہت ہلکی روشنی میں غافل سو رہے تھے مندی نے دروازے کو ہلکا سا دھکّا دیا تو وہ کھل گیا مکان کے باہر چاروں طرف اندھیرا تھا اس لئے وہ بے جھجک اندر داخل ہو گیا۔ صحن سے ملی دالان میں بھی اندھیرا تھا جہاں سکینہ چپ چاپ کھڑی کسی کے آنے کی منتظر تھی اس اندھیرے میں بھی اس کے خوبصورت عارض قندیل کی طرح دمک رہے تھے۔

مندی آہستہ آہستہ اس کے قریب پہونچا اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بڑی نرمی سے بولا ''سکینہ!''

کچھ بولنے کے بجائے سکینہ مندی کے سینے سے سر ٹکا کر زار وقطار رونے لگی پھر جلد ہی آنسو پونچھ کر صرف اتنا کہا ''بے مروّت- کتنے دنوں بعد میری یاد آئی ہے''

''میں تمہارا قصوروار ہوں مجھے معاف کر دو سکینہ''

دونوں ایک دوسرے سے لپٹ کر رونے لگے

حضرت مخدوم سیّد اشرف کی درگاہ سے اپنی اکلوتی بیٹی کی شفایابی کے بعد یمنی شیخ نے اسی شب وہاں سے لکھنؤ کے لئے روانگی کا پروگرام بنا لیا تھا۔ اس وقت اس قافلے کو الوداع کہنے کے لئے ریاض بھائی، ظفر، یوسف اور متین سب موجود تھے مگر کوئی بھی اس بات سے واقف نہیں تھا کہ مندی کے ساتھ موٹر کار کی اگلی سیٹ پر جو برقع پوش خاتون بیٹھی ہیں وہ کون ہیں یہاں تک کہ موٹر کی ڈِکّی میں دو عدد سوٹ کیس اور کچھ دوسرے ضروری سامان رکھوانے کے بعد جب موٹر کار اسٹارٹ ہوئی تو وقار کی آنکھوں

سے بے تحاشہ موٹے موٹے آنسو بہنے لگے وہ گلوگیر آواز میں بولا ''اپّی- ابّا کو کیا بتاؤں گا؟'' مگر اس کی اپّی- ایک شریف و پاکیزہ سیدانی نقاب کے اندر چپکے چپکے رو رہی تھی۔ موٹر رینگی تو اس نے موٹر سے ہاتھ نکال کر بھائی کے آنسو پونچھے- اس کی سسکیوں کی آواز سے وہاں پر موجود سبھوں نے یہ جان لیا کہ سکینہ آپا رونی بلکتی آج اپنے رفیقِ حیات کے ساتھ میکے سے جا رہی ہیں۔

جس رات سکینہ اپنے شوہر کے ساتھ گھر سے رخصت ہوئی تھی اسی صبح کو ہادی اپنے گھر کے دروازے پر بیساکھی کے سہارے اچک اچک کر شور وغل مچا رہے تھے۔ چاروں طرف غلیظ گالیوں کی بوچھار کر رہے تھے کیوں کہ سکینہ گھر میں نہیں تھی اور نہ کوئی یہ بتانے والا تھا کہ وہ کہاں گئی۔ وقار اپنی سسرال میں تھا اور ہادی گھر کا کونہ کونہ کھنگال رہے تھے ساتھ ہی بلند آواز میں جو منھ میں آتا تھا وہ بکتے جاتے تھے مطلب یہ تھا کہ ان کی آواز میر فدا حسین کے گھر تک پہونچ جائے اور وقّن وہاں سے نکل کر ان کی مدد کو آئے۔ وہ اپنے مکان کے چبوترے پر غیظ وغضب میں کھڑے تھے کہ بوڑھی پھُندنیا نائین اس وقت کمر سے جھکی ڈنڈا ٹیکتی میر فدا حسین کے گھر سے نکل کر اُن کی طرف آئی اور اُنھیں چلاّتا دیکھ کر کھڑی ہو گئی۔ ذرا کمر سیدھی کر کے ہادی کی طرف دیکھا پوپلے منھ اور سر میں رعشہ کے باعث لگتا تھا وہ کھڑی ہادی کو منھ چڑھا رہی ہے۔ اُس نے سنجیدگی سے پوچھا

''کا ہوا میاں- کاہے کو ہلاّ کرت ہو- گھر ما چور آوا رہا کا؟''

''تیری میّت آئی تھی کم بخت'' وہ غصّہ میں اُبل پڑے ''جنازہ آیا تھا تیرا''

پھندنیا کھڑی کھڑی دو تین بار کمر سے مٹکی پھر ہادی کی نقل میں لنگڑاتی ہوئی بھاگ گئی

ہادی بھی غرّائے ''حرامزادی- ڈائین کہیں کی''

اس طوفان کو ٹھنڈا کرنے کے لئے وقار میر صاحب کے گھر سے نکل کر ڈرتا ڈرتا اُن کے پاس آیا اس کی صورت دیکھتے ہی ہادی نے اپنے شور وغل کو بریک لگایا۔ وقار بولا

''ابّا گھر کے اندر چلئے''

ہادی اس کے کہنے پر اندر گئے اور بیساکھی دیوار سے ٹکا کر چپ چاپ بیٹھ گئے

''اپّی چلی گئی ابّا'' وقار نے بہت سمجھا کر کہا ''محسن بھائی اُنھیں لینے آئے تھے''

ہادی اس اطلاع پر فوری کوئی ردِّ عمل دکھا کر چراغ پا نہیں ہوئے کیونکہ وقّن کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی اور لہجہ میں کرب تھا خود ہادی نے بھی اس دردناک اطلاع پر چپّی سادھ لی

وقار نے پھر بتایا ''اپّی بہت رنجیدہ تھیں روتی ہوئی محسن بھائی کے ساتھ گئیں۔ مجھ کو سمجھایا ہے کہ ابّا کا بہت خیال رکھنا کوئی تکلیف نہ ہونے پائے''

ہادی نے گاؤ تکیہ پر سر دے مارا ''ہائے مجھے کسی نے بھی نہیں بتایا'' وہ دیر تک سسکیاں لیتے رہے

وقار نے باپ کا بازو پکڑ کر سمجھایا ''ابّا نہ روئیے اپّی کو تو جانا ہی تھا اپنا گھر بسانا تھا''

''ہاں یہ اچھا ہی ہوا- میں نے اُسے بہت تکلیف پہونچائی تھی وقّن- میں بہت بُرا ہوں بہت بُرا ہوں''

ہادی اُٹھے اپنے آنسو پونچھے اور بیساکھی لے کر باہر چلے گئے۔

★★★

ہادی کے وحشیانہ حملے سے گھائل ہونے کے بعد میر فدا حسین ہرنیا کے ایمرجنسی آپریشن سے بظاہر بچ تو گئے تھے اور مقامی اسپتال کے ڈاکٹر زیدی کے مطابق ان کا آپریشن کامیاب بھی تھا مگر اس آپریشن کے بعد وہ سنبھل بھی نہ پائے تھے کہ یک بیک اُنھیں ٹیٹنس ہوگیا۔ جبڑے جکڑ گئے اور دورے پڑنے لگے۔ وقار نے ہادی کو بتایا

''ابّا فدّن پھوپھا بہت بیمار ہیں- اُن کے بچنے کی اُمید نہیں ہے''

اس اطلاع پر ہادی متفکّر ہوگئے۔ اُنھوں نے غصّہ میں آکر میر فدا حسین کو بیساکھی سے مار تو دیا تھا مگر وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ ایسی چوٹ لگے گی کہ ان کی جان پر آبنے گی اب اُنھیں اپنے کئے پر سخت پشیمانی ہو رہی تھی۔

''کیا بہت زیادہ چوٹ لگی تھی؟'' اُن کے منھ سے بیساختہ نکل پڑا

''نہیں ابّا وہ ہرنیا کے مریض تھے اچانک آنتیں اتریں اور اُلجھ گئیں۔ ڈاکٹر زیدی نے آپریشن کیا تو دو دن بعد ٹٹنس ہوگیا اب حالت خراب ہے''

یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ فدا حسین اُن کی حرکت مذبوحی کی وجہ سے بیمار نہیں ہوئے بلکہ اپنے ہی مرض سے جاں بہ لب ہیں اُنھوں نے اطمینان کی سانس لی۔ وقّن نے سمجھایا

''ابّا آپ ان کی عیادت کو ابھی تک نہیں گئے۔ آپ کو چلنے میں زحمت تو ضرور ہوگی چل کے دیکھ آیئے ایسے موقع پر تو لوگ غیروں کی عیادت کو بھی چلے جاتے ہیں پھر وہ تو اپنے ہی ہیں''

''یار میں تو اپنی ہی مصیبت میں گرفتار ہوں۔ خیر دیکھا جائے گا'' ہادی بولے

''اسپتال تک تو کسی سواری سے بھی جایا جا سکتا ہے۔ یہ کون سی بڑی مصیبت ہے'' وقار نے کہا

''مصیبت یہ ہے کہ میری بیٹی چلی گئی میری روٹیاں کون پکائے گا- میں کھاؤں گا کیا- ارے تو تو سسرال میں نوالے توڑے گا پر میرا کیا ہوگا؟''

''آپ کی بہو موجود ہے'' وقار بولا

''ہاں ہاں- بہو موجود ہے'' ہادی چمک کر بولے ''اتنے دن ہوگئے میں نے بہو سے کہا تھا

کہ اپنی ماں کو یہاں بلا لے۔ ارے بھائی ضرورتاً کہا تھا لوگ مصیبت میں ایک دوسرے کے کام آتے ہیں۔ اس نے اس کان سے سُنا اُس کان سے اڑا دیا۔ کیا کیا اُس نے؟''

''ابّا یہ موقع شکوہ شکایت کا نہیں ہے۔ دو دن سے فدّن پھوپھا کی بیماری سے سب لوگ پریشان ہیں وہ بھول گئی ہوگی- مگر بھولی بھی نہ کہنا چاہئے پریشانیوں میں اس کا موقع کہاں تھا''

''لگے طرفداری کرنے- اے لعنت خدا کی'' ہادی بولے

''طرفداری نہیں کر رہا ابّا'' وقار نے کہا ''اچھا کل ہی کسی کو بھیج کر اُنھیں بلوا لوں گا۔ بس؟''

سہ پہر کے وقت ہادی بیساکھیاں ٹیکتے ہوئے اسپتال پہونچے۔ ڈاکٹر نے مریض کے پاس بھیڑ بھاڑ اکٹھا ہونے کی روک لگا دی تھی۔ مریض کے کمرے میں بالکل اندھیرا تھا نیند لانے کے انجکشن برابر لگ رہے تھے پھر بھی تھوڑی تھوڑی دیر بعد ان پر پیٹھ سے اکڑنے کے تیز دورے پڑ رہے تھے۔ زہرا بی وارڈ کے باہر برامدہ کے ایک کونے میں زمین پر خاموش بیٹھی چپکے چپکے آنسو بہا رہی تھیں۔ لاڈلی اور پاس پڑوس کی بہت سی عورتیں اور قریبی رشتہ دار اظہار ہمدردی میں وہاں اکٹھا ہوگئی تھیں۔ ہادی کو دیکھ کر زہرا بی رونے لگیں ''ہم لوگ دعا کر رہے ہیں بجّو'' ہادی تسلّیاں دینے لگے ''فدّن بھائی بیمار کربلا کے صدقے میں ضرور اچھے ہو جائیں گے تم آنسو مت بہاؤ اتنے آدمیوں کی دعائیں اللہ ضرور سنے گا''

''اللہ میں کیا کروں ہادی- میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا'' زہرا بی پھر رونے لگیں

زہرا بی کے بھتیجے ماجد عرف مِکّی مریض کی تیمارداری میں اندر باہر بلا سبب کی تگ و دو سے اپنے انہماک اور تعلقِ خاطر کا زبردست مظاہرہ کر رہے تھے اور بار ہا اپنی جیب سے رومال نکال کر پسینہ خشک کرتے جاتے تھے ان کی اس بے چینی میں خلوص سے زیادہ اس بات کی فکر تھی کہ میر صاحب کی آنکھ بند ہونے پر اُن کی زمین جائیداد کے لئے کہیں کوئی دوسرا حقدار نہ کھڑا ہو جائے کیونکہ اُنھیں اپنے بارے میں پکّا یقین تھا کہ میر فدا حسین کا ترکہ شرعی و قانونی طور پر بالآخر اُنھیں کو ملے گا کیونکہ اُن کی پھوپھی کی اپنی کوئی اولاد نہیں اُن کے مرنے کے بعد تو سب کچھ ماجد ہی کا ہوگا۔ پھر بھی وہ میر صاحب کی تیمارداری میں اپنا زیادہ سے زیادہ وقت محض اس لئے صرف کر رہے تھے کہ اگر مرتے وقت میر صاحب کوئی وصیّت ان کی مرضی و منشا کے خلاف کریں تو اس میں وہ رخنہ ڈالنے کو موجود رہیں۔ ہادی میاں بھی گرگ باراں دیدہ تھے ماجد کی غیر معمولی دوڑ دھوپ دیکھ کر دل میں بھانپ گئے کہ ضرور وہ کسی چکّر میں ہے۔ ہادی نے اشارے سے ماجد کو پاس بلایا

''کیا حال ہے مِکّی- فدّن بھائی کی خیریت بتاؤ- ٹھیک ہو جائیں گے نا؟''

مِلّی اس بات سے اچھی طرح واقف تھے کہ ہادی اور میر صاحب میں وقّن کی شادی کے مسئلے پر اچھی خاصی کھٹ پٹ ہو چکی ہے اس لئے وہ ہادی کو خوش کرنے کے لئے بولے

''حال کیا بتاؤں۔ بس ہدّ و چچا سمجھ لیجئے کہ چل کوچ کی تیاری ہے۔ بنجارہ لاد کر جانے والا ہے یعنی کوچ کا نگاڑا بجنے ہی والا ہے'' مِلّی بڑے راز داری سے بولے

''یعنی کہ۔'' ہادی کو یقین نہ آیا ''میرا مطلب ہے کیا حالت ردّی ہے؟''

''ہوں'' مِلّی بولے ''ٹٹنس ہوا ہے اس میں کوئی بچتا بھی ہے''

اس اطلاع کے بعد ہادی کا دماغ اس محور پر تیزی سے کام کرنے لگا کہ فدّن کے مرنے پر ان کا صحیح وارث کون ہوگا ترکہ کسے ملے گا پھر ظاہر ہے کہ جلدی جلدی میں حسب دلخواہ جو نتیجہ وہ نکال سکتے تھے اس پر زبان کھول دی

''اللہ رحم کرے'' شاید اپنے ہی لئے دعا کی ہو ''خیر میاں مرنا تو برحق ہے سب کو ایک دن مرنا ہے۔ اب لڑکا نہیں ہے تو نہ سہی لڑکی تو ہے لاولد تو نہیں مریں گے اور وہی ان کی وارث بھی ہوگی سب کچھ اُسی کو ملے گا''

''کون لڑکی؟'' اس نئی اطلاع پر مِلّی ہتھے سے اکھڑ گئے ''آپ بھی بھنگ کھائے ہیں کیا؟ یا جان بوجھ کر اندھری چرا رہے ہیں ہدّو چچا لڑکی نہ لڑکا۔ زہرا پھوپھی کے ہوتے ہوئے کس میں ہمت ہے جوان کے مقابلے میں کھڑا ہو۔ بتایئے''

مِلّی کے ان خیالات سے ہادی کو فساد کی بو آئی مگر وہ بھی کم فتنہ جُو نہیں تھے بیساکھی کو زمین پر ٹھوکا دے کر بولے ''مِلّی تم ہو نرے جاہل'' زبان پر کوئی گالی بھی آئی تھی مگر روک گئے

''ابے میں کہتا ہوں جب لڑکی موجود ہے تو اس کے ہوتے عورت کو کہاں سے حق مل جائے گا؟''

ماجد ان کے خیالات بھانپ گئے تھے مگر موقع بحث مباحثہ کا نہیں تھا اس لئے وہ اتنا کہتے ہوئے وہاں سے کھسک گئے

''اوہو۔ اب سمجھ میں آئی بات۔ اسی لالچ میں جناب والا نے اپنی ہڈّی خراب کی ہے۔ جایئے بُھنا لیجئے چھپّن کروڑ کی چوتھائی''

ہادی نے جل بھن کر اُسے دل ہی دل میں بڑی غلیظ گالی دے ڈالی جو کسی کو سنائی نہیں دی۔ پھر اسی کلفت میں جا کر ڈاکٹر سے بھڑ گئے اور مریض کو ایک نظر دیکھنے کی اجازت مانگنے لگے ڈاکٹر نے انکار کر دیا

''نہیں جناب۔ اول تو وہ سو رہے ہیں اُنھیں نیند کا انجکشن لگا ہوا ہے آپ بیساکھی کے ساتھ کھٹ کھٹ کرتے جائیں گے تو نیند میں خلل پڑے گا۔ بس یہیں پردے کے پیچھے سے جھانک کر دیکھ لیجئے''

''واہ صاحب۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے'' وہ اکھڑ گئے ''وہ میرے بھائی ہیں میں تو اندر جاؤں گا۔ ضرور جاؤں گا''

''تو مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ جایئے جو جی میں آئے وہ کیجئے'' ڈاکٹر روٹھ کر بولا

ڈاکٹر سے تکرار ہوتے دیکھ کر وقّن اور اس کے دو ایک دوست وہاں پہونچ گئے

''مجھے کوئی لونڈا سمجھ لیا ہے'' ہادی کا پارہ چڑھنے لگا ''بڑے بڑے ڈاکٹر دیکھے ہیں میں نے''

''ابّا۔ ڈاکٹر صاحب ٹھیک کہتے ہیں آپ اندر جانے کی ضد نہ کیجئے سب ہی لوگ تو باہر کھڑے ہیں''

وقار اُنھیں سمجھا بجھا کر الگ لے گیا اور ایک بینچ پر بٹھا دیا

''یہیں بیٹھئے آپ کو تو ٹٹنس کے مریض سے دور رہنا چاہئے آپ کے کولھے کا زخم ابھی ٹھیک نہیں ہوا''

''یارو مجھے اپنے فدّن بھائی پر دعائیں پڑھ کر پھونکنی ہیں۔ نادعلی پڑھنا ہے، آیۃ الکرسی پڑھ کر دَم کرنا ہے'' ہادی نے احتجاج کیا

''چچّا آپ یہیں بیٹھے بیٹھے دعائیں پڑھئے'' یوسف نے کہا

''ہاں۔ دور کی دعاؤں میں بڑا اثر ہوتا ہے'' ظفر نے سمجھایا

ہادی مجبور ہو کر بنچ پر بیٹھ گئے پھر کیا معلوم وہ چپکے چپکے دعائیں پڑھنے لگے یا زیرِ لب گالیاں بکتے رہے تھوڑی دیر بعد ایک کتّا آ کر اُنھیں کے قریب فرش پر لیٹ گیا اور جب سونے کے موڈ میں آیا تو ہادی نے اُس کے پیٹ میں بیساکھی کونچ دی

عین اسی وقت کرامت علی نہ جانے کہاں سے آ ٹپکا۔ وہ کان پور سے صبح والی بس سے یہ سوچ کر چلا تھا کہ زرّیں کے معاملے میں میر فدا حسین کی مدد لی جائے کیونکہ اس کے نزدیک میر صاحب کی ہمدردی و سفارش کے بغیر کام نہ بنے گا اس لئے کہ شاکر اور ان کے گھر والے شیر علی کی طرف مائل تھے اور بات چونکہ ابھی کسی آخری نتیجے تک نہیں پہونچی تھی اس لئے اس نے یہ مناسب سمجھا کہ جائس سے میر صاحب کو اپنے ساتھ لے جائے اُن کی بات کو ٹالنا زرّیں کے لئے مشکل ہوگا مگر جائس پہونچنے پر اُسے میر صاحب کی بیماری اور اسپتال داخل ہونے کی بات معلوم ہوئی تو وہ سیدھا اسپتال پہونچ گیا یہاں لوگوں کے اداس چہرے دیکھ کر اُس کی امیدوں پر جیسے اوس پڑ گئی۔ اس وقت اسپتال کے برامدے میں جو لوگ بیٹھے تھے اُنھوں نے کرامت کو کلین شیو اور بڑھیا سفاری سوٹ میں دیکھ کر بالکل نہیں پہچانا زیادہ تر لوگوں نے ایک اپٹوڈیٹ اجنبی کو ضلع کا کوئی افسر ہی سمجھا۔ ہادی سب سے آگے بیٹھے تھے کرامت کو اپنی طرف آتا دیکھ کر وہ گھبرا گئے کرامت ان کے پاس پہونچ کر بولا

''ہادی بھیّا - کیسے ہیں میر صاحب؟''

''کون صاحب ہیں آپ؟ - میں نے پہچانا نہیں'' ہادی کھڑے ہونے لگے

''میں کرامت علی ہوں''

''اچ چھا - ارے واہ!'' وہ مسکرا دیئے ''ابے یہ کیا ہو گیا - ایں۔ یعنی کہ کایا پلٹ ہو گئی تیری تو تو سالا صاحب بن گیا''

''میں تو آپ کا تابعدار ہوں ہادی بھیّا'' کرامت نے انکساری دکھائی

''ہاں ہاں - وہ تو ہو - پر یہ ہو کیا گیا تجھے - اچھا خیر'' ہادی پھر بنچ پر بیٹھ گئے اور اپنے بیساکھی سے وارڈ کی طرف اشارہ کیا

''تو تم میر فدّن کو دیکھنے آئے ہو۔ جاؤ خود ہی جا کر دیکھ لو نا - وہ کیا سامنے کمرہ ہے۔ چلے جاؤ''

ہادی نے سوچا تھا کہ حالات سے ناواقف کرامت علی جب مریض کو دیکھنے کے ارادے سے وارڈ کے اندر گھسے گا تو سوٹ بوٹ پر ڈاکٹر سے ڈانٹ کھا جائے گا۔ مگر ہوا اس کے برعکس۔ ڈاکٹر زیدی تو اس وقت اپنے کوارٹر میں چلے گئے تھے اس لئے کرامت علی بغیر کسی کی اجازت واطلاع کے میر صاحب کے بیڈ تک پہونچ گیا اور ''میر صاحب!'' کہہ کر وہ ان کی پائنتی زمین پر کھڑا ہو گیا میر صاحب کی غیر حالت دیکھ کر وہ سچ مچ رو دیا۔ میر صاحب تو چراغ سحری تھے ذرا دیر کے لئے اس وقت اپنے پورے ہوش وحواس میں آ گئے اور اپنے کانپتے ہاتھ سے کرامت کو پاس بلایا اس کا ہاتھ پکڑ کر مسکرانے کی کوشش کی

''کیوں روتا ہے کرامت - ارے میں اچھا ہو جاؤں گا بہت اچھا کیا تو نے جو اس وقت آ گیا''

کرامت کچھ بولنے کے بجائے کھڑا آنسو بہاتا رہا کیوں کہ اس کی اُمیدوں کی نیّا آنکھوں کے سامنے ڈوب رہی تھی اس کا دل بیٹھنے لگا - میر صاحب نے پوچھا

''زرّیں کہاں ہے - کیسی ہے - وہ کیوں نہیں آئی؟''

ہادی نے جب کرامت کو مریض کے کمرے میں گھستے دیکھا تو وہیں بیٹھے بیٹھے شور مچانے لگے

''سالا کتّا اندر گھس گیا۔ کوئی دیکھتا نہیں۔ سب آنکھیں بند کئے بیٹھے ہیں، یارو یہ اسپتال ہے کہ بوچڑ خانہ ہے'' وہ اپنی بیساکھی لے کر لپکے اور کمرے کے اندر گھس پڑے ان کے ساتھ دو ایک آدمی اور اندر چلے گئے۔ میر صاحب کرامت کا ہاتھ پکڑے نقاہت بھری آواز میں بول رہے تھے ''بتاؤ نا کرامت - زرّیں کہاں ہے - میں اس سے اپنی خطائیں معاف کرا لوں، بہت رنج دیا ہے میں نے اس کو، میں اس کا بہت گنہگار ہوں'' وہ رونے لگے

کرامت بھی آواز سے رونے لگا ''اللہ پاک امام حسین کے صدقے میں آپ کو جلدی اچھا کر دے''

ہادی نے اشارے سے کرامت کو منع کیا۔ میر صاحب پھر بولے

''میں نے تجھے بھی ایک بار برا بھلا کہا تھا - تو بھی معاف کر دے مجھے''

''میاں آپ معافی نہ مانگئے مجھے رُلائی آتی ہے'' کرامت بولا

ہادی سے ضبط نہ ہوا دور سے کرامت کی پیٹھ میں اپنی بیساکھی کی نوک گڑائی

''چلو کھسکو - اب نکلو یہاں سے''

''نہیں نہیں - ہادی یہ نہ کرو'' میر صاحب کمزور آواز میں بولے ''کرامت کو یہیں رہنے دو، مت نکالو اِسے۔ مرنا تو برحق ہے پھر اس دنیا سے گنہگار کیوں جاؤں - ایک نیک دل اور نیک خصلت انسان کی دعائیں لے کر کیوں نہ اُٹھوں ن یہی تو میری پاک دامنی اور پارسائی کا ثبوت ہے اِسے میرے پاس سے نہ ہٹاؤ''

کرامت نے یہ سنا تو آگے بڑھا اور میر صاحب کے پیروں کی خاک اپنی آنکھوں سے مس کرنے لگا۔ میر صاحب بولتے رہے

''اور ہادی تم غور سے سنو اور میری وصیّت کو اچھی طرح سمجھ لو۔ اگر زرّیں رضامند ہو اور پسند کرے تو اُس کا عقد کرامت علی کے ساتھ کرا دینا۔ میں یہ کام تمہارے سپرد کیوں کر رہا ہوں یہ تم اچھی طرح جانتے ہو''

ہادی بولے ''ارے بھائی صاحب - کیا جانتا ہوں میں - میں تو کچھ بھی نہیں جانتا - فدّن بھائی اللہ کرے تم جلدی سے اچھے ہو جاؤ''

میر صاحب کی یہ بات یا ان کی وصیّت وہاں کھڑے سب ہی لوگوں نے سن لی تھی کیونکہ دھیرے دھیرے مریض کے پاس کافی لوگ اکٹھا ہو گئے تھے اور جب ڈاکٹر زیدی آئے تو بڑی مشکلوں سے اُنھوں نے لوگوں کو باہر نکالا۔ میر صاحب کی اس وصیّت کو سننے کے بعد ہادی کی وحشت اچانک بڑھ گئی اُنھیں اپنی قسمت کا پانسہ پلٹتا دکھائی دینے لگا اُن کی فطری افتاد کا تو یہی تقاضہ تھا کہ وہ اسپتال کے اندر ہی میر صاحب اور کرامت علی دونوں کو بُری بُری گالیاں دینا شروع کر دیتے مگر موقع کی نزاکت سے کچھ دیر کے لئے ان کے اندر کا شیطان رجیم قدرے ڈپلومیٹ بن گیا اُنھوں نے کرامت کو الگ لے جا کر پوچھا

''یہ زرّیں کا کیا معاملہ ہے کرامت؟ - مجھے بتا تو سہی - کیا کہہ رہے تھے فدّن بھائی''

یہ تو قدرت کی عجب ستم ظریفی تھی کہ میر صاحب نے زرّیں کے بارے میں وصیّت کی بھی تو کرامت کے دیرینہ رقیب ہادی کے روبرو۔ اس طرح زرّیں کے ساتھ اس کے عقد کی وصیّت کے سب سے مستند اور بھروسے مند گواہ ہادی بن گئے۔ اس لئے جب اُنھوں نے کرامت سے پوچھا کہ ''یہ زرّیں کا کیا معاملہ ہے'' تو وہ دل ہی دل میں ڈر گیا اور ہکلاتے ہوئے صرف اتنا کہا

''کچھ نہیں - کچھ نہیں۔''

''کچھ کیسے نہیں'' ہادی بولے ''فدّن بھائی نے خواہ مخواہ تو وصیّت کی نہیں۔ ایسے وقت میں کچھ سوچ سمجھ کر ہی کہا ہے اور وہ بھی اتنے سب آدمیوں کے سامنے تو مجھ پر وصیّت پوری کرنے کی ذمہ داری بھی عائد ہوگئی اب اگر اس سے روگردانی کروں تو گنہگار بنوں، کہ غلط کہتا ہوں؟''

''ہادی بھیّا'' کرامت اُن کے آگے گڑگڑایا'' آپ کو سب معلوم ہے آپ سے کیا چھپانا۔ ایسا ہے کہ۔ بہت دن ہوئے میں نے میر صاحب سے اپنے لئے زرّیں کا ہاتھ مانگا تھا آج اچانک اُنھیں یاد آیا تو وصیّت کردی'' ہادی دل ہی دل میں بدبدائے۔ سالے ٹکڑ گدّے'' مگر کہا نہیں۔ ''چلو کوئی بات نہیں'' ہادی کی حکمت عملی شروع ہوگئی ''ویسے تم نے بڑی ناسمجھی کی بات کی ہے۔ تمہیں تو اچھی طرح معلوم ہے کہ شادی سے پہلے زرّیں اور اس کی بڑی بہن دونوں کا پالن پوسن میرے ہی گھر میں ہوا تھا اس کا شوہر گذر گیا تو فدّن بھائی اس کے ولی و سرپرست کہاں سے ہوگئے؟ یہ متعہ وتہ کی بات بالکل بکواس ہے۔ تم کو مجھ سے اپنی خواہش بتانی تھی مگر تم پڑ گئے میر صاحب کے چکّر میں اور اُنھیں کے کہنے پر مجھے لنگڑا بھی کر ڈالا۔ مگر خیر۔ ہمارے یہاں بدلہ لینے کا رواج نہیں ہے میرا دل تمہاری طرف سے بالکل صاف ہے۔ فدّن بھائی نے تو وصیّت کی ہے مگر میں خود بھی تمہاری مدد کروں گا۔ زرّیں دو ایک دن بعد میرے یہاں آنے والی ہے اپنی بیٹی کے پاس اس وقت مجھے آسانی سے تمہاری بات کہنے کا موقع ملے گا۔ تم فکر نہ کرو۔ کرامت تم مجھے ضرور پرایا سمجھتے ہو مگر میرے لئے تو اب بھی وہی پرانے کرامت ہو۔ دوست اور ساتھی یاد ہے نا سب؟۔ نہیں واللہ میں جھوٹ نہیں کہتا اب تم بھی میری طرف سے اپنا دل صاف کرلو''

مقدر کا مارا اور تقدیر کا ہیٹا کرامت علی اُن کی باتوں میں آگیا۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ ابھی کچھ ہی دن پہلے یہی ہادی دولھا بن کر لاڈلی کے لئے اپنی بارات لے کر پہونچے تھے پھر سب سے اہم بات یہ تھی کہ خود اُسی نے ہادی کو گھوڑے پر سے گھسیٹ کر لنگڑا کیا تھا، تو بھلا ہادی اتنے بڑے مومن اور وسیع القلب کب تھے کہ اس بات کو بھول جاتے مگر کرامت اتنی آسانی سے اُن کے قبضہ میں پہونچ گیا جس طرح ایک بچے کی مٹھی میں تتلی بند ہوجاتی ہے۔ وہ سادہ لوح ہادی کی باتوں کو سن کر پوری طرح اس مغالطہ میں آگیا کہ اب ہادی کے دل میں کوئی فساد نہیں۔ اُس نے اُنھیں رقابت کے خانے سے بھی نکال دیا۔ گڑگڑا کر بولا

''ہادی بھیّا میں آپ کے پیر کا علاج کرادوں گا۔ آپ میرے دل کے زخموں کا علاج کرادیجئے''

ہادی دل ہی دل میں بولے ''ہاں ہاں کرادوں گا بیٹا''

اسی وقت ڈاکٹر زیدی گھبرائے ہوئے باہر آئے تو بڑے حزن و ملال کے ساتھ میر فدا حسین کے انتقال کی خبر سنائی۔ اسپتال کے اندر خواتین کے گریہ و بکا کا شور بلند ہوگیا۔

میر فدا حسین کے انتقال کے دوسرے دن زرّیں بھی جائس پہونچ گئی۔ زہرابی کو شوہر کا پُرسہ دیا۔ لاڈلی اور وقار کو گلے سے لگایا۔ ہادی کے گھر جا کر ان کی مزاج پرسی کی۔ ہادی میاں اُس کے آنے سے دل ہی دل میں بہت خوش ہوئے۔ زرّیں کو دیکھ کر اُنھیں سولہ برس کی وہ حسین و پرشباب دوشیزہ یاد آگئی جس کے لئے اُنھوں نے اپنی جوانی کے ایّام بڑے جوڑ توڑ اور رومانی ماحول میں گزارے تھے جس کی گھنگھور جوانی پر مر مٹنے اور حاصل کرنے کی خاطر اُنھوں نے کرامت علی کے کلیجے پر ٹھیس لگائی تھی۔ آج چوبیس پچیس سال بعد بھی وہ پھول اُنھیں کس قدر حسین و شگفتہ نظر آیا، اُسے اپنے سامنے دیکھ کر بلکہ پوری طرح اپنے چنگل میں پا کر اُن کا دل فرطِ مسرت میں ناچ اُٹھا

''بڑے نیک اور محبتی تھے فدّن بھائی'' ہادی نے کہنا شروع کیا ''کیا بتاؤں زرّو مرحوم کے مرنے کا مجھے بہت صدمہ ہے، مجھے بے انتہا چاہتے تھے بڑا خیال رکھتے تھے میرا۔ اب یہی دیکھو کہ جس دن اُنھوں نے اپنی لاڈلی کے لئے وقّن کے رشتے کا خیال ظاہر کیا تو بخدا میں بالکل انکار نہ کرسکا اور کرتا بھی کیسے سچ پوچھو تو مجھے اس رشتے کی منظوری میں تمہاری دلجوئی منظور تھی۔ اتنے دن ہوگئے تم نے تو کبھی میری طرف بھولے سے بھی نہیں دیکھا مگر میں تم کو کبھی نہیں بھولا ہمیشہ تمہیں یاد کیا۔ سوچتا تھا کبھی ملوگی تو بے وفائی کا شکوہ ضرور کروں گا۔ خیر۔ اچھا ہوا تم آگئیں۔ تو اب یہیں رہو۔ اسے اپنا اور اپنی بیٹی کا گھر سمجھو''

زرّیں نے ہادی کی ان باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔

جس دن میر فدا حسین کا سیوم تھا اس روز ہادی نے زرّیں کو گھر میں تنہا پا کر کچھ پیش دستی اور کچھ قلبی خواہشات ظاہر کرنے کی کوشش کی

''زرّو۔ میرے پیر کے مالش کے لئے کٹوری میں تیل ہے ذرا سا گرم کر کے لے آؤ اور میری ٹانگ اور کوکھے پر مالش کردو شاید تمہارے ہاتھوں کی برکت سے کچھ آرام آجائے''

زرّیں نے بغیر کچھ کہے تعمیل حکم کیا ہادی کی سوکھی لنگڑی ٹانگ اور کوکھے پر مالش ہوئی تو وہ خاصے رومینٹک ہوگئے ''میں نہ جانتا تھا کہ ان نازک نازک ہاتھوں میں ایسا جادو ہے ورنہ تمہیں اور پہلے

بلوالیتا۔ دیکھوتمہارا ہاتھ لگتے ہی درد دورد غائب ہوگیا۔ ویسے میرے اس تکلیف کو دور کرنا اور اس کی دوا کرنا سچ پوچھو تو تمہارا فرض ہے''

''کیوں؟'' زرّیں نے پوچھا

''وہ اس لئے کہ یہ کرامت کی دین ہے اور کرامت تمہارا دولھا بننے جا رہا ہے'' ہادی مسکرائے

''تو جو کام اس نے بگاڑا ہے اُسے ٹھیک کرنا تمہارا فرض نہیں ہے؟''

''کیا؟'' زرّیں تنک کر کھڑی ہوگئی

''ارے ارے تم تو خفا ہوگئیں'' ہادی نے معذرتی لہجہ میں کہا ''بھائی میں کیا کروں فدّن بھائی نے مرتے وقت یہی وصیّت کی تھی کہ تمہارا عقد کرامت کے ساتھ کرادوں اب تم نہیں چاہتیں تو جانے دو مجھے ان کی اس خواہش کو پورا کرنے میں کوئی مزہ بھی نہ آئے گا ارے بھائی کہاں تم اور کہاں وہ۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ سور کو مَلائی چاپ کھلایا جائے''

زرّیں عتاب بھری نظروں سے چپ چاپ اُنھیں دیکھتی رہی اور وہ بولے جا رہے تھے

''رہی میری بات تو وہ تم سے کب چھپی ہے۔ میں تمہارے عشق میں کس قدر دیوانہ تھا۔ زرّو پرانی باتوں کو ذرا یاد کرو لگتا ہے جیسے کل ہی کی بات ہو، حویلی کی چھت پر چاندنی رات میں ہم دونوں ملا کرتے تھے، ہائے کیا دن تھے'' زرّیں کچھ جواب دیئے بغیر چلی گئی۔

میر صاحب کے سیوم میں کرامت علی قرآن خوانی میں مصروف تھا صبح سے تین چار پارے قرآن پاک کے پڑھ کر میر صاحب کی روح کو ہدیہ کر چکا تھا۔ آج وہ ٹیری کاٹ کی نفیس شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ پہن کر آیا تھا ہاتھ میں واکنگ اسٹک اور پیروں میں سیاہ رنگ کا پمپ جوتا دیکھنے والے حیرت میں تھے کہ فقیروں کا خرقہ اُتار کر وہ اچانک اپٹوڈیٹ رئیس کیسے بن گیا۔ نوجوان تو تعجب ہی کرتے رہے مگر ایک بزرگوار پوچھ ہی بیٹھے

''اماں یار تم کرامت ہو؟''

''ہاں میر صاحب۔ حکم دیجئے''

کرامت پاس ادب میں دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوگیا اگرچہ اس کے ایک ہاتھ میں وارنش سے چمکتی ہوئی خوبصورت پہاڑی چھڑی اور دوسرے ہاتھ میں سگریٹ کا ڈبّہ تھا

''واللہ!'' وہ حیرت میں پڑ گئے ''کیا کوئی لاٹری کھل گئی ہے؟''

کرامت کے جواب سے پہلے ایک دوسرا مُفسد بولا

''بھولا ڈکیت کے گینگ کا نام نہیں سنا؟''

کرامت نے اس طنزیہ جملہ کا کوئی نوٹس نہیں لیا بدستور ہاتھ جوڑے کھڑا رہا

''آپ سیّد آلِ رسول ہیں'' اس نے بھی ایک چوٹ کی ''یہ تو آپ ہی کے قدموں کا طفیل ہے''

''اچھا۔ پھر لاؤ اسی بات پر اپنی سگریٹ پلاؤ ہمیں''

اُنھوں نے جھٹ اپنی ادھ جلی بیڑی ایک طرف پھینک کر اس کے سگریٹ پر ہاتھ مارا اور ایک سگریٹ اپنے ہونٹوں میں دبا کر چار پانچ سگریٹیں آزو بازو کھڑے لونڈوں میں تقسیم کردیں

''یار تم سگریٹ تو پیتے نہیں پھر یہ ڈبّہ لئے کیوں گھوم رہے ہو؟'' ایک نے پوچھا

''ہم لوگوں کو پلانے کے لئے'' دوسرے نے جواب دیا

''سالا۔ نو دولتیا'' تیسرا ادھیرے سے کھسک لیا

وقار نے کرامت کو ان لڑکوں کے بیچ کھڑا دیکھا تو اپنے دوستوں کو لے کر آ گیا

''آپ کو ابّا جان یاد کر رہے ہیں'' وقار نے کرامت کو بتایا

''اماں ٹھہرو یار'' ایک صاب وقار سے بولے ''شاہ صاحب ہماری انجمن کو چندہ دے رہے ہیں اور تم آ گئے بیچ میں بھینگ مارنے۔ ہاں تو شاہ جی نکالئے رقم۔ اس بار آگ پر ماتم کے لئے پانچ جوان آپ کے ساتھ آگ میں کودیں گے۔ لاؤ بھائی لاؤ رسید بک''

ایک لڑکا رسید بک نکال کر جلدی سے آگے آیا

''کتنی رقم لکھ دوں آپ کے نام؟''

''جو آپ مناسب سمجھیں'' کرامت ان کے جال میں آ گیا

ایک اور حاسد جنھیں سگریٹ نہیں ملی تھی جل بھن گئے اور وہاں سے جاتے جاتے فقرہ کسا

''یارو کیا زمانہ آ گیا ہے۔ شرم نہیں آتی ہے بھیک منگوں سے چندہ بٹورتے''

''اور سگریٹ مانگ کر پیتے'' ایک نے اُنھیں کے لہجہ میں کہا

کرامت نے سوسو کے دو نوٹ نکال کر اُن لوگوں کو دیئے اور وقار سے بولا

''چلو بیٹا چلو۔ مجھے ہادی بھیّا سے ملنا بہت ضروری ہے''

''ارے ٹھہریئے تو'' ایک لڑکا بولا ''دوسو میں کیا ہوگا لکڑی بہت مہنگی ہے اور رقم نکالئے''

کرامت نے دوسو اور دیئے

کرامت علی ہادی سے ملنے ان کے گھر پہونچا تو اس وقت زرّیں وہاں سے تنک کر جا چکی تھی اور ہادی اپنی تہمد گھٹنوں تک سمیٹے پڑے تھے ابھی ذرا دیر پہلے زرّیں ان کی ٹانگ پر تیل کی مالش کر کے گئی تھی۔ کرامت کے اچانک دولتمند ہو جانے کا ماجرا اُنھیں پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا اس وقت اس کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر ہادی کا دل رشک وحسد سے جل کر کباب ہوگیا مگر بناوٹی ہنسی کے ساتھ بولے

''ارے آؤ آؤ کرامت۔ میں تو دیر سے تمہیں یاد کر رہا تھا''

”تو لیجئے حضور نے یاد کیا اور بندہ حاضر ہوگیا“ کرامت نے مکھن لگایا ”مگر ہادی بھیّا پہلے یہ بتائیے کہ آپ کے پیر کا کیا حال ہے پہلے سے کچھ آرام ہوا؟“

”ارے یار اب کیا آرام آئے گا“ وہ بڑی مایوسی سے بولے ”میں تو کہتا ہوں کرامت تمہیں نے درد دیا ہے تمہیں دوا بھی دو۔ کہ غلط کہتا ہوں؟“

”ارے ارے ارے“ کرامت نے ندامت ظاہر کی ”میں حقیر فقیر کس لائق ہوں بھیّا۔ ہاں اگر آپ کا منشا دوا علاج کے لئے کچھ روپوں سے ہے تو....“

وہ اس کے آگے مارے لحاظ کے کچھ نہ بول سکا صرف اتنا کہہ پایا ”ہم تو آپ کے قدیم نمک خوار ہیں“

”کیا کہوں کرامت“ وہ ٹھنڈی سانس لے بولے ”زمانہ بڑا نازک آ گیا ہے، زمینداری کیا ختم ہوئی شرفا اور عزت داروں کی عزت خاک میں مل گئی، شریف رزیل اور رزیل شریف بن بیٹھے ہیں۔ ایک تو گردش روزگار اس پر پیر سے معذوری جو روپوں کی تنگی کے باعث روز بروز تکلیف دہ ہوتی جا رہی ہے۔ خیر۔ اس پر بعد میں بات چیت ہوگی پہلے تمہیں یہ بتا دوں کہ میں نے تمہارے بارے میں ابھی تھوڑی دیر پہلے زرّیں سے بات چیت کی تھی میر صاحب کی وصیّت کا بھی ذکر کیا غرضکہ وہ تمہارے ساتھ عقد پر راضی ہوگئی ہے“

”ارے! سچ ہادی بھیّا؟“ وہ ان کے گھٹنے چھو کر بولا ”تو وہ راضی ہوگئی؟ ارے واہ کیا تیر مارا ہے آپ نے“

”ہاں۔ بس یہ میرا ہی کام تھا جو اُسے تمہارے لئے راضی کر لیا“ ہادی نے کہا

”واہ ہادی بھیّا“ وہ خوشی سے ناچ اُٹھا ”آپ نے سچ مچ کمال کر دیا آپ کا یہ احسان کبھی نہ بھولوں گا“

”کون سا احسان ہے یہ“ ہادی بولے ”اگر تم میرے ساتھ یا میں تمہارے ساتھ کوئی بھلائی کا کام کروں تو یہ احسان کہلائے گا۔ اچھا چلو یہ بتاؤ۔ تم نے ابھی تھوڑی دیر پہلے میرے دوا علاج کے لئے پیسوں سے مدد کی بات کی تھی۔ تو پھر یہ بتاؤ کہ میرے پیر کے علاج کے لئے تم کتنا روپیہ دے سکتے ہو“ بھائی تم نے میر تقی میر کا یہ شعر سنا ہوگا

میر کیا سادے ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اُسی شیطان کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

”واہ واہ واہ۔ آپ کو کتنا چاہیئے؟“ کرامت بولا

”کم از کم پچیس ہزار“ ہادی بولے ”بات یہ ہے کہ ڈاکٹر نے پیر کے علاج کے لئے مجھے

بنگلور جانے کو کہا ہے وہاں جرمنی کا ایک ڈاکٹر کوئی نئی مشین لایا ہے جس سے بلا آپریشن کولھے کی ہڈی کا علاج ہوتا ہے۔ پچیس ہزار کا بندوبست خود میں نے کر لیا ہے اب اتنی ہی رقم اور چاہیئے تب کوئی پروگرام بن سکتا ہے“

”فکر نہ کیجئے۔ روپے کل آپ کو مل جائیں گے“ کرامت نے کہا

”الحمدللہ۔ چلو ایک فکر تو دور ہوئی“ ہادی بولے ”اب اپنی شادی کی بات پر آ جاؤ اور یہ بتاؤ کہ زرّیں کے لئے کپڑوں اور گہنوں کا انتظام تم خود کرو گے یا میں تمہاری طرف سے کر دوں۔ ذرا خوب تڑک بھڑک سے شاندار انتظام ہونا چاہیئے بھائی“

”ہی ہی۔ آپ ہی میری طرف سے کر دیجئے میں روپے دے دوں گا“ کرامت نے کہا

”چلو یہ بھی ہوگیا۔ بس دو ایک روز میں اس کام سے فراغت ہو جائے تو پھر بنگلور کا سفر کروں۔ اور کرامت تم بھی بنگلور کیوں نہ چلو وہیں ہنی مون منانا۔ بڑی پیاری جگہ ہے بنگلور۔ میں تو ایک بار جا چکا ہوں“

پھر مسکرا کر کرامت سے پوچھا ”ہنی مون جانتے ہو کرامت؟“

”نہیں“ وہ بولا

”ہائے ہائے ہائے“ ہادی دھیرے سے بولے ”شادی کے بعد میاں بیوی جب کسی پیاری سی سُہانی اور رومینٹک جگہ پر عیش و آرام کی زندگی گذارنے جاتے ہیں تو اُسے ہنی مون کہتے ہیں۔“ یار تم بھی چلو کرامت واللہ۔

کرامت اس گدگدی خیز تذکرہ پر کچھ شرمایا اور دو تین بل کھا کر بولا

”ہی ہی۔ ہم لوگ پہاڑ پر جائیں گے۔ نینی تال“

ہادی نے دل ہی دل میں جل بھن کر اُسے بہت سی گالیاں دے ڈالیں مگر نقلی ہنسی ہنس کر بولے ”ارے واہ یار“

دوسرے دن کرامت نے سونے کا ایک اور بسکٹ ایک مقامی سنار کے ہاتھ فروخت کر کے چالیس ہزار روپے ہادی کے حوالے کر دیا جس میں پچیس ہزار اُن کے علاج کے لئے تھے اور بقیہ پندرہ ہزار زرّیں کے کپڑوں وغیرہ کے لئے۔ اس کے علاوہ زرّیں کے لئے کان پور میں خریدے ہوئے زیورات کپڑے اور سنگھار کے لئے ڈھیروں سامان کرامت نے یہ سب ہادی کے سپرد کر دیا کہ وہ زرّیں تک پہونچا دیں۔

ہادی اپنے کمرے میں میلی لُنگی باندھے تخت پر لیٹے تھے اور ان کے آگے کرامت کے دیئے ہوئے سونے کے زیورات مخمل لگے خوبصورت ڈبّوں میں رکھے تھے چہرے پر بڑی بشاشت تھی، تخت کے ایک کونے پر وقار چپ چاپ بیٹھا تھا

''دیکھ رہے ہو برخوردار یہ زیورات - سب اصلی سونے کے ہیں'' ہادی نے کہا

وقار اس اطلاع کے باوجود بھی خاموش رہا تو ہادی کا مزاج خراب ہو گیا

''نہ بولو میرے ٹھینگے سے - اچھا اب اس میں سے کوئی چیز اُٹھا لے جاؤ اپنی عورت کے لئے''

وقار نے اب ان زیورات پر غائر نظر ڈالی - سرخ مخمل چڑھے تین ڈبّے سامنے رکھے تھے جن میں نکلس، کنگن اور کانوں کے جھمکے رکھے تھے۔ یہ بات وہ نہیں سمجھ سکا کہ یہ قیمتی گہنے ابّا کے پاس آئے تو کہاں سے آئے پھر ان میں سے صرف ایک چیز اُٹھانے کے لئے کیوں کہا جبکہ بظاہر کوئی دوسرا ان چیزوں کا حقدار نہیں تھا اور یہ تحفۂ خلوص وہ اپنی بہو کو پیش کرنے کے بجائے اُسے کیوں دے رہے ہیں۔ وقار کے اس تذبذب کو دیکھ کر ہادی نے ڈانٹا ''ابے سوچتا کیا ہے - لے گا یا نہیں؟''

''بات یہ ہے ابّا - وہ بڑی حویلی گئی ہیں آپ کہئے تو اُنھیں بلا لاؤں''

مقصد یہ تھا کہ لاڈلی خود آکر اپنی پسند کی چیز لے لے۔ ہادی نے یہ درخواست منظور کر لی

''جاؤ - بلا لاؤ'' وہ بولے ''اور سنو تھوڑی دیر کے لئے اس کی والدہ کو بھی لیتے آنا''

ابّا آج جمعرات ہے - رشتے کی عورتیں پُرسے کے لئے آئی ہوں گی اس لئے شاید اُن کی والدہ نہ آسکیں''

''تم بہانے تراشنے میں نمبری ہو'' ہادی کو برا لگا ''کوشش نہیں کی اوپر سے بھیگی بلّی بتا دیا''

تھوڑی دیر بعد وقار لاڈلی کو اپنے ساتھ لے کر آگیا

''تمہاری والدہ کیوں نہیں آئیں؟'' ہادی نے پوچھا

لاڈلی نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا کیونکہ آتے ہی زیورات کے ڈبّے دیکھ لئے تھے۔

ہادی کے بجائے اُس کی ساری توجہ ان زیورات پر مرکوز رہی۔ ہادی بولے

''اچھا لو - ان گہنوں میں تمہیں ایک چیز جو زیادہ پسند ہو وہ اُٹھا لو''

''اور باقی دو زیور آپ کسے دیں گے؟'' لاڈلی نے پوچھا

ذرا سی مسکراہٹ کے بعد ہادی نے تکلفاً پہلو بدلنا چاہا لیکن اکھڑے کولھے کے باعث ایسا نہ کر سکے

''وہ - وہ میں - اپنی ہونے والی خاتون کو دوں گا''

یہ کہتے ہوئے ان کے چہرے پر کچھ کچھ شرم کے شیطانی آثار پیدا ہوئے جو اچانک لاڈلی کی تیز وشوخ ہنسی میں پوری طرح ان کے چہرے پر مسلّط نہ ہونے پائے۔ لاڈلی ایک دم ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئی

''کیا کہا؟ - اپنی خاتون!'' یہ جملہ وہ بار بار دہراتی اور دل کھول کر ہنستی گئی

''خاتون - ہہ ہہ ہہ!'' اُسے جمیلہ نائین کا وہ جملہ بھی یاد آگیا جو اس نے ہادی کے بارے میں اس سے کہا تھا ''ہم کہت ہے بڑے میاں کے بھی کہُوں بیاہ کرائے دیو - ابھی جوان ہیں''

''کیوں ہنستی ہو؟'' ہادی نے برا مان کر کہا

''کچھ نہیں ابّا جی'' لاڈلی اپنی ہنسی پر قابو پا کر بولی۔ اس کی نظروں میں تو ہادی کی ایک سن رسیدہ اور بن بیاہی خاتون رشتے دار کا چہرہ ناچنے لگا تھا۔ وہ ہنستی ہوئی بولی

''شاید چھمّن پھوپھی کے سہرے کی کلی جلدی کھلنے والی ہے''

''کیا؟'' وہ ڈپٹ کر بولے ''ارے وہ چھمنیاں:''

''ایسا ہے ابّا جان کہ پچھلی نوچندی جمعرات کو اُنھوں نے بڑے امام باڑے پر بہت گڑ گڑا گڑ گڑا کر اپنے لئے ایک دولھا کی منّت مانی تھی''

''ارے لڑکی'' ہادی نے زور سے ڈانٹا ''تو میرا مذاق اڑا رہی ہے - ارے میں اور اس کبڑی چھمّنیا کو اپنی شریک حیات بناؤں گا''

''کیا معلوم'' وہ بولی ''بھائی اگر چُھمّن پھوپھی کی دعا اور منّت قبول ہو گئی تب تو آپ کو بنانا ہی پڑے گا۔ اُن کے لائق آپ کو چھوڑ اور کوئی ہے بھی تو نہیں خاندان میں۔ خاصی اچھی جوڑی رہے گی'' وَن تھری فور''

''چوپ'' اس بار اُنھوں نے اور زور سے ڈانٹا'' دیکھ رہا ہے وقّن اس لڑکی کو۔ یہ میری معذوری پر چوٹ کر رہی ہے''

''اچھا لایئے - کیا دے رہے ہیں آپ مجھے'' لاڈلی نے پوچھا

''کچھ نہیں دوں گا'' وہ جل کر بولے ''میں نے تو یہ پوچھا تھا کہ تیری والدہ کیوں نہیں آئیں''

''آپ نے بلوایا تھا کیا؟'' لاڈلی نے پوچھا

''ہاں بلوایا تھا'' وہ بولے

''کیا کام ہے مجھے بتایئے میں کر دوں گی''

''تم کر سکو گی وہ کام؟''

''ضرور کر دوں گی'' لاڈلی نے کہا ''ایسا کیا کام ہے جو صرف وہی کر سکتی ہیں''

''اچھا تو یہ لو'' ہادی بولے ''یہ نکلس تمہارا ہے۔ کنگن اور جھمکے میری طرف سے تم اپنی والدہ کو دے دینا۔ اور کہنا میری طرف سے تحفہ ہے۔ گر قبول اُفتد زہے عزوشرف''

لاڈلی نے تینوں ڈبے سمیٹے اور جب چلنے لگی تو ہادی نے پوچھا

''کیا کہو گی اُن سے؟''

''کچھ نہ کہوں گی۔ آپ نے صرف دینے کو کہا ہے دے دوں گی'' لاڈلی نے کہا

''ارے واہ۔ تم اتنی نادان کیوں بن رہی ہو۔ سنا نہیں تم نے میں نے کیا کہا تھا''

''کیا کہا تھا؟''

''میں نے کہا تھا کہ میں یہ زیورات اپنی ہونے والی خاتون کو دوں گا''

'خاتون' کا لفظ سنتے ہی لاڈلی جاتے جاتے رک گئی پلٹ کر ایک نظر ہادی کو اوپر سے نیچے تک دیکھا اور بڑے تیکھے لہجہ میں بولی

''کیا۔ کیا۔ کیا؟۔ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟'' لاڈلی نے پوچھا ''کیا آپ میری والدہ کو اپنی ہونے والی خاتون کہہ رہے ہیں؟''

''ہاں اور کیا'' ہادی چہک کر بولے ''یہ سونے کے زیورات کیا مفت میں دے رہا ہوں''

''خیر یہ گہنے تو سمجھئے مفت ہی میں گئے'' لاڈلی بولی ''کیونکہ اب یہ آپ کو واپس ملنے سے رہے۔ رہ گیا امّاں کے بارے میں۔ تو آئندہ ایسی ویسی پھوہڑ باتیں سوچنا بند کر دیجئے تو بہتر ہے اچھا ہوا کہ یہ بات آپ نے ان سے نہیں کہی۔ ورنہ''

''ارے واہ!'' ہادی بولے ''تو تو مجھ سے لڑنے لگی تجھے بیچ میں ٹانگ اڑانے کا کیا حق ہے''

''اچھا ابّا۔ بند کیجئے خدا کے لئے یہ باتیں'' وقار نے کہا

''آخر کیا چاہتے ہیں آپ؟'' لاڈلی تیز لہجے میں بولی

''میں عقد کرنا چاہتا ہوں'' ہادی نے تڑ سے جواب دیا'' نکاح۔ سمجھتی ہو کہ نہیں؟''

''چپ رہئے ابّا'' وقار نے پھر سمجھایا

''آپ چپ چاپ کھڑے رہئے'' لاڈلی وقار سے بولی ''میں ابھی ان بزرگوار کو جواب دیتی ہوں کیونکہ اگر میں نے اس وقت ان کی زبان نہ بند کی تو یہ ہر ایک کی زندگی میں زہر گھولتے رہیں گے''

''ارے کون ہوتی ہے تو مجھے جواب دینے والی، بدتمیز تو میری زبان کیا بند کرے گی''۔ بڑی آئی ہے جودھا بائی بن کے۔ سیدھی طرح اس گھر میں رہنا ہے تو میرے اشاروں پر چلنا پڑے گا ورنہ نکل جا اِس گھر سے'' ہادی خوب چمک چمک کر بولے

''میں کیوں نکلوں؟'' وہ چٹک کر بولی ''یہ گھر میرا ہے۔ میرے پرکھوں کا ہے۔ میں یہیں رہوں گی، جم جم کر رہوں گی۔ کان کھول کر سن لیجئے لنگڑ خاں صاحب''

''ابّا خدا کے لئے تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو جایئے نا'' وقار نے پھر التجا کی

''چپ رہ نالائق کمینے'' ہادی گرجے ''بدتمیز مجھے حکم دیتا ہے۔ اپنی عورت کو نہیں سنبھال پاتا۔ اچھا چل۔ اِدھر آ میرے پاس۔ ہاں اور دیکھ اس کی چوٹیا پکڑ کر گھر سے نکال دے۔ نکال جلدی''

''واہ واہ۔ کیا شرافت دکھا رہے ہیں۔ آپ نے سکینہ آپا کی زندگی برباد کی۔ ایک بیمار معذور لڑکی کو بہو بنا کر گھر لائے پھر پتہ نہیں اس بیچاری کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اپنے بیٹے کا اُٹھنا بیٹھنا کھانا پینا دوبھر کئے ہیں۔ اپنی شادی کی تمنا میں دولھا بن کر میرے دروازے پر بھی آ گئے تھے۔ خیر اس بات کا بدلہ تو میں آپ سے لیتی رہوں گی مگر اس وقت کان کھول کر سن لیجئے قبلہ کہ میں اپنے گھر میں آپ کو آگ لگانے نہیں دوں گی بس آپ حد سے گذر چکے ہیں اب قابل معافی نہیں ہیں''

''واپس کر میرے زیورات'' ہادی گرجے

''زیورات اب واپس نہیں ہوں گے۔ سُن لیا؟'' وہ بولی

اتنا کہہ کر لاڈلی وہاں سے چلی گئی۔ وقار تھوڑی دیر تک وہیں سر جھکائے کھڑا رہا پھر جاتے جاتے لاڈلی نے آواز دے کر اُسے بلایا

''آپ کیا وہیں کھڑے رہیں گے پیسا ٹاور کی طرح۔ چلئے ہٹئے وہاں سے''

آواز سن کر وقار وہاں سے جانے لگا تو ہادی بولے

''ہاں ہاں جاؤ۔ میرے مطیع و تابعدار فرزند جاؤ۔ دیکھ لی تمہاری سعادت مندی۔ تُف ہے تجھ پر۔ کل کی بیاہی دو انگل کی چھوکری تیرے باپ کے منہ پر تڑا کر چلی گئی اور تو گھونگھا کی طرح منہ کھولے کھڑا کا کھڑا رہا۔ ابے زمین میں گڑ کیوں نہ گیا نالایق۔ بے غیرت چلّو بھر پانی میں ڈوب کیوں نہ مرا۔ حرام خور، کم بخت، بدتمیز، چل ہٹ سامنے سے''

وقار کچھ بولے بغیر سر جھکائے وہاں سے چلا گیا

ہادی ذہنی الجھنوں میں بری طرح پھنسے تھے اب ان کو سمندر کی گہرائی کا صحیح اندازہ ہو رہا تھا۔ ایک تو زرّیں کے دوبارہ نہ ملنے کا غم اس پر بہو کی زبان درازی، وقار کی کمزوری و بے چارگی وہ سخت پریشان تھے کہ کیا کریں جب کھونٹا ہی مضبوط نہیں تو بچھڑا کس کے بل ناچے گا، دو دنوں سے یہی ذہنی کوفت اُنھیں کھائے جا رہی تھی کہ عین اسی ذہنی خلفشار میں کرامت بھی خیریت دریافت کرنے کے لئے آپہونچا تو ہادی سرتاپہ سُلگ اُٹھے مگر کرامت کے پیسوں کی مار ان پر پڑ چکی تھی اس لئے اُس سے بے رخی سے پیش آنے کے بجائے ملائمیت سے بولے

''آؤ آؤ کرامت'' پھر قدرے تامل کے بعد بولے ''بھائی تمہارے گہنے تو میں نے زرّیں کے پاس بھجوا دیئے تھے مگر...''

اتنا کہہ کر ہادی ذرا دیر کو رُکے تو کرامت کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ دل دھڑکنے لگا

''مگر کیا؟ - بتایئے - کیا کہا اُس نے؟'' کرامت بے تاب ہو گیا

''یار کرامت'' ہادی نے لمبی سانس بھری ''زیورات کو تو اس نے ہاتھ بھی نہیں لگایا دیکھ کر رونے لگی - میں سمجھتا ہوں ابھی فدّن بھائی کا غم اُس کے دل میں تازہ ہے نا''

اس دل شکن اطلاع پر کرامت کچھ نہیں بولا چپ چاپ کھڑا کچھ سوچتا رہا۔ ہادی آگے بولے

''اس لئے کرامت تم ابھی چار چھ مہینے خاموش رہو بعد میں دیکھا جائے گا''

''چار چھ مہینے؟'' کرامت چونک اُٹھا ''اور پھر اس کے بعد دیکھا جائے گا - واہ صاحب واہ - ارے جناب آپ نے تو دو ایک روز کی بات کہی تھی۔ روپے اور زیورات بھی لے لئے اور اب مجھے چار چھ مہینے کے لئے ٹال رہے ہیں۔ کہتے ہیں بعد میں دیکھا جائے گا۔ کیا دیکھا جائے گا؟ بتایئے بتایئے۔''

''کون حرامی ٹال رہا ہے'' ہادی اُکھڑ گئے ''اب تمہاری کھوپڑی میں یہ بات نہ گھسے تو میں کیا کروں۔ اتنا تو سوچو کہ فدّن بھائی کے مرنے کے بعد اُسے عدّت کے دن بھی تو کاٹنے ہیں - اور تم ہو کہ چڑھے آ رہے ہو سینے پر۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں بھی تمہاری طرح جاہل بن جاؤں''

''عدت؟ مدّت؟'' کرامت بولا ''کیا وہ میر صاحب کی نکاح میں تھی؟''

''اور تو کیا سمجھتا ہے؟ ارے وہ سیّد تھے نیک اور پارسا تھے۔ حرام کاری نہیں کرتے تھے''

''میں تو یہی جانتا ہوں کہ وہ رحمٰن کی بیوہ ہے'' کرامت بولا

''اب تم یہی جانا کرو'' ہادی بولے ''بس اب خاموش رہو۔''

''جو زیورات آپ نے اُسے بھجوائے تھے تو اس نے اُنھیں ہاتھ نہیں لگایا - پھر کہاں گئے وہ زیورات؟''

''اس کی بیٹی کے پاس ہوں گے'' ہادی چڑ کر بولے

''ہوں گے - یا ہیں؟''

''ہیں''

''ٹھیک ہے میں لاڈلی بٹیا سے لے لوں گا'' کرامت مطمئن ہو کر بولا

''کیسے لے لوگے - دیکھتا ہوں کیسے لے لوگے میں مر گیا ہوں کیا''

''آپ دیکھتے رہیئے'' کرامت نے کہا ''اور جو روپے میں نے آپ کو دیئے تھے وہ فوراً واپس کیجئے''

''کیا بکتا ہے'' ہادی ڈپٹ کر بولے ''بڑا زور ہو گیا ہے تجھے اپنے روپوں کا۔ پھکٹّے۔ سالے کفن چور۔ ٹکڑ گدّے۔ مجھے انکھیں دکھاتا ہے - ابے نہیں دوں گا روپے جا - اور سن لے اب اگر زرّیں کا نام تیرے منھ سے سنا تو سالے جہنم واصل کر دوں گا۔ سمجھا؟''

''ذرا اپنے آپے میں رہ کر باتیں کرو ہادی'' کرامت غصّہ میں کھڑا ہو گیا ''میر صاحب نے زرّیں کے لئے میرے بارے میں وصیّت کی تھی۔ میں خود اس سے باتیں کر لوں گا''

''جاؤ جاؤ کر لو باتیں'' ہادی نے کہا ''وصیّت تو فدّن نے کی تھی اور تو چاہتا ہے اُسے پوری میں کروں۔ ابے وہ میرے مورث تھے کیا جو مجھ پر فرض سمجھ رہا ہے۔ ہونہہ! بڑے آئے وصیّت کرنے والے''

''ہادی - تم جھوٹے ہو - مجھے دھوکہ دیا - مجھ سے رقم اینٹھی - میں تمہیں معاف نہ کروں گا۔ دغا باز۔ جھوٹے''

''چل ہٹ - سالا فقیر کی اولاد'' ہادی چلاّئے ''تو اور مجھے روپے دے گا۔ بھک منگے۔ قبر کا چڑھوّا کھانے والا''

کرامت پر جنون طاری ہو گیا وہ دانت پیس کر بولا

''دیکھ بے لنگڑے میں پھر سمجھائے دیتا ہوں۔ تمہاری ایک ٹانگ میں پہلے سے بیکار کر چکا ہوں دوسری بیکار کرنے سے پہلے میں تمہارے سینے پر چڑھ کر نرخے سے سارا خون پی جاؤں گا''

اتنا کہہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھا تو ہادی سمجھے کہ وہ باہر جارہا ہے جھٹ اپنی بیساکھی اٹھا کر کرامت کی طرف پھینکا جو جا کر اس کی پیٹھ پر لگا۔ کرامت تڑپ گیا۔ دروازے پر پہونچتے ہی پہلے اُس نے دروازوں کو اندر سے بولٹ کیا پھر وہیں سے جست لگا کر ایک وحشی درندے کی مانند ہادی کے سینے پر کود پڑا تو وہ تخت پر چاروں خانے چت ہو گئے

''اے۔ اے۔ اے'' بس اتنا ہی ہادی کے منھ سے نکل پایا کیوں کہ کرامت نے ان کا گلا تھام لیا تھا اور گلا دبنے سے آگے ان کے منھ سے کوئی آواز نہ نکلی۔ منٹوں سے بھی کم میں ہادی کی حالت غیر ہو گئی کرامت کی پکڑ گلے پر ویسی ہی تھی جیسی عزیز بیگ کے گلے پر تھی جب ہادی کی اُبلتی ہوئی بڑی بڑی آنکھوں اور خوفناک چہرہ دیکھا تو کرامت خود ڈر گیا اور یہ سمجھ کر اُنھیں چھوڑ دیا کہ وہ چل بسے۔ عین اسی وقت کسی نے باہر سے دروازہ پیٹا تو کرامت لپک کر دروازے پر پہونچا اور جھری میں سے جھانک کر دیکھنے کے بعد دروازہ کھول دیا شام کے جُھٹ پٹے اور نیم تاریکی میں لاڈلی کمرے میں آئی اور تیر کی طرح ہادی کے پاس پہونچی زیورات کے تینوں ڈبّے اس نے ہادی کے اوپر پھینک دیئے

''سنبھالئے اپنی دولت'' لاڈلی ڈبّے پھینک کر جانے لگی ''ہمیں نہ چاہئے یہ لوٹ کی سوغات''

لاڈلی جس طیش میں آئی تھی اُسی طرح غصّہ میں کمرے سے باہر چلی گئی اس نے ایک سکنڈ کے لئے بھی کرامت کی طرف نہیں دیکھا۔ ہادی ویسے ہی بے سُدھ پڑے رہے

''بیٹا ہادی ایک بار پھر تجھے چھوڑ دیا'' کرامت ہادی کے پاس پہونچ کر ہانپتا ہوا بولا ''سن لولنگڑ دین۔ میرے ہاتھوں تمہیں تین بار نئی زندگی مل چکی ہے۔ اگلی بار جان سے ماروں گا اور قبر سے تیری میّت نکال نکال کر اس پر کتّے نہ موتوائے تو درویش کا بچّہ نہ سمجھنا''

ہادی زندہ تھے۔ آنکھیں جھپکا جھپکا کر اُس کی طرف دیکھنے کے سوا وہ کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے، نہ منھ سے آواز نکلی نہ ہاتھوں میں حرکت ہوئی۔ کرامت نے آگے بڑھ کر زیورات کے تینوں ڈبّے اُٹھا لئے

''جاتا ہوں ہادی۔ میرے روپے دو دن میں واپس نہ ملے تو کچومر بنا دوں گا تیرا''

دروازے سے باہر نکلتے ہی اُسے وقار مل گیا اُس سے کہا ''بیٹا ذرا مجھے حویلی تک پہونچا دو مجھے لاڈلی اور اس کی ماں کے پاس پُرسے کے لئے جانا ہے''

★★★

میر فدا حسین کے مرنے کے بعد بڑی حویلی میں ماجد عرف مِلّی میاں کا عمل دخل کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا تھا کیوں کہ ان کے خیال میں زہرا پھوپھی کو اب اُن کی زیادہ ضرورت تھی اور یہ احساس اس اندیشے سے روز بروز شدید تر ہوتا جا رہا تھا کہ میر صاحب کی زمین جائیداد جس کی اب تنہا وارث زہرا

بی بی تھیں کہیں بے وقوفی یا محبت میں وہ جائیداد لاڈلی کی طرف نہ منتقل کر دیں۔ وہی لاڈلی جس کے پاس میر صاحب کی جائز اولاد ہونے کا کوئی ثبوت بھی نہیں تھا۔ اپنی بیوہ پھوپھی کی خدمت اور دل جوئی تو وہ کر ہی رہے تھے ساتھ ہی لاڈلی پر ان کی حریصانہ نظریں اب بھی برقرار تھیں۔

اس روز جب حویلی کے کسی کونے میں مِلّی نے لاڈلی کو اکیلی پایا تو پیار سے بولے ''اے لاڈلی۔ سنو۔ تم Love کی اسپلنگ بھول تو نہیں گئیں؟''

''ارے نہیں ماسٹر صاحب۔ سناؤں؟'' لاڈلی نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا

''ہاں ہاں۔ سناؤ'' وہ خوش ہو گئے

لاڈلی کا ایک کرارا چانٹا ماجد کے داہنے گال پر لگا

''ٹھیک ہے نا؟۔ بھولی تو نہیں''

ماجد کو لاڈلی سے اتنے سخت اقدام کی قطعی توقع نہیں تھی گال پر تھپّڑ لگا تو سر بھنّا گیا اور تن بدن میں آگ سی لگ گئی جلبلا کر اُنھوں نے لاڈلی کی کلائی پکڑ کر اُسے اپنی طرف گھسیٹا تو تڑ تو بڑ تین گھونسے اُن کی ناک پر لگے، لاڈلی زور سے چلّائی

''چھوڑ مجھے۔ کمینے۔ کتّے۔ ہٹ الگ''

اس بار لاڈلی نے مِلّی کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر چاک و گریبان ایک کر دیا۔ ٹھیک اسی وقت وقار کرامت کو اپنے ساتھ لے کر حویلی آیا تھا ارحویلی کی لمبی نیم تاریک دہلیز سے ہو کر یہ دونوں صحن تک پہونچے ہی تھے کہ لاڈلی اور ماجد میں ہاتھا پائی دکھائی دی۔ وقار اور کرامت کا سامنا ہوتے ہی مِلّی اپنا پھٹا گریبان لے کر بھاگا لیکن کرامت نے لپک کر اُسے کمر سے تھام لیا اور ایک ہی جھٹکے میں اُسے دہلیز کے اندر گرا کر لات اور گھونسوں سے اس قدر مارا کہ اُسے چھٹی کا دودھ یاد آ گیا ابھی تھوڑی دیر پہلے جو غصّہ اُسے ہادی پر آیا تھا وہ اس نے مِلّی پر اتار دیا۔ اس کی فریاد سن کر زہرا بی بی بھی آ گئیں اور ماجد سے بولیں ''خبردار اب تیرے قدم حویلی کے اندر نہ آویں ورنہ تیرے حق میں مجھ سے بُرا کوئی نہ ہو گا۔ بے حیا۔ بے شرم''

مِلّی میاں پر حویلی کے اندر جو مار پڑی تھی وہ ان کے چھپانے کے باوجود بہت جلد طشت از بام ہو گئی پُھندنیا نائین اُن کی پٹائی کی چشم دید گواہ کس طرح بن گئی یہ کسی کو پتہ نہ چلا اُس نے اس واردات کی مصالحہ دار رپورٹنگ ہادی کے کانوں تک پہونچا دی اور ہادی نے بغیر کسی فوری تاثر کے اس کا تجزیہ کر کے اس میں اپنی سرگذشت کو بھی شامل کر لیا تو اس نتیجے پر پہونچے کہ مِلّی کو بلا کر اس کے زخموں پر خود مرہم تسکین رکھیں اور کرامت سے بدلہ لینے کا پلان بھی بنا لیں۔

''مِلّی بیٹے'' اُنھوں نے سمجھایا ''میرا خون کھول گیا سن کر۔ اس حرام زادے فقیر کی اولاد نے

ایک سیّد زادے پر ہاتھ اُٹھایا ہے، یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے مجھے بھی اسی بد بخت نے معذور کیا ہے۔ میں کہتا ہوں اگر اُسے ایسی ہی چھوٹ ملتی رہی تو ہم شرفا کا جینا حرام کر دے گا- کچھ سوچنا چاہیئے ہمیں اس کے بارے میں''

''آپ ہی بتایئے نا کیا کروں- آپ کو تو بس گالیاں بکنا آتا ہے''

''اور تمہیں کیا آتا ہے؟ بس مار کھانا۔ مِلّی اگر تجھے گالیاں دینا بھی نہیں آتا تو مجھ سے سیکھ لے۔ میں کہتا ہوں تم بہت بڑے عقل مند ہو تو نوجوانوں کو اس کے خلاف اُکساتے کیوں نہیں- آخر وہ کون سا بڑا رستم زماں ہے''

''ہدّو چچا وہ بڑا ہوشیار ہے''مِلّی بولے''اُس نے دونوں محلّوں میں سب ہی انجمنوں کو محرم کا چندہ دے رکھا ہے اب کون اس سے زبردستی لڑائی مول لے گا''

''تم مول لوگے-تم'' ہادی نے کہا''اچھا بتاؤ کیا تم اس سے اپنی بے عزّتی کا بدلہ لینا چاہتے ہو۔ بتاؤ''

''ہاں بدلہ لینا چاہتا ہوں''

''تم پھر قسم کھاؤ جو اسکیم میں تمہیں بتانے جا رہا ہوں اُس کی بھنک کسی کو نہ دو گے''

''میں قسم کھاتا ہوں''مِلّی نے کہا''آپ کے سرِ عزیز کی قسم''

''ہاں ہاں- کیوں نہیں بیٹا'' ہادی بولے''میرے سرِ عزیز کی تو بڑی وقعت ہے نا تمہاری نظروں میں-اچھا کھالو قسمیں مگر یاد رکھو مِلّی جب تک اس حرام اللہّ ہر سے اپنی بے عزتی کا بدلہ نہ لوگے میرا سر واقعی بے وقعت رہے گا''

''اُفّوہ!''مِلّی بولے''آخر آپ بتاتے کیوں نہیں، کیا منصوبہ ہے آپ کا''

''تو سنو''ہادی رازداری سے بولے''اور اپنے کان ذرا آگے لاؤ میں کان ہی میں بتاؤں گا، کیوں کہ دیوار کے بھی کان ہوتے ہیں''

اس کے بعد ہادی نے اپنا منصوبہ مِلّی کے گوش گذار کرتے وقت تخت پر بچھی قالین کو ذرا سا ہٹا کر تکیہ کے نیچے رکھی ہوئی نوٹوں کی گڈّیوں کی ایک جھلک اُسے دکھائی پھر دس پندرہ سال پہلے محلّہ کے ایک رٹائرڈ کوتوال کے گھر سے چُرائے ہوئے ایک بلّم کی طرف اشارہ کیا جو کمرے کے ایک کونے میں دیوار سے لگا کھڑا تھا

''وہ بلّم دیکھو- دیکھا؟- بڑا قاتل ہے یہ- اس کی نوک زہر میں بجھائی ہوئی ہے۔ یہ افغانستان کے ایک قبائلی سردار نے مُنّا کوتوال کو تحفہ میں دیا تھا۔ میں تو اب تک درجنوں کتّوں کو اس سے ہلاک کر چکا ہوں۔بس لے جاؤ اس کا پھل نکال کے اور پھونک دو سالے کرامتوا کے پیٹ میں۔اگر ذرا

سا بھی چبھ گیا تو سمجھ لو قصّہ تمام ہے اس کا''

یہ پلان سن کر مِلّی کے بدن میں جھرجھری دوڑ گئی گھبرا کر بولے

''نہیں نہیں- یہ مجھ سے نہ ہوگا- آپ مجھے معاف رکھئے۔ مجھ سے قتل نہ کرایئے۔بس ہدّو چچا''مِلّی فوراً اُٹھ کر وہاں سے سرپٹ بھاگے اور ہادی''ابے سن تو سہی'' کرتے رہ گئے پھر تھوڑی دیر بعد خود سے بولے''سالہ- ہیز کا بچّہ''

★★★

کان پور میں انسپکٹر شاکر علی کی تحریک پر شیر علی نے اپنی حکمت عملی کا جو سہ زاویائی پلان بنایا تھا اس کے تحت انھوں نے قدیر اور ثریّا کی چٹ پٹ شادی کر کے ان دونوں کو گوا روانہ کر دیا اور خود جائس آپہونچے۔ جائس میں آنے کے بعد شیر علی کرامت کو تلاش کرتے ہوئے اس کے چھوٹے سے گھر پہونچ گئے۔کرامت کا مکان تو وہی پرانا پیال کے چھپّروں اور کچّی دیواروں والا تھا مگر کرامت نے اس میں آسائش کی کچھ چیزیں فراہم کر کے ڈال دی تھیں۔دوپہر کا وقت تھا اُس کی پڑوسن بٹّن اس کے لئے دن کا کھانا رکھ کر جا چکی تھی کہ اتنے میں خیراتی نے آکر اُسے آواز دی

''بابا- داروغہ جی آئے ہیں''

کرامت کو اس وقت تیز بخار تھا وہ چادر اوڑھے اور آنکھیں بند کئے چارپائی پر لیٹا تھا کہ اتنے میں خیراتی نے آکر اُس کا شانہ ہلایا اس نے چارپائی پر لیٹے لیٹے دروازے پر نظر ڈالی تو وہاں شیر علی کو اپنی پولیس کی وردی میں کھڑا دیکھا۔اُس وقت اچانک شیر علی کو وہاں دیکھ کر اس کا دل سن سے ہو گیا، تیز بخار میں دماغ تو ماؤف ہو ہی رہا تھا پھر ایک لمحہ سے بھی کم وقفہ میں اتنی باتیں اس کے دماغ میں گھسیں کہ اس کا دماغ چکر گنّی کھا گیا اور آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا- اُدھر دھڑکتے ہوئے دل نے بھی سوالات کی بھرمار کر دی- یہ یہاں کیوں آئے ہیں؟- کیا مجھے گرفتار کرنے آئے ہیں۔عزیز بیگ سے لے کر سونا والے سیٹھ اور خود شیر علی کے سر پر ڈنڈے سے وار کرنے کے سارے جرائم تیزی سے چلتی ہوئی فلم کی طرح اس کی نظروں میں دوڑ گئے-یہ اگر مجھے پکڑ لے گئے تو سونے کے ان بسکٹوں کا کیا ہوگا جو اس کے پاس روشن کی امانت کے طور پر رکھے ہیں۔یہ امانت وہ روشن تک کیسے پہونچا سکے گا وہ تو اپنی نانی کے پاس اُنّاؤ میں ہے انھیں خیالات میں وہ الجھا تھا کہ شیر علی نے باہر سے آواز دی

''ارے بھائی شیخ جی- ذرا باہر آیئے نا''

بیمار اُجاڑ صورت لئے باہر نکل کر کرامت اخلاقاً ذرا سا مسکرایا پھر سلام کر کے پوچھا

''وارنٹ گرفتاری ہے کیا؟''

''جی نہیں'' شیر علی خلاف معمول مسکرائے ''خوش خبری ہے''

''خوش خبری؟'' کرامت نے تعجب سے پوچھا ''میرے لئے یا آپ کے لئے؟''

''ہم دونوں کے لئے'' شیر علی اب بھی خوش نظر آ رہے تھے

''بتائیے'' کرامت نے پوچھا

''مگر کیا آپ مجھے گھر کے اندر چلنے کو نہ کہیں گے، سب کچھ یہیں کھڑے کھڑے پوچھئے گا''

کرامت نے شیر علی کو اندر لے جا کر چارپائی پر بٹھایا مگر خود کھڑا رہا تو شیر علی نے اس کو ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس چارپائی پر بٹھالیا

''ساڑھو بھائی'' شیر علی بولے ''تمہیں تو بخار ہے''

''ہاں۔ٹھیک ہو جاؤں گا'' کرامت بولا ''آپ خوش خبری سنائیے شاید یہی دوا ہو جائے''

''پہلی خوش خبری تو یہ ہے کہ میں نے اپنی بیٹی کی شادی قدیر کے ساتھ کر دی اور وہ دونوں ہنی مون منانے گوا گئے ہیں'' شیر علی نے بتایا

مگر کرامت نے اس اطلاع پر کوئی خوشی کا اظہار نہیں کیا صرف ''اچھا'' کہہ کر چپ ہو گیا

''اور دوسری خوش خبری خاص تمہارے لئے ہے۔پوچھو کیا؟''

''بتائیے''

''دونوں بچوں کی شادی کرنے کے بعد میں نے اپنی شادی کا خیال ترک کر دیا ہے'' شیر علی نے کہا

''مگر جناب بھلا اس میں میرے لئے کون سی خوش خبری ہے'' کرامت نے پوچھا

''وہ خوش خبری یہ ہے کہ اب تم زرّیں کے ساتھ عقد کر سکتے ہو۔میں الگ ہو گیا''

اس خوش خبری پر بھی کرامت نے مسرّت کا اظہار نہیں کیا بلکہ سر جھکائے کچھ دیر سوچتا رہا

''کیوں۔اب کیا سوچتے ہو؟'' شیر علی نے کہا ''یار کم از کم میرا شکریہ تو ادا کر دو''

کرامت کے ہونٹوں پر نقلی مسکراہٹ آئی ''سمجھ میں نہیں آتا کیا کہوں۔ بھائی صاحب اگر میں آپ کی اس بات کا یقین کر بھی لوں تو بھی مجھ بدنصیب کی قسمت میں یہ خوشی نہیں لکھی۔اپنا حال تو بھائی صاحب ایسا ہے جیسے آسمان سے گرے اور کھجور میں اٹک گئے''

''یعنی؟۔میں مطلب نہیں سمجھا کرامت بھائی''

''میں سمجھتا ہوں'' کرامت بولا ''آپ نے تو میرے حق میں زرّیں کا خیال چھوڑ دیا۔مگر یہاں ایک بہت پرانے اور انتہائی پاجی قسم کے رقیب سے سابقہ پڑ گیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس سے جیت پانا میرے لئے ناممکن ہے''

''کون ہے وہ؟'' شیر علی نے پوچھا

''اس کا نام سیّد ہادی ہے'' کرامت نے بتایا ''وہ یہاں کا ایک پرانا زمیندار ہے جو اگر نہ پیدا ہوتا تو شیطان لاولد رہتا۔اُسی کے گھر میں میری اور زرّیں اور اس کی بڑی بہن کی پرورش ہوئی تھی۔وہ بڑا کینہ پرور اور بدنفس آدمی ہے۔ چلنے پھرنے سے معذور ہے بیسا کھی لے کر چلتا ہے پھر بھی زرّیں کی تمنّا میں مرا جاتا ہے۔خیر چھوڑیئے اس کی بات اور یہ بتایئے کہ کیا آپ خوش خبری والی بات بتانے کے لئے اتنی دور سے یہاں آئے ہیں''

''نہیں ساڑھو بھائی'' شیر علی ہنس کر بولے ''میں دراصل تمہارے رقیب کی تلاش میں یہاں آیا ہوں''

''کیا؟'' کرامت نے تعجب سے پوچھا ''میرے رقیب کی تلاش میں؟''

''تعجب نہ کرو ساڑھو بھائی'' شیر علی نے کہا ''میں اپنے ایک دوست کی مدد میں یہاں آیا ہوں اور وہ سیّد ہادی کو تلاش کر رہے ہیں''

''کس لئے؟''

''یہ بات ابھی مت پوچھو'' شیر علی نے کہا ''جب ضرورت سمجھوں گا تو تمہیں بتاؤں گا اور ہوسکتا ہے کہ تمہاری مدد کی بھی ضرورت پڑے''

★★★

سیّد ہادی اپنے کمرے میں تخت پر لیٹے تھے اور دونوں پیروں کے پاس تیل سے چیکٹ ہوئی دو تکلیاں رکھی تھیں۔اُن کے سامنے داروغہ شیر علی اپنی یونیفارم سے مزیّن ایک کرسی پر بیٹھے تھے۔سید ہادی سے بولے

''چلئے یہ بات تو طے ہو گئی کہ مجھے کہ مجھے جن سیّد ہادی حسن صاحب کی تلاش تھی وہ آپ ہی ہیں۔اس لئے اگر آپ خود اپنی نیم پاگل بہو کی کہانی نہ سنا سکیں تو میں ہی پورا قصّہ بیان کروں''

''کیا۔کیا۔کیا؟۔کیا فرما رہے ہیں آپ؟'' ہادی چونک کر بولے

''میں عرض کر رہا ہوں آپ کی بہو کے بارے میں جسے آپ جوگی رمپوری کی زیارت گاہ لے گئے تھے۔یہ حوالہ اگر ناکافی ہو تو مزید تفصیل پیش کروں'' شیر علی بولے

ایک پولیس افسر کے منھ سے نیم پاگل بہو کی کہانی اور جوگی رمپوری کی زیارت کی بات سن کر ہادی کے چہرے پر پسینہ آ گیا۔چند منٹ تک اپنی ڈھیلی تہمد برابر کرتے رہے مگر کچھ بولے نہیں

''جناب میں سمجھ نہیں پایا آپ کیا کہنا چاہتے ہیں'' وہ تھوڑی دیر بعد بولے ''پاگل بہو- ہونہہ- ابھی چندروز ہوئے اس کی شادی ہوئی ہے''

''میں آپ کو سمجھاتا ہوں'' شیر علی بولے ''غور سے سنئے گا اور جہاں پر نہ سمجھ میں آئے تو فوراً ٹوک دیجئے گا- ہاں تو قبلہ ہادی صاحب- آپ اپنی بیمار بہو اور بیٹی کو لے کر نجیب آباد کے پاس درگاہ جوگی رمپوری زیارت اور منّت کی غرض سے تشریف لے گئے تھے۔ آپ کی بہو دماغی طور پر کم زور یا قدرے معذور تھی۔ زیارت کی واپسی پر نجیب آباد کے اسٹیشن پر آپ نے جان بوجھ کر یا شاید اس سے چھٹکارا پانے کے لئے ایک غلط ٹرین پر اُس کو بٹھا دیا یہ گاڑی امرتسر جانے والی پنجاب میل تھی۔ پھر نجیب آباد کی میونسپل کمیٹی میں اس کی فوتی درج کرا کر سرٹی فکیٹ حاصل کرلیا کہ وہ سانپ کے ڈس لینے سے مری ہے۔ دراصل مارگزیدہ اُسی جوار کی کوئی لڑکی تھی جسے اُس کے گھر والوں نے جوگی رمپوری کے قبرستان میں دفن کردیا اور اس کی فوتی آپ نے اپنی بہو کے نام پر لکھا دی اور اپنے گھر واپس آ کر آپ نے اپنی بہو کی موت کے جملہ رسوم یکے بعد دیگرے ادا کر کے فرصت حاصل کرلی''

''ارے واہ'' ہادی نے استہزا کیا ''بڑھیا کہانی ہے- پھر کیا ہوا؟''

''تو صاحب- آپ کی بہو بے چاری بلاٹکٹ سفر کرتی ہوئی لدھیانہ پہونچ گئی۔ رات میں کسی نے ٹکٹ کو نہ پوچھا لیکن لدھیانہ اسٹیشن پر وہ ٹرین سے اتار دی گئی۔ وہاں کی پولیس نے اس بے سہارا لڑکی کی مدد کی۔ لڑکی کے ہاتھ میں جوگی رمپوری درگاہ کا کڑہ جس پر حضرت علی کرم اللہ کا نام لکھا تھا دیکھ کر اُسے مسلمانوں کی بستی مالیر کوٹلہ پہونچا دیا۔ مالیر کوٹلہ میں میرے دوست حبیب شاہ نے اس بے یار و مددگار لڑکی کو سہارا دیا وہ بے چاری خود تو کچھ نہ بتا سکی مگر اس کے ہاتھ کے کڑے نے رہنمائی کی۔ درگاہ نجف ہند جوگی پورہ کے رجسٹر اور نجیب آباد میونسپلٹی کے کاغذات کی چھان بین سے معلوم ہوا کہ وہ لڑکی جائس ضلع رائے بریلی کے رہنے والے سیّد ہادی حسن یعنی حضور والا کی بہو کنیز فاطمہ تھی اور جس لڑکی کو جوگی رمپوری میں سانپ نے ڈسا تھا وہ کوئی اور تھی۔ آپ کی بہو کو تین مہینے کا حمل تھا دن پورے ہونے پر وضع حمل کے وقت وہ بے زبان لڑکی ایک زندہ تندرست اور پھول جیسا بچہ پیدا کرنے کے بعد خود زندہ نہ رہ سکی۔ میرے دوست حبیب شاہ وہ بچّہ یعنی آپ کا پوتا لے کر یہاں آئے ہیں۔ بتایئے کیسی کہانی تھی۔''

ہادی جو بڑی دیر سے اِدھر اُدھر کروٹیں بدل رہے تھے یکبارگی بیسا کھیاں ٹیک کر کھڑے ہو گئے ''میں رفع حاجت کے لئے اندر جاؤں گا''

''رفع حاجت لمبی ہوگی- یا-'' شیر علی نے پوچھا

مگر ہادی بغیر جواب دیئے اندر بھاگے

''قبلہ ذرا جلدی فراغت کیجئے گا- میں انتظار کر رہا ہوں''

ہادی جلدی واپس آ گئے ان کے ہاتھ میں چنوٹی اور بٹوہ تھا تخت پر بیٹھنے کے بعد بٹوہ شیر علی کے آگے رکھ دیا

''لیجئے پہلے ڈلی تمبا کو کھایئے- اور چائے شربت کی خواہش ہو تو...''

''جی نہیں- شکریہ'' شیر علی بولے

''خیر'' ہادی بولے ''اب یہ بتایئے کہ آپ کی لندھور بن سعدان والی داستان ختم ہوئی یا ابھی کچھ باقی ہے''

''ختم ہوئی'' شیر علی نے کہا ''لیکن آپ کے نزدیک اگر کچھ باقی رہ گیا ہو تو آپ پوری کر دیجئے''

''کر دوں گا۔ ضرور کر دوں گا'' ہادی دبنگی سے بولے ''دیکھئے یہ ناول نوٹنکی والی بے سر و پا کہانی بچّوں ہی کو اچھی لگے گی مجھ پر ان من گڑھنت باتوں کا کوئی اثر نہ ہوگا۔ سمجھ گئے آپ؟- اور یاد رکھئے یہ فرضی حکایت سنا کر آپ جو مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں وہ ٹھیک نہیں اور نہ ان باتوں کا آپ کے کار منصبی سے کوئی تعلق ہے۔ میری پہونچ دلّی تک ہے میری ذرا سی شکایت پر آپ کی نوکری چٹکی بجاتے میں چلی جائے گی۔ ہاں''

''تو آپ کو ساری باتوں سے انکار ہے؟'' شیر علی نے پوچھا

''اجی بس رہنے دیجئے جناب'' ہادی تنک کر بولے ''آپ کے دوست- کیا نام ہے ان کا- حبیب شاہ- یہ مجھے نمبری ٹھگ معلوم ہوتے ہیں۔ ایک فرضی کہانی کا جال پھیلا کر آپ لوگ مجھے پھنسانے آئے ہیں- داروغہ صاحب میں ایک بار پھر بتا دوں کہ میری بہو سانپ کاٹنے سے مری ہے اور اُسے میں نے جوگی رمپوری کے قبرستان میں دفن کر دیا تھا۔ اس بات کی تصدیق کے پکّے کاغذات آپ دیکھنا چاہیں تو حاضر کروں۔ اس کے آگے مجھے کچھ اور نہیں کہنا- اچھا ہوا کہ آپ حبیب شاہ کو لے کر نہیں آئے ورنہ ان کی ساری قلعی یہیں کھل جاتی''

''اور جو بچّہ حبیب شاہ اپنے ساتھ لائے ہیں آپ اُسے تو لے لیں گے؟'' شیر علی نے پوچھا

''کیا؟'' وہ تڑاک سے بولے ''میں نے کوئی یتیم خانہ کھول رکھا ہے کیا؟''

''میں آپ کے بیٹے سے ملنا چاہتا ہوں'' شیر علی نے کہا

''کیوں ملنا چاہتے ہیں؟'' ہادی بولے ''دیکھئے جناب بہتر ہے کہ آپ اپنا اور میرا وقت ضائع نہ کریں اور نہ ہی یہ فضول کہانی سنا کر میرے بیٹے کو کسی مخمصے میں ڈالئے گا- سمجھ گئے؟''

شیر علی وہاں سے اُٹھ کر چلے گئے تو ہادی نے وقار کو پکارا

''وقّن- وقّن بیٹے۔ ادھر آؤ''

یہ بات ہادی نے وقار کو خوب اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ شیر علی اور ان کے پنجابی دوست حبیب شاہ اگر کوئی بچّہ لے کر آئیں اور اُسے وقار کا بتا کر اُسے دینا چاہیں تو وہ بچّے کو قطعی ہاتھ نہ لگائے ورنہ بلا سبب کسی مصیبت کے دلدل میں پھنس جائے گا مگر باپ سے وعدہ کرنے کے باوجود دوسرے دن وقار جب ایک چھوٹے سے بچّے کو اپنی گود میں لئے خوشی خوشی ہادی کے روبرو آیا تو ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی وہ سمجھ گئے کہ سادہ لوح بیٹا داروغہ شیر علی کے بہکاوے میں آ گیا ہے۔مگر اب وہ کر بھی کیا سکتے تھے۔اس وقت بیٹے کو ڈانٹنے پھٹکارنے سے کوئی فائدہ نہ تھا اس لئے مصلحتاً اپنے غصّہ کو دل میں دبا کر ہادی مسکرائے تو وقار قوی دل ہو کر بولا

''دیکھئے ابّا-یہ بالکل آپ کی شکل پر گیا ہے نا؟''

''یہ کون ہے؟'' ہادی نے لہک کر پوچھا ''نجّو بھائی کا نواسہ ہے کیا؟''

''ارے یہ آپ کا پوتا ہے'' وقار نے بتایا

''پوتا؟'' ہادی اچھل پڑے ''وقّن تو گھاس تو نہیں کھا گیا۔ابے ابھی تو جمعہ جمعہ آٹھ دن بیاہ کو ہوئے ہیں اور یہ بچّہ کہاں سے ٹپک پڑا-یہ کیا پہلے کا ہے؟''

''ہاں ابّا-یہ پہلے کا ہے'' وقار نے کہا

''اچھا!-پہلے کا ہے؟-ارے واہ واہ واہ-لاؤ بھائی لاؤ-ادھر لاؤ برخوردار کو ذرا میں بھی تو دیکھوں پیاری پیاری صورت'' ہادی بناوٹی خوشی میں چہکنے لگے

وقار نے بچے کو ان کے آگے تخت پر لٹا دیا اور خود کھڑا ہو کر مسکرانے لگا

''اہاہاہا-کیسی موہنی صورت ہے میرے لختِ جگر کی۔ارے مکو مکو مکو-'' پھر منہ سے چمکارنے پچکارنے کی مختلف آوازیں نکالنے کے بعد وقار سے پوچھا

''سنو وقّن-کیا سچ مچ یہ میری صورت پر گیا ہے؟''

''ہاں ابّا''

''اچھا تو ایک کام کرو'' وہ بولے ''جا کر بہو کو یہاں بلا لاؤ-میں اپنے ہاتھوں سے بچّے کو بہو کے سپرد کروں گا۔ارے بھائی اس شیر خوار کی پرورش اُسی کو تو کرنا ہے-یہ میرا پھندنوا۔چندنوا''

وقار کو یہ اُمید قطعی نہیں تھی کہ ابّا اتنی آسانی سے رام ہو جائیں گے اور بچے سے خوش ہو کر اُسے بہو کو سپرد کرنے کا خیال اُن کے ذہن میں آئے گا۔اس لئے جب ہادی نے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ بہو کو بلالانے کے لئے کہا تو وقار دل میں خوش ہو گیا اور بچّے کو وہیں تخت پر لیٹا چھوڑ کر لاڈلی کو بلانے جانے لگا

''ابھی بلا کر لاتا ہوں ابّا''

لاڈلی کو ڈھونڈنے اور بلا کر لانے میں تھوڑی دیر ہوئی۔جب وقار لاڈلی کو اپنے ساتھ لے کر وہاں آیا تو اس وقت ہادی بلا وضو کئے نا وقت نماز پڑھنے میں مصروف ہو چکے تھے وقار نے بچّے کو کمرے میں چاروں طرف تلاش کیا لیکن وہ آس پاس کہیں دکھائی نہ دیا۔ہادی حقیقتاً کوئی نماز نہیں پڑھ رہے تھے کیونکہ وقار ان کی نماز ختم ہونے کے انتظار میں مسہری پر بیٹھا بڑی بے چینی سے نماز کی رکعتیں گن رہا تھا اور ہادی تڑا تڑ سجدوں پر سجدے کئے جا رہے تھے یہاں تک کہ اٹھارویں سجدے پر وقار کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔اس نے سجدے میں پڑے ہوئے ہادی کی ٹوٹے کولھے والی ٹانگ گھسیٹ لی

''ابّا'' وہ بڑی زور سے چیخا ''یہ کیسی نماز ہے جو ختم نہیں ہوتی''

اس وقت ہادی سجدے میں پڑے تھے اور وقار کے چلّانے اور ٹانگ گھسیٹنے پر بھی اسی طرح سجدہ ریز رہے۔تقریباً دس منٹ تک سجدہ میں رہنے کے بعد اُنھوں نے سر اُٹھایا اور بولے ''کیا ہے وقّن؟-کیوں نماز میں خلل ڈال رہے ہو بیٹا-آخر کیا بات ہے؟''

''بچّہ کہاں ہے؟'' وقار تقریباً روندھا ہو کر بولا

''بچّہ؟-اوہ'' وہ بڑی سادگی سے بولے ''ایک مرغی کے بچّے کی خاطر تم نے میری عبادت کو بھنگ کیا اور خود بھی گنہگار ہوئے-لاحول ولاقوۃ''

''مرغی کا بچّہ نہیں-میرا بچّہ'' وقار غصّہ میں چیخ پڑا

''ایں-ایں-ایں'' وہ بولے ''ابے-ابے۔یہ تو آنکھیں کس کو دکھا رہا ہے۔بہو تم بتاؤ یہ کس بچّے کی بات کر رہا ہے۔کیا تمہارا کوئی بچّہ بھی تھا؟''

لاڈلی کے بولنے سے پہلے ہی وقار لجاجت سے بولا

''ابّا-خدا کے لئے-یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے۔بتائیے آپ نے بچّے کو کہاں چھپایا ہے''

''ابے الّو کی دم-میں تیرے بچّے کو کیا جانوں۔مجھے نہیں معلوم۔بس اب چلا جا میرے

سامنے سے۔نالائق ابھی مجھے قضائے عمری کی تین سوستّر رکعت نماز پڑھنی ہے“
یہ کہہ کر ہادی پھر ”اللہ اکبر“ کہہ کر نماز میں مشغول ہو گئے۔

★★★

بچّے کو غائب کرنے کا کوئی منصوبہ ہادی نے پہلے نہیں بنایا تھا بلکہ شاید قدرت ہی نے وہ موقع انھیں فراہم کر دیا کہ پلک جھپکتے میں بچّہ ٹھکانے لگ جائے۔ٹھیک اسی وقت ان کی کھڑکی کے نیچے گلی میں ایک بڑی بلند آواز والا ”اوگھڑ فقیر“ آواز لگانے لگا ”کچھ بھیج دے بچّہ-اپنے بال بچّوں کی خیرات ”اوگھڑ بابا“ کو دے دے۔تیرے بچّے سلامت رہیں گے-“ ہادی نے فقیر کی صدا سنی مگر ان سنی کر کے اسی طرح لیٹے لیٹے یہ سوچتے رہے کہ وقّن کی اس ”ناجائز“ اولاد کا وہ کیا حساب کتاب کریں-اوگھڑ بابا اس بار بالکل کھڑکی کے نیچے آ کر اور اونچی آواز میں چلاّیا

”اپنے پوتے کی خیرات صدقہ دے دے بچّہ-اولنگڑی ٹانگ والے نمبردار-لنگڑ بھائی“

ہادی لیٹے لیٹے یک بیک اُٹھ بیٹھے ”یہ کیا حرامی پن ہے“ وہ بڑبڑائے اور بیساکھی لے کر اُٹھے اسی طیش میں کھڑکی سے جھانک کر اوگھڑ فقیر کو نپی تلی گالی دینے جا رہے تھے کہ فقیر ان کو کھڑکی میں دیکھتے ہی زہر خند کرتا ہوا بولا

”آجاؤں مالک اوپر؟“

سر پر ایک میلا کنٹوپ اور گودڑ کپڑوں میں ایک لمبی چوڑی جھولی کندھے پر ڈالے اور ہاتھ میں موٹا سا ڈنڈا لئے اوگھڑ کو ہادی نے صرف سر کے اشارے سے اندر آنے کو کہا

”تم لکڑ سونگھا معلوم ہوتے ہو-بچّوں کو پکڑ لے جاتے ہو؟“ ہادی نے اس کے آتے ہی پوچھا

”ارے نہیں نہیں مالک“ وہ گڑگڑایا ”میں ایک گریب بھک منگا ہوں۔اوگھڑ بابا“

”تو پھر اتنی لمبی جھولی لے کر کیوں گھومتے ہو۔کیا رکھتے ہو اس میں دکھاؤ تو ذرا“

”آپ بادشاہ سلامت ہیں-ایک چٹکی پسان اپنے پھلوا کے صدقے میں فقیر کو دے دیں“

اوگھڑ نے تخت پر لیٹے ہوئے بچّے کی طرف اشارہ کیا اور ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

”پہلے تم اس جھولے کی تلاشی اور اپنی ننگا جھوری دو“

ہادی نے اس کے کندھے سے جھولی گھسیٹ لی اور ہاتھ ڈال کر اس کے اندر سے ایک بالکل نیا ولایتی چمکدار پستول نکالا ”یہ کیا ہے بے؟“ اُنھوں نے پوچھا

”ہی ہی ہی!“ اوگھڑ ہنسنے لگا ”یہ کھلونا ہے مالک بچّوں کا کھلونا۔ہی ہی ہی“

”سالے-یہ کھلونا ہے؟“

”ہاں ممبردار“ وہ بولا ”آپ کا جی چاہے تو رکھ لیجئے اپنے پُھلوا کے لئے“

ہادی نے پستول کو خوب اچھی طرح الٹ پلٹ کر دیکھا۔اس کا وزن اور ساخت وغیرہ کو دیکھ کر سمجھ گئے کہ یہ کھلونا نہیں بلکہ اصلی پستول ہے فارن میڈ

”چلو رکھ لیا ہم نے“ وہ بولے ”مگر چوٹّی کے-تو پہلے یہ بتا کہ مجھے لنگڑی ٹانگ والا لمبردار کیوں کہا تھا۔کس کے سوجھانے پر کہا تھا-اور بیٹا میرے پوتے کی خیرات مانگنے کی بات تجھے کس حرامزادے نے سکھائی تھی-بول-بول“

”میں کیا جانوں مالک“ وہ گڑگڑانے لگا ”مجھے تو یہیں پر کسی آدمی نے یہ بات بتائی ہے، پر مالک کرودِھت نہ ہوں آپ بُرا مانتے ہوں تو اس گریب کو چھما کر دیجئے میں آپ کا سیوک ہوں“

”اگر تو میرا سیوک ہے“ ہادی نرم ہوئے ”تو بتا میری کیا سیوا کرے گا؟“

”آپ جو حکم دیں سرکار“

”حکم دیتا ہوں-لیکن اگر تو نے نہ کیا تو تیری کھال میں بھوسہ بھروا دوں گا۔سمجھ گیا؟“

”کروں گا“

”تو دیکھ“ ہادی دھیرے سے بولے ”یہ بچّہ ہے-اسے اٹھا لے جا اور لے جا کر تھانے میں جمع کر دے۔کہنا دو اجنبی آدمی بچّے کو برگدّی تالاب کے کنارے ایک جھاڑی میں چھپا کر بھاگ گئے تھے میں اُٹھا لایا کہ کہیں سیار بلار نہ کھا جائیں-اور لے یہ پچاس کا نوٹ تو رکھ لے“

”بہت اچھا مالک“ وہ ہاتھ جوڑ کر بولا ”پر کہیں دروگہ جی مجھے نہ دھر لیں“

”کیوں دھر لیں گے؟“ ہادی نے کہا ”تو نے تو اچھا کام کیا-لے اب جلدی سے اُٹھا لے بچّے کو اور جھولی میں ڈال کر یہاں سے پھوٹ لے-چل جلدی کر“

اوگھڑ بابا نے بچّے کو احتیاط سے جھولی میں رکھا اور وہاں سے چل دیا۔جاتے جاتے ہادی بولے ”اور بیٹا-اگر مجھ سے استادی کی چال چلے نا تو خیریت نہ سمجھنا اپنی“

اس کے دو تین منٹ بعد وقار لاڈلی کو لے کر وہاں آیا تو ہادی نماز میں مشغول ہو چکے تھے۔

★★★

اس رات کو ہادی جلدی سو گئے اور اپنے حساب سے بڑی گہری نیند سوئے جس میں وہ الٹے سیدھے مختلف قسم کے خواب بھی دیکھتے رہے مگر جس خواب پر وہ چونک کر جاگ اُٹھے وہ یہ تھا کہ ایک

بن مانس دبے پاؤں اُن کے پاس آیا پھر تخت پر بچھی توشک اور چادر کا کونا سرکا کر تکیہ کے نیچے سے روپوں کی گڈیاں کھسکانے لگا۔ ہادی تھوڑا سا کنمنانے کے بعد منھ سے کوئی آواز نکالنے ہی جا رہے تھے کہ بن مانس نے جست لگائی اور ان کا گلا تھام لیا پھر ایک بڑی تولیہ ان کے منھ پر ڈال کر اُسے حلق میں گھسیڑنا شروع کیا اور یکے با دیگرے کئی اور کپڑے اسی طرح حلق میں ٹھونستا گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہادی ہاتھ پیر جھٹکنا چھوڑ کر ساکت ہو گئے۔ بن مانس کھڑکی سے کود کر بھاگ گیا۔

بن مانس تو ہادی کو مردہ سمجھ کر بھاگ گیا تھا مگر مقدر میں ان کی زندگی کے ابھی کچھ دن باقی تھے کیونکہ چند ہی سکنڈ بعد دالان کی طرف کھلنے والے دروازے سے جو آدمی دبے پاؤں چوروں کی طرح پتہ نہیں کس مقصد سے ہادی کے کمرے میں آیا تھا وہ انھیں اس عبرت ناک حالت میں پڑا دیکھ کر چیخ اُٹھا

''ابّا - یہ کیا ہوا''

یہ وقار تھا جس نے لگاتار شور مچایا اور جلدی جلدی ہادی کے حلق اور منھ میں ٹھنسے ہوئے کپڑے نکالتا گیا۔ ہادی کچھ بول نہیں سکتے تھے مگر دہشت کے مارے پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ وقار نے صراحی سے گلاس میں پانی انڈیل کر اُنھیں پانی پلایا اس بیچ لاڈلی بھی وقار کی آواز سن کر وہاں آ گئی تھی۔ ہادی تخت پر چت پڑے تھے اور وقار دھیرے دھیرے ان کے گلے کو سہلاتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد وقار کو یہ اطمینان ہو گیا کہ ابّا مرے نہیں زندہ ہیں تو پوچھا

''کون تھا ابّا - بتایئے کس نے آپ کے ساتھ یہ کیا ہے''

مگر ہادی کچھ بول نہیں سکے - پتہ نہیں گلے کی تکلیف سے یا حد درجہ خوفزدہ ہو کر بہر حال ایک بار پھر اپنی موت کو چرکہ دینے میں وہ کامیاب ہو گئے تھے۔

ہادی پر کسی نامعلوم آدمی کے وحشیانہ اور قاتلانہ حملہ کی چرچا صبح ہی صبح پورے قصبہ میں پھیل گئی اور جلد ہی حملہ آور کی پہچان بھی کر لی گئی کیونکہ ماجد عرف مِکّی میاں جس مضطربانہ انداز میں اپنی سانس پُھلا پُھلا کر اس واقعہ کی تفصیل لوگوں کو بتا رہے تھے اس سے ان کی بے چینی اور چشم دید گواہی کی تصدیق میں حملہ آور کو پہچان لینا کوئی مشکل نہ تھا

''جیسے ہی وہ ہدّو چچا کی کھڑکی سے کود کر بھاگا میں نے اُسے زور سے للکارا اور دوڑا اس کو پکڑنے کے لئے بس سمجھو پکڑ ہی لیا تھا مگر قسم کلام پاک کی اگر میری ہوائی چپّل کا پٹّہ نہ ٹوٹ جاتا تو میں اس کمینے حرامزادے کو بھاگنے نہ دیتا۔ کمر تو میں نے تھام لی تھی اس کی بس کیا بتاؤں وہ مجھ سے تگڑا بھی تھا اور چپّل کے ٹوٹتے ہی میں بھی پھسل کر گر پڑا۔ بس سٹک لیا وہ۔ یہ دیکھو اسی دھر پکڑ میں میرا کرتا بھی پھٹ گیا ہے اور اس کے پاس سے پچاس پچاس کے یہ دو نوٹ بھی زمین پر گر پڑے - میں کہتا ہوں یہ روپے ضرور ہدّو چچا کے ہوں گے شاید وہ اسی لئے چوری کرنے آیا تھا - نہ جانے سالا کتنا لے گیا۔''

''یار مِکّی تم بولتے بہت زیادہ ہو - یہ نہیں بتاتے کہ تم نے اُسے پہچان بھی لیا کہ نہیں'' کسی نے پوچھا

''کیوں نہیں - ایکدم پہچان لیا ہے'' مِکّی بولے

''کون تھا؟'' کئی آوازیں آئیں

''کون ہو سکتا ہے؟ - وہی سالا نو دولتیا - کرامت - اور کون ہوگا'' مِکّی نے صاف صاف نام بتا دیا

''ارے! - کرامت علی؟'' لوگوں نے تعجب سے پوچھا

''جی ہاں - وہی سالا کفن چور'' مِکّی نے مزید وضاحت کر دی اپنی بے عزتی کا بدلہ جو لینا تھا

''لیکن مِکّی بھائی - یہ تو بتایئے کہ آپ اتنی رات میں اس طرف کیا کرنے گئے تھے'' ایک نے پوچھا

''مِکّی بھائی گھر سے یہ دیکھنے کو نکلے تھے کہ چاندنی کتنی دور تک پھیلی ہے'' دوسرے نے مذاقاً کہا

''تو کیا اماوش کی رات میں چاندنی خاص انھیں کے لئے نکلتی ہے'' تیسرے نے ردّا جمایا تو سب ہنس پڑے

''اُفّوہ بھائی'' مِکّی جز بز ہوئے'' ارے میں اس طرف سے ہو کر اپنے گھر جا رہا تھا''

''کل رات چودھرانہ محلّہ میں نوٹنکی ہو رہی تھی نا'' ایک اور بولا ''وہی دیکھنے گئے ہوں گے''

مِکّی نے اُسے گھور کر دیکھا ہی تھا کہ پھر ایک آواز آئی

''یار کمال کی بات تو یہ ہے کہ اندھیرے میں مِکّی بھائی نے اُسے پہچان کیسے لیا''

''یار وچمگادڑ بھی تو اندھیرے میں دیکھ لیتا ہے'' کوئی بولا

لوگوں کے مذاق اور بولیوں سے تنگ آ کر مِکّی وہاں سے بُد بُداتے ہوئے چلے گئے۔

''سالے سب کے سب ہمیں کو گھسیٹنے لگے''

وقار نے اُس رات پوری طرح باپ کی خدمت کی۔ دو تین گھنٹوں کی تکلیف اور ذہنی خلفشار کے بعد ہادی ٹھیک ہو گئے لیکن اس قابل نہیں تھے کہ کچھ بول سکیں یا کسی کو کچھ بتا سکیں البتہ ہوش میں آنے کے بعد اُن کی نظروں میں وہی دوپہر والا اوگھڑ بابا برابر گھومتا رہا اگرچہ اس کی صورت وہ نہیں دیکھ پائے تھے لیکن واقعاتی کیفیت سے اُنھوں نے جو نتیجہ اخذ کیا وہ یہ تھا کہ حملہ آور اوگھڑ بابا تھا

★ ★ ★

تصویر کے ایک رخ میں اس رات ہادی کے ساتھ حرکت مذبوحی کا سانحہ فِٹ تھا تو دوسری

طری اسی رات کوکرامت علی، داروغہ شیر علی اُن کی پنجابی دوست حبیب شاہ مقامی پولیس آفیسر پنڈت برہم دت کی طرف سے ڈاک بنگلہ میں کھانے پینے کی ایک نجی دعوت میں دیر رات جاگنے اور باتیں کرنے کی تصویر لگی تھی۔ انسپکٹر برہم دت جائس کے تھانہ انچارج اور شیر علی و حبیب شاہ کے دوستوں میں تھے۔ شیر علی نے کرامت کو بھی دعوت میں بلا لیا تھا۔ کھانے کی میز پر یہ لوگ آج دوپہر کے اس واقعہ پر ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے جس میں اوگھڑ فقیر کو ہادی کے گھر سے ایک شیر خوار بچّہ ملا تھا۔ شیر علی نے کہا

''یار برہم دت تم تو سچ مچ بہروپئے ہو اوگھڑ فقیر کا ایسا بھیس بنایا کہ کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ اس بہروپ میں ایک پولیس آفیسر چھپا ہے''

''جی ہاں شیر علی صاحب- بندہ ایسے ایسے نہ جانے کتنے کھیل کر چکا ہے، آپ کو یقین نہ آئے گا میں نے الہ آباد کے کنبھ میلے میں ایک سادھو کا بھیس بنا کر ایک مفرور ملزم کو پکڑا تھا جو خود بھی سادھو کے بھیس میں تھا''

''مطلب یہ ہوا کہ آپ باباؤں کا بھیس بدلنے میں استاد ہیں'' حبیب شاہ ہنس کر بولے

''خیر سنئے ہم لوگوں نے جو پلان بنایا تھا ہو بہو ویسا ہی ہوا بھی- ہادی صاحب نے مجھے اوگھڑ بابا ہی سمجھا میں تو ان تک اس خیال سے گیا تھا کہ دیکھوں پوتے کا صدقہ دیتے وقت ان کا کیا طرز عمل رہتا ہے مگر وہاں مجھے بڑی حیرت اس وقت ہوئی جب اُنھوں نے بچّہ مجھے دے کر یہ کہا کہ میں اسے لے جا کر تھانے میں جمع کر دوں اس کام کے لئے آن حضرت نے مجھے پچاس روپے بھی دیئے ہیں''

''مگر دت صاحب'' حبیب شاہ بولے ''یہ کام تو ٹھیک نہیں ہوا بچّہ تو ہمارے ہی پالے میں واپس آ گیا جب کہ اُسے ہادی کے میدان میں ہونا چاہئے تھا''

''ہاں یہ بات تو ہے'' برہم دت نے کہا ''لیکن جناب کیا مضائقہ ہے اگر وہ بچّہ میرے ہی گھر میں پرورش پا جائے۔ پنڈتائین تو اُسے اپنے کلیجے سے لگائے بیٹھی ہیں کہتی ہیں میں اِسے پال لوں گی بہت پیارا بچّہ ہے''

''مگر'' شاہ صاحب کو کچھ تامل ہوا ''آپ کو اپنی مسز سے بتا دینا چاہئے تھا کہ وہ ایک سیّد کا بچّہ ہے ایک برہمن کے گھر میں اس کی پروش کیسے ہو سکتی ہے''

''اور شاہ صاحب تم نے مجھے کیا سمجھا ہے؟- میں حسینی برہمن ہوں۔ شاہ صاحب وہ ہمارے ہی پوروج تھے جو اسلام کے سب سے بڑے سیّد یعنی حضرت امام حسین کی مدد کرنے کو کربلا کے میدان میں پہونچ گئے تھے۔ آپ کو شاید معلوم نہیں کہ ہمارے ہی بزرگوں نے حضرت امام حسین کو بھارت آنے کا نمنترن دیا تھا اور اُنھوں نے اپنی آخری خواہش اور آخری خطبہ میں بھارت کو یاد بھی کیا تھا تو میاں جی کیا ہم سے ایک سیّد بچّہ نہ پالا جائے گا''

''نہیں نہیں آپ ٹھیک کہتے ہیں مسٹر دت'' شیر علی نے کہا ''وہ بچّہ آپ کے گھر میں اچھی طرح پرورش پائے گا لیکن بعد میں اگر ہادی کو پتہ چلا کہ اُن کا بچّہ آپ کے پاس ہے تو؟''

''تو کیا؟- اگر وہ مانگیں گے تو میں دے دوں گا'' پنڈت جی نے کہا

''مگر ہادی کو نہیں- اُن کے بیٹے کو دیجئے گا'' حبیب شاہ بولے

''دیکھوں گا'' برہم دت نے کہا ''ابھی تو میری یہی کوشش ہوگی کہ وہ اپنا بچّہ لے لیں''

''اب ذرا میرے ان ساڑھو بھائی کی مشکل بھی حل کر دیجئے'' شیر علی نے کرامت کی طرف اشارہ کیا

''ان کی بھی کوئی سمسّیا ہے کیا؟'' انسپکٹر برہم دت نے ہنس کر پوچھا

''جی ہاں- ان کی بھی سمسّیا کا تعلق ہادی کی ذات سے ہے'' شیر علی بولے ''اُنھوں نے ساڑھو جی کے چالیس ہزار روپے دبا رکھے ہیں نیّت خراب ہے اس لئے واپس نہیں کرنا چاہتے۔ آپ ان پر زور دباؤ ڈال کر کسی صورت سے روپے واپس دلا دیجئے''

''میں وعدہ تو نہیں کرتا ہاں کوشش کروں گا'' برہم دت نے کہا ''ابھی تو مجھے اپنا پستول بھی واپس لینا ہے نا''

شیر علی اور حبیب شاہ اسی رات کو تین بجے مغلسرائے لکھنؤ پسینجر سے واپس جانے والے تھے رات میں ڈھائی بجے کے قریب انسپکٹر برہم دت نے اپنی جیپ نکالی دو سپاہی ساتھ لئے اور یہ چاروں تین بجے رات کو جائس اسٹیشن پہونچ گئے۔ گاڑی ایک گھنٹہ لیٹ تھی اس لئے یہ لوگ ایک چائے کے دوکان میں بیٹھ گئے۔ شیر علی کرامت کو الگ لے جا کر بولے ''میرے بھائی- میرا کہا سنا معاف کرنا اور زرّیں کو میرا اسلام کہنا میں آپ کے لئے دعا کروں گا''

ان دونوں کو ٹرین میں بٹھا کر کرامت علی انسپکٹر برہم دت کی جیپ سے اسٹیشن سے واپس آیا تو مشرق سے صبح کی پو پھٹنے کے ساتھ قصبہ میں چاروں طرف مرغ سحر اور اذان کی آوازیں آ رہی تھیں- کرامت علی نو گزی قبر چوراہہ پر جیپ سے اُتر کر اپنے گھر چلا گیا۔

★★★

ہادی میاں کے وقوعے کی جو رپورٹ وقار نے پولیس میں لکھائی تھی اس کی تحقیقات کے لئے پولیس انسپکٹر برہم دت موقع پر پہونچے تو ماجد عرف مِکّی کی احمقانہ روداد اُنھیں بھی سننے کو ملی۔ مِکّی نے پھر وہی کچھ دہرا دیا جو اس سے پہلے بھی ہر ایک کو بتا چکے تھے۔ سننے کے بعد انسپکٹر نے کہا''

میرے بھائی جس وقت آپ نے چور کی کمر تھام لی تھی اسی وقت شور مچا کر آس پاس کے لوگوں کو اکٹھا کیوں نہیں کر لیا؟''

''جناب وہ اپنے کو چھڑا کر اور مجھے دھکّا دے کر بھاگ گیا۔ مجھ سے تگڑا تھا نا'' مِکّی نے کہا

''پھر بھی آپ کو ہلّا تو مچانا ہی چاہئے تھا'' انسپکٹر نے کہا

''ہاں یہ تو غلطی ہوگئی'' مِکّی نے اعتراف کیا

''آپ کے کہنے کے مطابق جس آدمی کی کمر آپ نے تھامی تھی اور جو آپ کو دھکّا دے کر بھاگ گیا تھا وہ کرامت علی تھا اور اسی کے پاس سے پچاس پچاس کے دو نوٹ بھی اس جگہ گرے تھے جو آپ کے خیال میں ہادی صاحب کے تھے تو ان نوٹوں کو اُٹھا لینے کے بعد آپ اسی وقت ہادی صاحب کو واپس کرنے اور ان کا حال چال معلوم کرنے ان کے گھر کیوں نہیں گئے''

''ہاں یہ غلطی مجھ سے ضرور ہوئی'' مِکّی نے اقرار کیا

''غلطیاں تو آپ سے ایک نہیں کئی ہوگئی ہیں کیونکہ آپ ایک کچّے اور اناڑی چور ہیں'' انسپکٹر نے کہا ''خیر آیئے آپ میرے ساتھ یہاں آپ کے بہت سے رشتے دار کھڑے ہیں۔ آپ کی بے عزّتی ہوگی''

انسپکٹر مِکّی کو وہاں سے دور تخلیہ میں لے جا کر بولا

''دیکھو سیّد صاحب۔ تم حد سے حد میرے پانچ ہنٹروں کی مار سہہ سکتے ہو اس سے زیادہ کی ہمّت تم میں نہیں ہے۔ تمہاری دانشمندی اسی میں ہے کہ بلا مار کھائے سب کچھ صحیح صحیح بتا دو کیونکہ تمہارا جھوٹ تو اسی میں کھل گیا جو تم نے کرامت علی کا نام لیا۔ وہ تو آٹھ بجے رات سے صبح چار بجے تک میرے ساتھ تھانہ میں تھے اور تم موقعۂ واردات پر اپنی موجودگی بیان کر ہی چکے ہو''

مِکّی کے پیروں تلے سے زمین اس طرح کھسکی کہ آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا منھ پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ منھ سوکھ گیا۔ رال پر رال گھونٹ کر اُنھوں نے سب کچھ صحیح صحیح بتا دیا اور پھر اُنھیں کی نشان دہی پر وہ سارے روپے جو وہ ہادی کے گھر سے چُرا کر لائے تھے وہ ان کے مفلوج ابّا جان کی توشک کے اندر سے برآمد ہوگئے۔ انسپکٹر برہم دت نے اُنھیں اقدامِ قتل کے الزام میں ماخوذ کر کے حوالات پہونچا دیا۔

اس کے بعد انسپکٹر برہم دت ہادی صاحب کے گھر گئے وہ بڑی معصوم صورت بنائے تخت پر چپ چاپ لیٹے تھے انسپکٹر نے جاتے ہی پوچھا

''بڑے سیّد صاحب اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟''

''اللہ کا کرم ہے انسپکٹر صاحب'' ہادی نے کہا ''سمجھ لیجئے جان بچ گئی اچھے کرموں کا پھل تھا ورنہ چور نے تو مار ڈالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی''

''ہاں صاحب کرموں کا ہی پھل کہنا چاہئے'' برہم دت نے خیال ظاہر کیا ''مگر جناب یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ آپ کی طرف سے جو ایف آئی آر لکھائی گئی ہے اس میں روپوں کی چوری کا تو کوئی ذکر ہی نہیں کیا، کیا روپے چوری نہیں ہوئے؟''

''نہیں نہیں۔ روپے چوری ہوئے ہیں'' ہادی نے کہا ''شاید لڑکے سے رپورٹ لکھانے میں بھول ہوگئی ہے''

''یعنی آپ کے گھر سے روپے چوری ہوئے ہیں'' انسپکٹر نے کہا

''جی ہاں'' وہ بولے

''اندازاً کتنے روپے؟''

''یہی کوئی چالیس ہزار'' ہادی نے جواب دیا

''چالیس ہزار!'' برہم دت نے کہا ''اتنے روپے آپ کے پاس کہاں سے آئے۔ اگر کسی ضرورت کے لئے آپ نے بینک یا پوسٹ آفس سے نکالے ہوں تو ذرا اپنی پاس بک دکھا دیجئے''

''جی؟'' ہادی گھبرا گئے ''جناب آپ نے تو اس طرح سوالات کی بوچھار کر دی ہے جیسے میں نے ہی چوری کی ہے۔ خیر میں بتا دوں کہ یہ روپے مجھے کسی نے دیئے تھے''

''کس نے دیئے تھے؟'' انسپکٹر نے پوچھا

''آپ شاید اس آدمی کو نہ جانتے ہوں۔ اس کا نام کرامت علی ہے'' ہادی نے بتایا

''میں کرامت علی کو جانتا ہوں'' انسپکٹر نے کہا ''تو یہ روپے کرامت علی نے آپ کو دیئے تھے؟''

''جی ہاں''

''کس لئے دیئے تھے؟''

''کس لئے دیئے تھے'' ہادی نے دوہرایا ''ارے صاحب وہ میرے گھر کا پالک ہے اُس نے میرے پیروں کے علاج کے لئے یہ رقم دی تھی کیونکہ مجھے پیروں کے علاج کے لئے بنگلور جانا ہے''

''اچھا اچھا'' برہم دت بولے ''مگر سیّد صاحب اس نے تو پولیس میں یہ رپورٹ لکھائی ہے کہ آپ نے زور زبردستی اور خیانت کر کے اس کے چالیس ہزار روپے مار لئے اور واپس نہیں کرتے''

''ارے صاحب ابھی روپوں کی واپسی کا سوال کہاں اُٹھتا ہے۔ پرسوں ہی تو اس نے دیئے تھے اور ابھی میں علاج کے لئے گیا بھی نہیں اس پر سے وہ روپے چوری بھی ہوگئے تو اتنی جلدی روپے واپس کیسے ہوں''

''ہاں چوری ہوگئے تو کیسے واپس ہوں آپ کا خیال صحیح ہے مگر اصلیت تو یہ ہے کہ روپے کرامت علی کو نہ لوٹانے کا پلان بنا کر خود آپ نے چوری کا ناٹک کیا اور روپے چور کے پاس رکھا دیئے ہیں''

''کیا؟ کیا؟ میں نے رکھائے ہیں-چور کے پاس؟''ہادی آنکھیں پھاڑ کے بولے

''جی ہاں''انسپکٹر بولا''چور بھی پکڑا گیا-روپے بھی اس کے پاس سے برآمد ہو گئے''

''اور وہ یہ بھی کہتا ہے کہ میں نے اُس کو روپے دیئے ہیں-وہ سالا اوگھڑ کی اولاد''ہادی بولے''تو کیا آپ ماجد کو اوگڑ کہہ رہے ہیں؟''انسپکٹر برہم دت نے پوچھا''وہ تو آپ کا رشتہ دار ہے''

اوگھڑ کا نام ہادی کے منھ سے اچانک اور بالکل غیر ارادی طور پر نکل گیا تھا وہ نہیں چاہتے تھے کہ از خود اوگھڑ بابا کا نام لے کر معاملہ کو طول دیں اس لئے جلدی سے بات بدل کر بولے''خیر اچھا ہوا کہ چور پکڑا گیا''ہادی بولے''یہ ماجد حرامزادہ ہے بھی اسی قابل کہ اُسے سزا ملے''

''جناب سزا دینا یا نہ دینا تو عدالت کا کام ہے''برہم دت نے کہا''لیکن چونکہ روپے سب کے سب ماجد کے پاس سے برآمد ہو گئے ہیں اس لئے اب اگر کرامت اپنے روپے آپ سے واپس لینا چاہتا ہے تو آپ کو اس میں کوئی اعتراض نہ ہونا چاہئے''

ہادی بہت دیر سے کسمسا رہے تھے یہ بات سن کر تڑپ اُٹھے

''میری سمجھ میں نہیں آتا انسپکٹر صاحب کہ آپ میری رپورٹ پر واردات کی تفتیش کرنے آئے ہیں یا کرامت علی کی طرف سے وکالت کرنے''

''جناب والا-میرے تھانہ میں آپ کے خلاف دو ایف آئی آر درج ہوئی ہیں میں ان کی تحقیقات کے لئے بھی آیا ہوں''انسپکٹر نے کہا

''ایف آئی آر-میرے خلاف؟''

''جی ہاں''انسپکٹر نے کہا''پہلی رپورٹ تو کرامت علی نے اپنے روپوں کے بارے میں لکھائی ہے جسے آپ نے قبول بھی کر لیا ہے اور دوسری رپورٹ یہ ہے کہ ایک مسروقہ سرکاری پستول کے عوض آپ نے کسی اوگھڑ بابا کے ہاتھ کسی کا ایک چھوٹا سا بچّہ بیچا ہے''

''یہ غلط ہے''ہادی جلدی سے بولے

''کیا غلط ہے؟''انسپکٹر نے کہا''پستول والی بات یا بچّہ بیچنے والی بات؟''

''دونوں باتیں''ہادی یک بیک بیساکھی ٹیک کر کھڑے ہو گئے

''ارے ارے قبلہ-آپ کھڑے کیوں ہو گئے-تشریف رکھئے نا''

''کیا تشریف رکھوں''وہ اسی طرح کھڑے رہے''آپ کا دل چاہے تو گھر کی تلاشی لے لیجئے بس''

''تلاشی لے کر کیا کروں گا''انسپکٹر نے کہا''ویسے آپ ذرا دیر کے لئے اپنی بیساکھیاں مجھے عنایت کریں گے''اتنا کہتے ہی انسپکٹر برہم دت نے ہادی کی بیساکھی کے بغل میں لگانے والے حصّے میں

لپٹے ہوئے کپڑوں کی پوٹلی کو ٹٹولا پھر مسکرا کر ہادی کی طرف دیکھا

''چوری کرنا-جرم کرنا ایک بڑا آرٹ ہے سیّد صاحب اور آپ کے میدان کی چیز نہیں''پھر جھک کر ان کے کان میں کہا''اب بتایئے-آرمس ایکٹ کے تحت بلا لائسنس ایک بدیشی پستول رکھنے کے جرم میں سیدھے سیدھے تین سال کے لئے آپ کال کوٹھری میں پہونچ گئے کہ نہیں-سیّد ہادی صاحب میں پوچھتا ہوں کہ پستول چھپا کر رکھنے کے لئے آپ کو اور کوئی جگہ سمجھ میں نہیں آئی تھی''

''جی-وہ-''ہادی رال گھونٹ کر بمشکل بھی کچھ نہ بول سکے ان کی چوری پکڑ گئی تھی

''اور چونکہ پستول چوری کا تھا جس کا ایف آئی آر بہت پہلے سے تھانے میں درج ہے اس لئے مال مسروقہ کے جرم میں ایک سال اور-یعنی کم از کم چار سال کی قید بامشقت آپ کے حق میں لکھ گئی نا؟''

ہادی اب تخت پر بیٹھ گئے اور انسپکٹر کی مکھن بازی شروع کر دی

''آپ تو بڑے اچھے اور نیک دل انسان ہیں-میں نے آپ کی بڑی تعریف سُنی ہے اس لئے عرض ہے''یہ کہہ کر اُنھوں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور دھیرے سے بولے

''یہ خادم ضعیف و معذور ہے اسے کسی قانونی شکنجے میں نہ پھنسایئے-اور میرے جو روپے مکّی کے گھر سے برامد ہوئے ہیں ان میں سے جس قدر آپ کا دل چاہے خود رکھ لیں-میرا مطلب ہے ایک شریفانہ سمجھوتہ کر لیجئے''

یہ سُن کر انسپکٹر برہم دت نے جھٹ ہادی سے ہاتھ ملایا

''ہاں-یہ ہوئی معاملہ والی بات-آپ بہت سمجھدار آدمی ہیں''

ہادی تہِ دل سے خوش ہو کر انسپکٹر سے ہاتھ ملانے لگے-انسپکٹر نے کہا

''اس لئے لایئے وہ چوری والا پستول نکال کر مجھے دے دیجئے تا کہ بلا لائسنس کے پستول رکھنے کا الزام تو آپ کے سر سے ابھی اور اسی وقت ختم ہو جائے''

ہادی نے بیساکھی کے بغل والے حصّے میں لپٹے کپڑے کھول کر اس میں سے پستول نکالا اور انسپکٹر کے آگے رکھ دیا-برہم دت نے پستول اٹھا کر بغور دیکھا پھر دوسرا سوال پیش کر دیا''چلئے یہ تو ہو گیا-اب یہ بتایئے کہ بچّہ جو آپ نے اوگھڑ بابا کے ہاتھ بیچا تھا وہ کس کا ہے اور اُسے آپ نے کہاں سے چرایا تھا''

''کیا!''ہادی کو جیسے بجلی کا کرنٹ چھو گیا''چرایا تھا-یہ کس نے کہا؟''

''دیکھئے-ایک نہایت شریف آدمی کی طرح مجھے سب کچھ صحیح صحیح بتا دیجئے-وہ اوگھڑ فقیر تو پہلے سے پستول اور بچّہ چرانے کے الزام میں حوالات کے اندر بند ہے آپ کہیں تو اُسے بلوالوں''

''نہیں نہیں''پھر بہت دھیرے سے بڑبڑائے''پکڑ گیا بے چارہ اوگھڑ بابا''

''تو پھر بتا دیجئے وہ کس کا بچّہ ہے'' برہم دت نے پوچھا

''وہ بچّہ- وہ میرا بچّہ تھا- میرا مطلب ہے اپنا ہی تھا کسی دوسرے کا نہیں تھا''

''آپ کے کتنے بچّے ہیں؟'' انسپکٹر نے ہنس کر پوچھا ''یہ تو نئی بیگم کا ہوگا شاید''

''جناب ایک ہی بچّہ ہے میرا''

''اور اُسے آپ نے اوگھڑ بابا کو مرحمت فرما دیا۔ شاباش ہے'' انسپکٹر ہنسنے لگا

''جی نہیں جی نہیں'' ہادی جلدی سے بولے ''میں یہ کہہ رہا ہوں کہ وہ میرے بیٹے کا بچّہ ہے- یعنی میرا پوتا''

''ارے واہ- آپ کا دماغ تو صحیح ہے'' انسپکٹر نے کہا ''جناب سید صاحب۔ آپ ہی بتایئے کیا کوئی آدمی اپنے پوتے کے ساتھ ایسا بہیمانہ سلوک کرسکتا ہے جیسا آپ نے کیا۔ ایک انجانے ایرے غیرے اوگھڑ کو آخر کس خوشی میں دے دیا وہ بچّہ۔ دیکھئے میر صاحب- اب زیادہ جھوٹ بولنے کی کوشش نہ کیجئے اور سیدھی طرح سچ مچ بتا دیجئے کہ وہ کس کا بچّہ تھا؟''

ہادی چند لمحے خاموش بیٹھے انسپکٹر برہم دت کی صورت دیکھتے رہے پھر بڑے کمزور لہجہ میں بولے ''وہ بچّہ میرا پوتا تھا- آپ یقین کریں میں غلط نہیں کہتا''

''فقیر کو کیوں دیا تھا؟''

''پھونک جھاڑ کرنے اور روتان تالاب میں نہلانے کو دیا تھا تا کہ اُسے سوکھا کا مرض نہ لگے بچّہ اکثر بیمار رہتا ہے نا''

''یعنی کہ آپ نے اُسے بیچا نہیں؟'' برہم دت نے پوچھا

''جی نہیں'' وہ بولے

''جب شام تک اوگھڑ بچّہ کو واپس نہ لایا تو آپ نے کیا کیا؟ شور و غل مچایا، پولیس میں رپورٹ لکھائی؟''

''ایں! جی نہیں''

''کیوں؟''

بڑی دیر تک سوچنے کے بعد ہادی نے کہا ''میں بھول گیا تھا''

''میں اس جھوٹ کے لئے آپ کو معاف کرسکتا ہوں بشرطیکہ آپ وعدہ کریں کہ بچّہ مل جانے کے بعد آپ پھر اُسے اِدھر اُدھر نہ پھینکیں گے''

''ہاں میں وعدہ کرتا ہوں- قسم کھاتا ہوں'' ہادی گڑگڑانے لگے

''ٹھیک ہے انسپکٹر نے کہا ''اب آپ سے نہ تو کوئی پوچھ گچھ ہوگی اور نہ آپ کے خلاف کوئی

قانونی کارروائی کی جائے گی- مگر قبلہ ایک بات سُن لیجئے جو شریفانہ سمجھوتہ تھوڑی دیر پہلے آپ مجھ سے کرنا چاہتے تھے اُس کے تحت ماجد کے گھر سے برامد ہونے والی ساری رقم میری طرف چلی آئے گی۔ بولئے منظور ہے؟''

''جی؟- یعنی کہ ساری رقم؟- ہائے غضب'' اُنھوں نے اپنا سینہ پیٹ لیا

''جی ہاں'' انسپکٹر نے کہا ''آپ کو منظور نہ ہو تو بتا دیجئے''

''ارے صاحب منظور ہے- مجھے آپ کی یہ شرط بھی منظور ہے مگر خدارا یہ تو بتایئے کہ میں کرامت کو کیا جواب دوں گا''

''چھوڑیئے اُسے'' انسپکٹر نے کہا ''وہ تو آپ کے گھر کا پالک ہے ضرورت پڑی تو میں دیکھ لوں گا''

بعد میں انسپکٹر برہم دت نے ساری برامدہ رقم ہادی کو بتائے بغیر کرامت علی کو واپس دے دی۔

★ ★ ★

دو دن تک ہادی اپنے اوپر قاتلانہ حملے کے اثرات، روپوں کے تلف ہونے کی قلبی اذیّت اور کرامت علی کی جیت کے صدمے سے مرغ بسمل بنے رہے اُنھیں ہر وقت یہی ایک غم کھائے جا رہا تھا کہ کس طرح سے کرامت علی کو نیچا دکھایا جائے تا کہ روپوں کی واپسی والی بات وہ پھر نہ اُٹھا سکے۔ اس درمیان ہادی کے عزیز اقربا اور جان پہچان والوں میں سے کوئی بھی پرسش احوال کے لئے ان کے پاس نہیں آیا سبھوں نے ان کے اس اقدام کو سنگین تر اور بے رحمانہ سمجھا کہ اُنھیں کی رپورٹ پر مِکّی بے چارے جیل خانہ میں بند پڑے تھے حتیٰ کہ وقار بھی سارے حالات معلوم کرنے کے بعد باپ سے کنارہ کش ہو گیا۔ تیسرے دن باپ کے پاس آیا تو صرف الوداع کہنے۔ اس کی گود میں اس کا بچّہ بھی تھا جسے انسپکٹر برہم دت اسی روز خود لے کر وقار کے پاس آئے تھے وقار کے ساتھ لاڈلی بھی آئی تھی۔ باپ کے پاس جا کر وقار نے پر ملال لہجہ میں کہا

''ابّا میں جا رہا ہوں۔ آپ سے رخصت ہونے کے لئے آیا ہوں''

''کہاں جا رہے ہو؟''

''میری ملازمت کا آرڈر آیا ہے- یوپی سول سکریٹریٹ میں اَپر ڈویزن اسسٹنٹ کی جگہ پر میری تقرری ہوئی ہے- میں لکھنؤ جا رہا ہوں''

''تنہا تم ہی جا رہے ہونا؟'' ہادی نے پوچھا

''نہیں ابّا'' وقار بولا ''ہم تینوں جا رہے ہیں''

''تینوں؟'' ہادی گاؤ تکیہ میں کہنیاں ٹکا کر آدھا ہی اُٹھے۔ تینوں پر ایک نظر ڈالی، چند لمحے خاموش رہے اور ''اچھا'' کہہ کر پھر لیٹ گئے اور تنفّس زدہ مریض کی طرح سانس پُھلا پُھلا کر بولے'' تمہارا باپ روٹیاں کہاں زہر مار کرے گا۔ کم بختو یہ تو بتاتے جاؤ''

لاڈلی بولی ''میں نے نادرہ سے کہہ دیا ہے وہ آپ کا کھانا پکا دیا کرے گی''

''کون؟ – ندّو'' ہادی بولے ''میں اس مدقوق عورت کے ہاتھ کا پکایا نہیں کھاؤں گا – بہو تمہاری والدہ سے کیا اتنا بھی نہ ہوسکے گا کہ میری دو وقت کی روٹیاں پکا دیا کریں۔ یارو کیسا خون سفید ہوگیا ہے۔ اوپر سے وہ میری سمدھن بھی ہیں۔ سبحان اللہ و بحمدہٖ''

''وہ تو کچھ دنوں بعد چلی جائیں گی''

''میں جمیلہ سے کہہ دوں گا'' وقار نے کہا

''چلو تم لوگ دفعان ہو میری نظروں سے – میں خود اپنا انتظام کرلوں گا''

وقار دوپہر کی گاڑی سے اپنی بیوی بچّہ سمیت لکھنؤ چلا گیا۔ اس کے دوسرے دن شام کو ہادی بیساکھیاں ٹیکتے ہوئے میر فدا حسین کی حویلی پہونچے اور زہرابی کے پاس جا کر بیٹھ گئے

''وقّن چلا گیا بجّو – میں نے ان لوگوں کو بہت سمجھایا کہ میں اپنے کھانے پینے کا کوئی نہ کوئی ٹھکانا کرلوں گا۔ ارے دو روٹیاں کھانی ہیں کہیں کھالوں گا اتنے سارے عزیز ہیں، تم لوگ میری فکر نہ کرو اپنی نوکری پر جاؤ مگر بہو نے میری ایک نہ سُنی قسم رکھا گئی ہے کہ میں حویلی میں آجاؤں اور یہیں آپ کے ساتھ رہوں ورنہ اُسے دکھ ہوگا۔ بجّو تم ہی بتاؤ بُری بات ہے نا کہ میں سمدھیانے میں آ کر بوجھ بن جاؤں''

''ارے نہیں بھیّا'' زہرابی نے کہا ''اس میں بُری بات کیا ہے اپنے اپنوں کے کام آتے ہیں تمہاری سمدھن ہوں تو کیا بہن بھی تو ہوں – تم میرے سگے ماموں کے بیٹے ہو''

''نہ نہ نہ – بجّو تم بہن ہی بنی رہو'' ہادی بولے ''میری سمدھن تو زرّو بی ہیں – دیکھو کیسا چپ چاپ بیٹھی سُن رہی ہیں۔ ارے منھ چھونے ہی کو کہہ دیں کہ ہاں آجایئے اِسی گھر میں''

زرّیں نے اس چوٹ کا کوئی اثر نہیں لیا صرف اتنا ہی کہا

''میرا گھر ہے کیا؟''

''کیوں بھائی کیوں؟ تمہارا گھر کیوں نہیں ہے'' ہادی نے کہا ''اچھا یہ تمہاری بیٹی کا گھر تو ہے''

''بیٹی کا گھر تو اس کی سسرال میں ہوتا ہے'' زرّیں نے جواب دیا

''لیجیئے صاحب – انھوں نے تو ہتّھے ہی سے کاٹ دیا'' ہادی بولے

''اے میں کہتی ہوں چھوڑو ان باتوں کو'' زہرا نے کہا ''ہادی – تم بھیّا اسی وقت سے آجاؤ''

ہادی نے زہرابی کی بات کا فوراً کوئی جواب نہیں دیا لیکن زرّیں کی بات پر بولے

''ہاں ہاں سسرال کا گھر تو اس کا ہے ہی اور فدّن بھائی کے مرنے کے بعد تو یہ گھر بھی اسی کا ہوگیا'' پھر ایک ٹھنڈی سانس بھر کر آگے کہا ''فدّن بھائی کا اور ہے بھی کون وہی ایک تو ان کی وارث ہے''

زہرابی نے سُن کر کان اُٹیرے مگر ہادی کی اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا سُنی ان سُنی کر گئیں

''ویسے مجھے اپنی بہو کے مکان جائیداد کھیت باغات کی دیکھ بھال بھی تو کرنی ہے'' اُنھوں نے کہا اس بات پر زہرابی نے چوکنّا ہو کر ان کی طرف دیکھا مگر ہادی نے فوراً دوسری بات شروع کردی

''بجّو – یہ باہر والا کمرہ میں نے اپنے رہنے کے لئے کرلیا ہے''

''تمہارے لئے تو کوٹھے پر گلی کی طرف کھلنے والا کمرہ ٹھیک رہے گا ہادی – باہری کمرہ بھی اچھا ہے مگر اس میں لاڈلی کے خالو جان رہیں گے''

''کون رہے گا؟'' ہادی نے چونک کر پوچھا

''میرے دولھا بھائی'' زرّیں بولی ''کرامت علی''

''ارے ارے ارے – وہ اس گھر میں رہے گا؟''

''ہاں – لاڈلی اور وقّن کہہ گئے ہیں'' زہرابی نے جواب دیا ''کرامت سے بھی کہہ گئے ہیں – مگر ہادی تمہیں کیا کرنا ہے – تم بھی آجاؤ اور شوق سے آ کر رہو – یہ تمہارا گھر ہے''

''ہاں بجّو میرا گھر تو ہے'' ہادی بولے ''اور یہ کوئی فقیروں کی تکیہ گاہ یا خانقاہ نہیں ہے کہ ایرے غیرے بے مقصد لوگ یہاں اینڈتے پھریں – میں پوچھتا ہوں بجّو کیا لگتا ہے یہ فقیر کی اولاد کرامت علی آپ لوگوں کا جو اس کی یہ خاطر داری ہو رہی ہے – بتایئے جواب دیجئے''

''اے توبہ تم تو میری جان کو آ لگے'' زہرا بولیں ''ارے میں نے کہہ دیا کہ وقّن اور لاڈلی کہہ گئے ہیں کہ کرامت کو باہر والے کمرے میں رہنے کو بلا لینا''

''مگر بجّو وہ دونوں ناسمجھ ہیں'' ہادی نے کہا ''ان کی بات کو پرکھنا وزن کرنا بڑوں کا کام ہے – اس لئے میں کہتا ہوں کہ وہ یہاں نہیں رہے گا''

''اے لوگوں آخر کیوں؟'' زہرابی نے پوچھا

''بس بجّو کہہ دیا ایک بار'' ہادی بولے ''کرامت کی قدم اس حویلی میں نہ آویں بس اور باہری کمرہ جو فدّن بھائی کی نشست گاہ تھی اس میں میں خود رہوں گا – سُن لیجئے''

اتنا کہہ کر ہادی باہر نکل رہے تھے کہ خوبیِ تقدیر سے دروازے پر کرامت علی سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ کرامت نے اُنھیں دیکھتے ہی بڑے میٹھے لہجہ میں پوچھا

''کیسے ہو ہادی بھیّا؟ – طبیعت ٹھیک ہے نا اب؟''

ہادی نے کوئی جواب نہیں دیا تو کرامت نے اور آگے کہا

''اللہ نے بڑا رحم کیا بھیّا- یہ مٹّی تو سچ مچ کا شیطان ہے نہ جانے کیوں آپ کی جان کا دشمن ہو گیا ہے۔ اچھا کیا آپ نے اُسے اندر کرا دیا''

ہادی رک گئے اور پلٹ کر جواب دیا

''ابھی تو اور کئی شیطان باقی ہیں، ان سب کو اندر کرانا ہے- اور یہ تم اونٹ کی طرح گردن اُٹھائے اندر کہاں گھسے جا رہے ہو؟۔ ایں!- ابے یہ پردہ نشین خواتین کا گھر ہے باہر ہی سے صدا لگاؤ''

''میں تو آپ ہی کو ڈھونڈھ رہا تھا'' کرامت نے کہا

''مجھے کیوں ڈھونڈھ رہے تھے؟ کیا کام ہے مجھ سے؟'' اُنھوں نے پوچھا

''بس سمجھ جایئے'' کرامت بولا

''کیا سمجھ جاؤں'' ہادی نے کہا ''دیکھو کرامت- اپنے روپوں کی واپسی کی بات تو کرنا نہیں۔ ہاں کہے دیتا ہوں''

''کون روپوں کی بات کر رہا ہے'' کرامت ہنس کر بولا ''میں تو اس کی بات کر رہا ہوں''

''کس کی؟''

''اُسی کی- جس کے ساتھ میری شادی کرانے کے لئے آپ کو وصیّت کی گئی ہے- جس کے لئے آپ نے مجھ سے روپے اینٹھے ہیں۔ وہی جو اندر بیٹھی ہے میری زرّو'' کرامت ایک سانس میں بول گیا

''اچھا!'' ہادی دانت پیس کر بولے ''سالے تیری عاشقی کی میّت نہ نکلوا دی تو مجھے ہادی نہ کہنا- حرامزادے اسی لئے یہاں منڈلا رہا ہے۔ سُن لے تیری دال یہاں گلنے والی نہیں ہے''

''میری دال گل بھی گئی'' کرامت ہنس کر بولا ''اور آج سے اس گھر میں رہنے کے لئے میری تشریف بھی یہاں آ رہی ہے- میّت آپ کی نکلے گی''

''حویلی میں قدم رکھنے کی ہمّت کی تو سالے پیر توڑ وا دوں گا'' ہادی بولے

''تو چلئے اندر، توڑیئے میرے پیر- میں تو اندر جا رہا ہوں'' یہ کہہ کر کرامت علی اُنھیں زبردستی اندر گھسیٹ لے گیا اور وہ ''ہائیں ہائیں'' ''ابے ابے'' کرتے رہے

ڈیوڑھی میں پہونچ کر کرامت نے آواز دی

''چچّی- ذرا آپ پردے میں ہو جائیں''

زہرابی پردے میں ہو گئیں۔ کرامت ہادی کو گھسیٹتا ہوا دالان میں لے گیا جہاں دو تین بادھ کی پلنگیں پڑی تھیں ان میں سے ایک پلنگ پر ہادی کو پٹخ کر کرامت نے کہا

''اب یہاں ہو گی روپوں کی بات چیت- بولئے کب لوٹا رہے ہیں میرے روپے؟''

''وہ روپے تو چوری ہو گئے'' ہادی نے بتایا

''مگر ماجد میاں کے گھر سے برامد بھی ہو گئے'' کرامت بولا

''تو داروغہ صاحب سے پوچھونا- میرے پاس کچھ نہیں ہے''

''میں تو آپ سے پوچھوں گا- مجھے روپے چاہئے- ورنہ توڑتا ہوں یہ ٹنگڑی''

زرّیں دالان سے ملے ایک کمرے سے یہ سب دیکھ رہی تھی جب کرامت نے ہادی کی ٹیڑھی ٹانگ کو پکڑ کر مروڑنا شروع کیا تو زرّیں وہیں سے بولی

''نہیں نہیں- یہ مت کیجئے- چھوڑ دیجئے اُنھیں''

مگر چھوڑنے سے پہلے کرامت نے ہادی کو اپنی گود میں بھرا اور سروقد اُٹھا کر دوسری پلنگ پر پھینکا ''کولھا مضبوط کر رہا ہوں ان کا'' پھر الگ ہٹ کر اپنے ہاتھ جھاڑتا ہوا بولا

''جایئے- میں نے چھوڑ دیا کسی کے طفیل میں۔ اب اُٹھا لے اپنی بیساکھی اور نکل جا یہاں سے''

''اچھا- اچھا- جاتا ہوں جاتا ہوں''

''اور دو دن کے اندر میرے روپے واپس مل جائیں نہیں تو خون پی جاؤں گا''

ہادی چیختے کراہتے اور اپنی تہمد برابر کرتے ہوئے اُٹھے مگر کرامت سے کچھ کہنے کے بجائے زہرابی سے بولے ''دیکھ رہی ہو بجّو- آپ کے گھر میں میری درگت بن رہی ہے، عزّت لٹ رہی ہے اور آپ چپ چاپ کھڑی ہیں۔ یہی آپ کا انصاف ہے- اور یہ سالا حرامی- مادر کھود''

''نکل بے'' کرامت نے ایک ٹھوکر لگائی

ہادی بڑبڑاتے ہوئے وہاں سے چلے گئے تو زرّیں کرامت کے پاس آ کر بولی

''سنئے- آپ یہاں مت آیئے گا- ابھی جا کر وہ چاروں طرف فریاد کریں گے تو ایک آفت کھڑی ہو جائے گی اور بلا سبب میری بدنامی ہو گی۔ آپ کو قسم ہے ان سے کوئی جھگڑا نہ کیجئے گا''

کرامت علی چپ چاپ سر جھکائے وہاں سے چلا گیا۔

★★★

محرّم کا چاند نکلا تو نوجوانوں کی انجمن استقبالِ عزا کے جلوس میں اپنا ماتمی دستہ اور علم لے کر نکلی۔ ہر طرف سے گریہ وزاری کی آواز ماتمی باجوں کے شوروغل اور نوحہ خوانی و سینہ زنی کی آوازوں کو سُن کر ہادی بیساکھی لے کر گھر سے نکلے اور اپنے مکان کے چبوترے پر بیٹھ کر دہاڑھیں مار مار کر رونے لگے۔ کیا معلوم وہ حسین مظلوم کے غم میں مصروف بُکا تھے یا اپنی بے چارگی پر آنسو بہا رہے تھے۔ جلوس عزا اُن کے مکان کے سامنے سے ہو کر گذرا۔ ماتمی دستے میں سلامت حسین بڑی پُرسوز آواز میں نوحہ پڑھ رہے تھے

پھر چاند محرم کا نمودار ہوا ہے۔ پھر چاک جگر احمد مختار ہوا ہے

ہادی زور زور سے اپنا سر و سینہ پیٹنے لگے ماتمی دستہ کا ایک شریر لڑکا تقریباً ان کے کان میں اپنا منھ لے جا کر چلّایا ''پھر گریہ کناں ہادیٔ بدکار ہوا ہے''

ہادی کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ جلوس تو آگے نکل گیا مگر ہادی اپنا گریہ بند کر کے شریر لونڈے کی اگلی پچھلی سات پشتوں کو غلیظ گالیوں سے نوازتے رہے۔ پُھندنیا نائین جو قریب کے ایک چبوترے سے ماتمی جلوس دیکھ رہی تھی وہ آواز سن کر دھیرے دھیرے آئی اور ہادی کے سامنے کھڑی ہو کر بڑی توجہ کے ساتھ ان کی گالیوں کے نشیب و فراز سے محظوظ ہونے لگی۔ ہادی اس کی اس محویت کو دیکھ کر بولے

''کیا ہے رے- کیوں کھڑی ہے یہاں؟

''میاں میں تو آپ کا نوحہ سن رہی تھی'' وہ جھٹ بولی

''چپ حرامزادی- چڑیل کی بچّی'' ہادی کچھ اور بھی کہتے مگر پھندنیا پھدکتی ہوئی بھاگ گئی۔

محرّم کی پانچویں تاریخ کو ہر سال کرامت علی فقیر بنتا تھا اور امام حسین کے نام پر بھیک مانگ کر کھچڑے پر نذر کراتا تھا۔ جب تک اُس کے مربّی میر الطاف حسین عرف اچّھن میاں زندہ تھے وہ خود اپنے ہاتھ سے کرامت کو فقیر بناتے تھے ان کے مرنے کے بعد سے کرامت یہ کام خود ہی کرنے لگا مگر معمول یہی رہا کہ فقیر بننے کے بعد سب سے پہلے وہ اچّھن میاں کی حویلی پر جاتا تھا۔ اس روز بھی وہ اس وقت وہاں پہونچا جب ہادی حضرت عباس کی نذر میں کسی عزادار کے گھر سے گرم گرم بریانی نوش جان کر کے آئے تھے اور اپنے چبوترے پر بیٹھے دانتوں میں جلدی جلدی خلال کر رہے تھے۔ کرامت سبز رنگ کا جامہ سیاہ پگڑی پر سُرخ ناڑے کا جال بنائے اور کندھے پر ایک کالے رنگ کی جھولی لٹکائے ہادی کے گھر سے کچھ پہلے ہی پہونچ کر اپنی پاٹ دار آواز میں بڑے لحن سے بولا ''دن محرم کے ہیں کچھ دیجیئے بنام پنجتن''

پہلی بار ہادی اُسے کچھ دینے کے بجائے منھ موڑ کر دوسری طرف دیکھنے لگے۔ کرامت اُن کے پھاٹک پر بلا دوسری آواز لگائے آگے بڑھ گیا تو اُن کے پڑوسی میرن بھائی کے گھر سے ان کا چھ سات برس کا پھول جیسا بچّہ نکلا اور اس نے کرامت کی جھولی میں کچھ پیسے ڈالنا چاہے

''اے بیٹا شنّو- سنو- وہ ہادی میر صاحب چبوترے پر بیٹھے ہیں نا یہ پیسے تم اُنھیں کو دے آؤ۔ شاباش''

معصوم بچّہ کہنا مان کر ہادی کے پاس گیا اور بولا

''ہدّو دادا- امّی نے یہ پیسے آپ کو دیئے ہیں''

''مجھے کس لئے دیئے ہیں؟'' وہ چیں بہ جبیں ہو کر بولے

''معلوم نہیں'' لڑکا بولا ''امّی نے کہا باہر فقیر بیٹھا ہے اُسے دے آؤ''

ہادی نے پہلے ہی کرامت کو بچّے سے کچھ کہتے اور اپنی طرف اشارہ کرتے دیکھ لیا تھا سمجھ گئے کہ یہ شرارت اُسی کی ہے وہیں سے بلند آواز میں چلّائے

''سالے پھکٹّے- حرامزادے۔ مجھ سے چھیڑ خانی کرنے کا نتیجہ معلوم ہے؟ اب ایسی مار ماروں گا کہ سالے اُٹھ کر پانی نہ پی پاؤ گے۔ مِلکیوں کے محلّہ میں آ کر حرامی پن کرتا ہے کم بخت''

کرامت سنتے ہی پلٹ پڑا اور ان کے پاس آ کر معذرت کرنے لگا

''ارے میر صاحب سنئے تو سہی- میں نے کچھ نہیں کہا۔ میں تو آپ کا تابعدار ہوں غلام ہوں۔ مولا کے نام پر بھیک مانگ رہا ہوں۔ دے بابا اماموں کے نام'' کرامت نے صدا لگائی

''چلو چلو- بہت ٹرٹر نہ کرو''

کرامت جاتے جاتے اُن کے کان میں بولا ''لگتا ہے سچ مچ فقیر ہو گئے ہو خیر غم نہ کرو ہادی بھیّا- ہم تمہارے لئے بھی بھیک مانگ کر لائیں گے اور تمہارے پیٹ کا جہنم پاٹیں گے'' اتنا کہہ کر کرامت آگے بڑھ گیا اور ہادی وہیں بیٹھے بیٹھے گالیاں بکتے رہے

اس روز رات میں مولوی کلب عسکری کی مہندی کا جلوس نکلا۔ علم تابوت اور بے شیر کے گہوارے کے تبرّکات کے ساتھ سیاہ پوش عزادار ''دادمی گرید فلک بے دادمی گرید فلک- از برائے قاسم دامادمی گرید فلک'' پڑھتے جا رہے تھے۔ جلوس کے پیچھے درجنوں نائینیں تھیں جن کے سروں پر لکڑی کے خوان میں شمعیں روشن تھیں یہ نائینیں ہم آواز ہو کر بڑے پُر درد لہجہ میں ''دہا'' رو رہی تھیں

''مکّے مدینے کی راہ میں مالی حسن کے دوست ہیں۔ اللہ مالی حسن کے دوست ہیں۔ سہرا کے بندھوّیا حسن رن میں جُوجھیں سہرا میں لے کے کا کروں- اللہ سہرا میں لے کے کا کروں''

ایک بجے رات میں مہندی جب کنچانہ کے امام باڑے کے پاس پہونچی تو کرامت وہیں رک گیا۔ کنچانہ امام باڑہ کے میر صاحب بیمار تھے۔ تھوڑی دیر پہلے ان کے لڑکے پکڑا کر اُنھیں باہر لائے تھے اور جلوس میں تبرکات کی زیارت کرائی تھی خاک لگایا تھا۔ جلوس آگے بڑھ گیا تو کرامت وہیں رُک گیا اُسے بیمار میر صاحب کی عیادت کرنی تھی۔ اللہ اللہ کیسا خوبصورت اور سجیلا بدن تھا میر صاحب کا۔ گلاب کے پھول کی طرح شگفتہ چہرہ، خوبصورت تنی ہوئی مردانہ مونچھیں، بڑی بڑی مسکراتی ہوئی آنکھیں، اسّی سال کی عمر میں بھی ان کی شخصیت بڑی پُرکشش تھی- مگر اس وقت وہ بے حد کم زور اور علیل شہ نشین کے پاس فرش پر اکیلے لیٹے تھے۔ کرامت ان کے پاس پہونچ کر دھیرے سے بولا

''میاں کیسی طبیعت ہے آپ کی؟''

میر صاحب نے آنکھیں کھول کر اُسے دیکھا اور نقاہت بھری آواز میں پوچھا

''کون؟- کرامت؟''

''ہاں میاں-آپ کیسے ہیں؟''

''شکر ہے اللہ کا-کمزوری بہت ہے'' پھر تھوڑا رک کر پوچھا ''اس بار تم فقیر نہیں بنے کرامت''

''بنا تھا میر صاحب'' کرامت جلدی سے بولا ''بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ بھول جاؤں-ہاں آپ کی قدم بوسی کو حاضر نہیں ہوسکا یہ غلطی ضرور ہوئی''

''اچھا اچھا-دیکھو وہ پردے کے پیچھے الماری پر تبرّک کی سینی رکھی ہے اُسے اُٹھا لاؤ''

پھر اُنھوں نے چار پانچ مٹھی بتاشے سینی میں سے نکال کر کرامت کو دیئے

''یہ پانچوں دن کا حصّہ ہوگیا تمہارا'' میر صاحب بولے

کرامت نے تبرّک لے کر آنکھوں سے لگایا اور میر صاحب کے پیروں کو چھو کر اُٹھ گیا

''کرامت-آٹھویں کو حاضری کھانے ضرور آنا'' میر صاحب نے کہا

باہر ماتمی گشت نکل جانے کے بعد گلیوں میں اندھیرا ہوگیا تھا تھوڑی دور آگے گلی کے موڑ پر ایک صحرائی لالٹین دھیمی دھیمی جل رہی تھی ہلکی گرمی کا زمانہ تھا اس وقت بڑی خوش گوار ہوا چل رہی تھی کرامت مسلسل دو راتوں سے جاگ رہا تھا اس لئے نیند سے آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں وہ مسجد کے چکنے پکّے چبوترے پر ایک کپڑا بچھا کر لیٹ گیا اور لیٹا تو غافل سو گیا۔

مہندی کے جلوس سے نکل کر ہادی میاں نیم روشن گلیوں میں بیساکھی کے سہارے کھٹ کھٹ کرتے ہوئے اُس طرف سے گذرے دیکھا کہ امام باڑے کے چبوترے پر کرامت علی غافل سو رہا ہے اور پھاٹک کے اوپر ایک پرانے وضع کی دستی لالٹین اس طرح جل رہی ہے کہ اس کی پامال روشنی میں دو گز آگے کی چیز دیکھنا محال ہے۔منٹوں میں ابلیس ان کے اندر انگڑائی لے کر جاگ اُٹھا بولا بیساکھی سے اس کی کھوپڑی پھوڑ دے مگر عقل نے رہنمائی کی۔یہ ٹھیک نہیں۔پہلی ہی چوٹ کھا کر وہ اُٹھ پڑے گا پھر لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔وہ کچھ دیر وہیں کھڑے سوچتے رہے، پھر چپ چاپ گھر پہونچے اور وہاں سے مُٹّا میاں کوتوال والے زہر آلود بلّم کا پھل نکال کر پھر اسی جگہ آ گئے جہاں پر کرامت سو رہا تھا-آس پاس کے سب ہی لوگ مہندی کے جلوس میں چلے گئے تھے۔نیم تاریکی کے ساتھ ساتھ چاروں طرف سنّاٹا بھی تھا۔ہادی نے ایک ہاتھ سے برچھی کا پھل مضبوطی سے پکڑا پھر احتیاطاً اِدھر اُدھر دیکھا کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا اور دانت پر دانت بٹھا کر اُنھوں نے کرامت کے داہنے پیر کے پنجے پر تابڑ توڑ تین چار ضربیں اس شدت کے ساتھ لگائیں کہ کرامت سوتے سوتے چیخ مار کر اُٹھ بیٹھا ''ارے مار ڈالا'' وہ بلبلا کر وہیں تڑپنے لگا ہادی چپ چاپ اندھیرے میں وہاں سے کھسک لئے۔

کرامت کی چیخ سُن کر امام باڑے کے فرش پر غنودگی میں لیٹے ہوئے بیمار میر صاحب چونک اُٹھے اور وہیں سے چلا کر پوچھا ''کون ہے-کیا ہوا؟''

مگر دوبارہ کرامت کی آواز نہیں آئی کیوں کہ وہ بے ہوش ہوگیا تھا۔

پیر کے زخم اور اس سے بہت زیادہ خون نکل جانے کے سبب کرامت پر نقاہت طاری ہوگئی تھی۔صبح کو ڈاکٹر زیدی نے اس کے پیر کی مرہم پٹّی کی انجکشن لگائے اور اس سے مارنے والے کے بارے میں پوچھا تو اس نے ہادی کا نام بتایا اور کہا ایک بیساکھی والا آدمی اس کے پاس سے ہو کر جلدی جلدی اندھیرے میں بھاگا تھا-ہادی نے سُنا تو مُکر گئے

''واہ صاحب-اس قصبہ میں ایک میں ہی تو بیساکھی والا نہیں-محلّہ میں دو آدمی اور بھی تو ہیں۔میں کسی کا نام کیوں لوں، سب ہی جانتے ہیں اُن دونوں کو-اور پھر بھلا میں کیوں ماروں گا کرامت کو وہ میرے گھر ہی کا پروردہ ہے میری اس سے کوئی عداوت بھی تو نہیں'' ہادی نے پوری صفائی دے ڈالی

مگر کرامت اپنے دل میں ٹھان چکا تھا کہ وہ ہادی کو سزا دیئے بغیر نہیں رہے گا-وہ ایک زخمی شیر کے مانند اپنے شکار کو نظر میں رکھے تھا۔اس نے عہد کر لیا کہ ہادی کو تڑپا تڑپا کر مارے گا، اور اگر خود پہلے مر گیا تو ہادی کی میّت کو بھوت بن کر چمٹ جائے گا۔

کرامت کے پیر کا گھاؤ اچھا ہونے کے بجائے روز بروز خراب ہوتا گیا کیونکہ وہ آرام کرنے کے بجائے برابر چلتا پھرتا رہا۔آٹھویں محرم کے جلوس میں وہ اپنے پیر کی تکلیف کے باوجود ذوالجناح کے آگے نقیب اور چوبداروں کے ساتھ چاندی کا وزنی عصا لئے سواری بولتا رہا، دو دن بعد ڈاکٹر زیدی نے اُسے بتایا

''کرامت-تمہارے پیر کے زخم میں گیگرین یعنی زہر باد ہوگیا ہے اور ہمارے پاس یہاں اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔اگر تم زندہ رہنا چاہتے ہو تو فوراً لکھنؤ جا کر میڈیکل کالج میں اپنے پیر کو ٹخنے سے کٹوا دو''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب'' کرامت خوفزدہ ہو کر بولا

''دیکھو-میں نے بالکل صحیح بات بتائی ہے اگر تم نے دیر کی تو ہوسکتا ہے کہ پیر کو گھٹنے کے پاس سے کاٹنا پڑے اس لئے اس میں جلدی کرو''

کرامت علی یہ جانکاہ اعلان سنتے ہی یک بیک کچھ سوچ کر خاموش ہوگیا۔کئی برس کے بعد آج پھر اُسے دیوہ شریف کے اس بزرگ جیوتشی کی بات یاد آ گئی جس نے اُس کا ہاتھ دیکھ کر بتایا تھا کہ ''بیٹا زیادہ عمر ہو جانے پر تیرا ایک پاؤں کٹ جائے گا'' ساتھ ہی اُسے یہ بات بھی یاد آئی کہ اُسی نجومی نے اس کی گھر والی چندا کا ہاتھ دیکھ کر یہ بتایا تھا کہ ''اس کی بڑی لمبی عمر ہوگی۔یہ تیرے بعد بھی بہت دنوں تک زندہ رہے گی''

کرامت نے پہلے کی طرح آج بھی اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی کیونکہ اس کے پاؤں صحیح

سلامت ہوتے ہوئے بھی چندا بے چاری ماگھ میلے میں کچل کر اللہ کو پیاری ہوگئی تھی۔ اگر پیر کٹنے کی بات
میں کچھ سچائی ہوتی تو چندا کو اِس وقت بھی زندہ ہونا چاہیئے تھا۔ کرامت نے ہنس کر ڈاکٹر زیدی کو بتایا

''ڈاکٹر صاحب دو چار دن آپ سنبھال لیں میں بیس برس سے ہر سال محرم میں انگاروں پر
ماتم کرتا ہوں دو ہی دن رہ گئے ہیں اسے چھوڑ کر میں نہ جاؤں گا'' ڈاکٹر اس بات کو سُن کر ناراض ہو گئے۔
اسپتال میں مرہم پٹّی کے وقت کرامت کے سارے پڑوسی اور بہی خواہ اکٹھا تھے۔ ابراہیم بھانٹ، بدّھن
کنگریا، شبّو گھوسی، عیدو گدّی اس کا بیٹا خیراتی اور ابراہیم کی گھر والی بتّن یہ سب ڈاکٹر کی بات سن کر
کرامت کے پیر کی طرف سے بڑے متردّد تھے اور ہر ایک اُسے سمجھا رہا تھا

''میں کہتا ہوں چچا تم ڈاکٹر کا کہنا مان جاؤ'' بدّھن نے کہا ''لکھنؤ چلو وہاں بڑے اسپتال
میں ایک سے ایک اچھے ڈاکٹر ہیں ہوسکتا ہے دوا دارو ہی سے کام بن جائے''

''ہاں اور کیا'' عیدو بولا ''اور اگر اس بار تم آگ پر ماتم نہ کروگے تو کون سا گناہ ہو جائے گا۔
زندگی ہے تو اگلے سال کر لینا۔ کہ غلط کہتا ہوں شبّو''

''ٹھیک کہتے ہو عیدو'' شبو نے کہا ''ہم اب کی انھیں ماتم نہیں کرنے دیں گے''

''کیا بتاؤں بدّھن'' عیدو نے کہا ''میں نے تو جس دن سُنا اور چچا کا یہ حال دیکھا بس اندر
ہی اندر جی گھول رہا ہے اگر چچا ذرا سا اشارہ کر دیں تو سالے ہادی کی ہڈّی پسلی سرمہ کر دوں''

''پھر کیا'' شبّو بولا ''ہمارے ہوتے ہوئے کوئی سالا ان کی یہ حالت کر دے۔ اللہ پاک
جھوٹ نہ بلوائے بیچ بازار میں اگر اس حرامی کی گردن مروڑ نہ ڈالوں تو گھوسی نہیں بھوسی کی اولاد سمجھنا''

''اب ان کی سیدھائی کے آگے ہم لوگ کیا کر سکتے ہیں'' ابراہیم نے ٹھنڈی سانس لی

کرامت نے سبھوں کو سمجھایا ''دیکھو بھیّا تم لوگ میری طرف سے بدلہ نہ لینا، اگر بدلہ لینا
ہی ہوا تو میں خود ان سے نپٹ لوں گا'' اُسے زرّیں کی قسم یاد آ گئی

''اچھا چھوڑو چچا۔ یہ بتاؤ آج کیا کھاؤ گے۔ کیا چیز پکاؤں تمہارے لئے'' بتّن نے پوچھا

''ارے پوچھنا کیا ہے'' ابراہیم بولا ''جا ایک مرغی بھون لے چچا کے لئے''

''ارے مرغِ مسلّم'' عیدو چٹخارہ لے کر بولا

''نہیں نہیں ابراہیم'' کرامت نے کہا ''آج تو شاہ صاحب کے یہاں کا کھچڑا ہوگا''

''مگر تم وہاں تک جاؤ گے کیسے؟'' بدّھن نے پوچھا

''ڈنڈا ٹیک ٹیک کر چلا جاؤں گا۔ ہے ہی کتنی دور''

''ہم لوگ تمہیں نہیں جانے دیں گے'' شبّو نے کہا ''تم کھچڑا کی جگہ کھچڑی کھا لینا''

رات میں کسی وقت زرّیں اُسے دیکھنے کو گھر پر آئی اُس نے سیاہ رنگ کا محرّمی لباس پہن رکھا

تھا، کالی آرگنڈی کا جمپر اور سفید لٹّھے کا غرارہ جو ایّامِ عزا میں یہاں کی خواتین کا روایتی لباس ہے۔ کرامت
علی بلا شان و گمان اپنی چھوٹی سی کٹیا میں اُسے دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ اُسے یقین نہیں آتا تھا کہ زرّیں
اُسے دیکھنے کے لئے اس کے گھر آئے گی۔ اس وقت وہ اپنے پیر کی تکلیف سے چپ چاپ مضمحل لیٹا تھا
زرّیں کو دیکھتے ہی اس نے چارپائی سے اُٹھنے کی کوشش کی مگر زرّیں نے اُسے اُٹھنے سے روک دیا

''جب سے میں نے سنا ہے کہ ڈاکٹر ایسا کہہ رہے ہیں مجھے بڑی فکر ہے'' زرّیں بولی

''ضرور ہوگی۔ جبھی تو اس وقت اکیلی یہاں تک آئی ہو۔ کتنا خوش نصیب ہوں میں''

''آپ لکھنؤ کیوں نہیں جاتے۔ چلئے میں چلوں گی آپ کے ساتھ'' وہ بولی

''اللہ! اب تجھ کو میرے اوپر رحم آیا ہے۔ ایک غریب کی جان پر آ بنی جس کے کوئی آگے ہے نہ
پیچھے اس کے لئے کسی بے رحم کے دل میں درد جاگ اُٹھا تو بہت بڑی بات ہے۔ اب یہ محبت کس کام کی زرّو''

''ایسا مت کہیئے'' وہ روندھی ہو کر بولی ''میں نے آپ کے ساتھ کوئی بے وفائی نہیں کی۔
آپ کو چھوڑ کر میں شاکر بھائی کے ساتھ چلی گئی بس یہی میری غلطی تھی اسے بے وفائی مت کہیئے۔ شاکر
بھائی شیر علی صاحب کی طرفداری کرنے لگے تو میں یہاں چلی آئی۔ بتایئے میری کیا غلطی ہے''

''شاید اوپر والے کو یہی منظور تھا، زرّو اب تو میرے لئے اپنا دل کیوں کڑھاتی ہے'' وہ بولا

''آپ کل میرے ساتھ لکھنؤ یا کانپور چلئے۔ میں آپ کا علاج کراؤں گی'' زرّیں نے کہا

''میرا علاج! ۔ مگر تیری جدائی میں اس دل پر جو گھاؤ لگے ہیں ان کا کیا علاج ہوگا، ان میں تو
زیادہ کسک ہے جب تو نے ان پر اپنی توجہ کا مرہم نہ رکھا تو پیر کا زخم کیا ہے''

''آپ جو بھی کہیں میں تیار ہوں۔ آپ کی ہر بات مانوں گی''

''تم ایک اچھی تیماردار ہو'' کرامت نے مسکرا کر کہا ''بیمار کی دیکھ بھال ایسے ہی کرنی چاہیئے
لیکن زرّو اب اس طرح مجھے بہلانے پھسلانے سے کیا فائدہ۔ میرے پیر کا زخم شاید اب کبھی نہ ٹھیک ہو
پیر کو کاٹنا پڑے گا۔ کم از کم ڈاکٹر تو یہی کہتا ہے۔ تو کیا ایسی حالت میں بھی تم میری ہر بات مان لوگی؟''

''ہاں ہاں۔ مان لوں گی''

''تو پھر بتا دوں گا وقت آنے پر''

★★★

محرّم کی تیرہ تاریخ کو پورا چاند وجّن میر صاحب کے میدان میں بڑی مضمحل روشنی کے
ساتھ کھلے آسمان پر روشن تھا۔ میدان میں انگاروں پر ماتم کی تیاریاں ہو رہی تھیں سات من لکڑی کے

بڑے بڑے کُندے الاؤ میں اس شدّت کے ساتھ لپٹیں مارتے ہوئے سلگ رہے تھے کہ ان کی آنچ سے دوگز کی دوری پر کھڑے ہوئے لوگ بھی پریشان ہو رہے تھے مگر ان کے پیچھے کھسکنے کی کوئی جگہ اس لئے نہ تھی کہ الاؤ کے چاروں طرف بے پناہ ہجوم ٹھسا ٹھس بھرا ہوا تھا، جن کے گھر قریب تھے وہ اپنے اپنے کوٹھوں سے انگاروں پر ماتم دیکھنے پہونچ گئے تھے۔ ماتمی جلوس صدر امام باڑے کی طرف سے میدان کی طرف آ رہا تھا۔ ماتمی نوجوان جوش وخروش کے ساتھ نوحہ خوانی وسینہ زنی کرتے ہوئے دھیرے دھیرے میدان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ محرّمی باجوں کے شور وغل سے ماتم کرنے والوں میں اور بھی جوش بڑھ رہا تھا جب تک ماتمی جلوس اس جگہ پہونچتا پورے میدان میں تِل ڈالنے کی جگہ نہ رہ گئی۔ الاؤ کی سُلگتی ہوئی لکڑیوں سے چٹ چٹ کی آوازیں نکل رہی تھیں تھوڑی دیر میں یہ سُرخ سُرخ دہکتے ہوئے انگاروں میں بدل گئیں۔ بارہ گز لمبی اور دوگز چوڑی روش پر ان انگاروں کو جلدی جلدی پھیلا دیا گیا۔ کرامت علی ہر سال کی طرح آج بھی ننگے پاؤں ان دہکتے ہوئے انگاروں پر ماتم کرنے آیا تھا وہ ایک کنارے شام ہی سے آ کر چپ چاپ بیٹھ گیا تھا اس کے ہمدردوں اور پڑوسیوں نے اُسے بہت روکا منع کیا مگر وہ اپنی ضد پر قائم رہا نہا دھو کر شام ہی سے آ گیا۔ بیٹھا بیٹھا دل میں یہی دعا مانگ رہا تھا کہ اللہ اُسے اس قابل کر دے کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو کر انگاروں پر ماتم کر سکے۔ اس کے عین مقابل روش کے دوسرے سرے پر ہادی آج ایک ہی بیساکھی لئے تھے ان کے لئے ایک کرسی کا بھی انتظام کر دیا گیا تھا جس پر وہ بڑے چودھرانہ شان سے براجمان تھے ان کے ایک ہاتھ میں پیتل کے پنجے والا چھوٹا سا علم تھا جسے پروگرام کے مطابق انگاروں پر ماتم کرنے والوں کا سرغنہ ہادی کے ہاتھ سے لے کر پھر انگاروں کی طرف لوٹے گا اور اس پر ماتم کرتے کرتے اپنے پیروں سے انگاروں کو ٹھنڈا کر دے گا۔ ہادی کے داہنے بائیں شبّو گھوسی اور عیدو گدّی اس انہماک کے ساتھ کھڑے تھے جیسے اُن کی مدد پر مستعد ہوں اور ہادی کے بالکل پیچھے ایک دستی پیٹرومیکس اپنے سر پر لئے خیراتی کھڑا تھا۔ جلوس کے میدان میں آتے ہی ہادی بیساکھی کے سہارے کرسی چھوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ عیدو نے جھک کر ان کے کان میں کہا

”بس میاں۔ یہی ٹیم ہے منّت مان لیجئے اپنے پیروں کے لئے امام صاحب کی برکت سے آپ اچھے ہو جائیں گے۔ اور یہ بیساکھی مجھے دے دیجئے میں آپ کو سہارا دیئے رہوں گا“

شبّو نے بھی فوراً اس کی تائید کی ”ہاں میر صاحب۔ ہم آپ کے پاس ہی ہیں آپ بے فکر رہیئے پھر آپ مولا کا نشان ہاتھ میں لئے ہیں یہ بیساکھی چھوڑ یئے اور نہیں تو میرے کندھے کا سہارا لے لیجئے“

اتنا کہہ کر شبّو نے بیساکھی ان کے ہاتھ سے لپک لی ایک ہاتھ میں پنجہ کا علَم پکڑے عیدو اور شبّو کے سہارے وہ کسی مفتوح جنرل کی طرح کھڑے ہو گئے۔ خیراتی سر پر گیس لالٹین لئے آگے بڑھ کر جھٹ اُن کی پیٹھ سے چپک کر کھڑا ہو گیا۔ ڈھول تاشوں کی زوردار سلامی بجنے پر ہادی نے اپنا علَم بلند کیا

جو اس بات کا اشارہ تھا کہ کرامت آگ میں کود کر آگے بڑھے اور ان کے ہاتھ سے علم لے کر انگاروں پر ماتم شروع کرے چاروں طرف کی بھیڑ میں ارتعاش پیدا ہوا، پیچھے والے اچک اچک کر دیکھنے لگے اور اپنے آگے کھڑے لوگوں کو اور آگے ڈھکیلنے لگے کرامت نے ”یا علی مددؑ“ کا نعرہ بلند کیا اور آگ میں کود پڑا، باجے اور شدّت سے بجنے لگے خواتین جو بالا خانوں سے ماتم دیکھ رہی تھیں اُنھوں نے اپنا اپنا سر وسینہ اور زانو پیٹنا شروع کر دیا میدان میں نوجوان بہ جوش ”یاحسین الوداعؑ“ کا ماتم کرنے لگے۔ کرامت آگ پر یا علی یا علی کا دوہتّھڑ ماتم کرتا ہادی کی طرف بڑھا مجمع میں بدنظمی پہلے ہی شروع ہو چکی تھی دیکھتے ہی دیکھتے بھیڑ اس درجہ بے قابو ہو گئی کہ آگے کھڑے ہوئے لوگ تقریباً انگاروں کی سرحد پر پہونچ گئے پھر جیسے ہی کرامت نے ہادی کے ہاتھ سے علم لیا تو جیسے قیامت صغریٰ آ گئی۔ پہلے ہی ریلے میں شبّو اور عیدو ہادی کو بے سہارا چھوڑ کر کھسک گئے اور خیراتی کچھ تو پیچھے والوں کا دھکّا کھا کر اور کچھ عمداً ایک جھونکے کے ساتھ پیٹرومیکس سمیت ہادی کی پیٹھ پر ڈھے پڑا باجوں اور ماتم کی سامعہ شکن آواز میں ہادی کی چیخ وپکار کسی نے نہ سنی اور نہ گیس لالٹین بجھ جانے کے بعد کسی نے ان کے وجود کی دردناک تباہی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ مچھلی کی طرح دہکتے انگاروں پر تڑپنے لگے بیسیوں نوجوان تقریباً انگاروں تک پہونچ کر جوش ماتم میں بے حال ہو چکے تھے اُنھوں نے اڑتی ہوئی دھول، راکھ، دھوئیں اور نیم تاریکی میں ہادی کو نہ دیکھا شاید کسی نے ان کو ٹانگ سے گھسیٹ کر انگاروں میں پھینک دیا تھا۔ دو منٹ کی افراتفری کے بعد جب کرامت روش کے دوسرے کنارے تک جا کر پھر واپس لوٹا تو انگاروں پر مرغ بسمل کے مانند تڑپتے ہوئے ہادی پر اس کی نظر پڑی اُس نے دوڑ کر ہادی کو نیم مردہ حالت میں انگاروں سے باہر نکالا ہادی سرتاپا جھلس کر بے ہوش ہو چکے تھے اور ایک پیر میں پلاسٹک کی چپل جل گل کر ان کے تلوے سے اس طرح چپک گئی تھی کہ اسے الگ کرنے میں تلوے کی موٹی کھال بھی نکل گئی۔

ہادی کو بمشکل لاد کر گھر لایا گیا۔ ڈاکٹر زیدی لکھنؤ میں تھے ضلع اسپتال کے وارڈ ماسٹر میرن بھائی نے ساری رات جاگ کر ہادی کی تیمار داری کی گلوکوز چڑھایا۔ انجکشن لگائے پورے بدن پر مرہم پوڈر اور دوسری بہت سی دوائیں لگائیں مگر ہادی نے آنکھ نہ کھولی اور صبح ہوتے ہی جاں بحق ہو گئے۔ کرامت علی اپنی سب ہی تکلیفیں بھول کر ساری رات ہادی کے چبوترے پر رنجیدہ ومغموم بیٹھا صدقِ دل سے ان کی اچھائی کے لئے دعا مانگتا رہا مگر صبح کو ان کے انتقال کی خبر سن کر کرامت سے ضبط نہ ہوا وہ چبوترے پر بیٹھ کر زار وقطار رونے لگا۔ میرن بھائی ہر سال آگ پر ماتم کے بعد کرامت اور دوسرے ماتمیوں کے پیروں کی ڈریسنگ اور دیکھ بھال کیا کرتے تھے وہ ہادی اور کرامت تینوں جائس کے مڈل اسکول میں ہم مکتب تھے۔ کرامت کو روتا دیکھ کر میرن بھائی اس کے پاس آ کر بولے

”کرامت۔ کیسا ہے تمہارا پیر لاؤ دیکھوں تو۔ مجھے ہادی بھائی کی دیکھ بھال میں موقع ہی نہ

ملا کہ تمہارا پیر دیکھتا‘‘

کرامت آنسو پونچھ کر بولا ’’میرن بھیّا - میں بالکل اچھا ہوں مجھے کوئی تکلیف نہیں - مجھے تو بس ہادی بھیّا کو سوچ سوچ کر رونا آتا ہے کاش ان کی جگہ مجھے موت آجاتی ‘‘

میرن بھائی نے کرامت کے پیروں کو اچھی طرح سے دیکھا، پیر کے تلووں کو اپنی انگلیوں سے دبا دبا کر دیکھا جس پیر کے پنجے پر برچھی کے زخم تھے وہ بھی ٹھیک لگتے تھے سوجن بھی ختم ہو گئی تھی

’’کرامت!‘‘ میرن بھائی نے پوچھا ’’کیا تمہارے زخموں والے پیر میں بھی درد نہیں ہے؟‘‘

’’نہیں بھیّا‘‘ کرامت بولا ’’وہ درد تو آپ سے آپ چلا گیا‘‘

’’کمال ہے یار - مجھے تو یقین نہیں آتا‘‘ میرن بھائی نے کہا ’’تم سچ بول رہے ہو نا؟‘‘

اُسی دن دوپہر میں ڈاکٹر زیدی لکھنؤ سے واپس آ گئے اور ہادی کے واقعہ کو سُن کر ان کے گھر گئے وہاں کرامت علی کو چبوترے پر بیٹھا دیکھ کر پوچھا

’’تم نے آگ پر ماتم کیا تھا نا؟ - آخر نہیں مانے میری بات‘‘

کرامت نے کوئی جواب نہیں دیا تو ڈاکٹر زیدی نے خود زمین پر بیٹھ کر اس کے پیر دیکھے زخم والا پیر بھی دیکھا۔ زخم خشک ہو گیا تھا اور سوجن غائب تھی۔ وہ کرامت کو بغور دیکھنے لگے جیسے بہت ناراض ہوں۔

’’کل میں لکھنؤ چلا جاؤں گا‘‘ کرامت نے ڈرتے ڈرتے کہا

’’جاؤ جہنم میں‘‘ زیدی صاحب غصّہ میں بولے ’’اب کس لئے لکھنؤ جاؤ گے؟‘‘

’’آپ نے حکم دیا تھا نا‘‘ وہ بولا ’’پیر کٹوا دینے میں بھلائی ہے‘‘

ڈاکٹر زیدی ناراض ہو کر کھڑے ہو گئے اور کھڑے کھڑے دیر تک کرامت کو دیکھتے رہے پھر بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے ’’اب یہ صاحب ساری دنیا میں چلائیں گے کہ آگ پر ماتم کرنے سے پیر کا زخم خود بخود ٹھیک ہو گیا۔ ہونہہ‘‘

★★★

رات میں دس بجے ہادی سپرد خاک ہو گئے تو کرامت اپنی کوٹھری میں واپس آیا دیکھا کہ عیدو اور شبّو اس کے انتظار میں دروازے پر بیٹھے ہیں۔ کرامت نے ان دونوں سے کوئی بات نہیں کی اور چپ چاپ اپنی چارپائی پر جا کے لیٹ گیا۔ عیدو نے دھیرے سے کہا ’’چچا ہم دونوں بہت دیر سے تمہاری راہ دیکھ رہے تھے‘‘

’’کیا کام ہے؟‘‘ کرامت نے پوچھا

’’تمہارا حال چال معلوم کرنا ہے‘‘ شبّو نے کہا ’’تمہارے پیر کی تکلیف اب کیسی ہے؟‘‘

’’ٹھیک ہے‘‘ اس نے بہت مختصر اور روکھا جواب دیا

’’لنگڑے کو دفن کر آئے؟‘‘ عیدو نے پوچھا

کرامت نے کوئی جواب دینے کے بجائے اُسے خشمگیں نظروں سے دیکھا

’’چچا تو کچھ بولتے ہی نہیں‘‘ شبّو نے کہا ’’چلو عیدو چلیں ہم لوگ اپنے کام پر‘‘

’’بہت افسوس ہے چچا کو‘‘ عیدو نے طنز کیا ’’میں تو کہوں سالا مر گیا - تو بہت اچھا ہوا مر گیا - سالا حرامی‘‘

’’کہاں جا رہے ہو تم لوگ اتنی رات میں؟‘‘ کرامت نے پوچھا

’’قبر کھودنا ہے‘‘ شبّو نے دھیرے سے کہا

کس کی قبر کھودنا ہے - کون مر گیا؟‘‘ کرامت نے پوچھا

’’ارے ہادی لنگڑا‘‘ عیدو بولا ’’ہم لوگ آج رات اس کی قبر کھود کر پہلے لاش نکالیں گے پھر اس کی ننگی لاش کو تالاب کے کنارے والے کیتھے کے پیڑ میں الٹی لٹکا دیں گے اس پیڑ پر بھوت ہی بھوت رہتے ہیں لنگڑا ابھی انھیں کے ساتھ ہو جائے گا‘‘

کرامت اُٹھ کر بیٹھ گیا

’’دیکھو میں نے تم لوگوں کو منع کیا تھا کہ میری طرف سے ہرگز کسی سے بدلہ نہ لینا مگر تم دونوں نہیں مانے، میں نے انگاروں پر ماتم کے وقت تم دونوں کو ہادی بھیّا کے پاس کھڑا دیکھ لیا تھا اب کچھ کہنے سے کیا فائدہ لیکن یہ تم نے اچھا کام نہیں کیا - اور اب ان کی قبر کھودنے کی بات کر رہے ہو، خدا کی قسم یہ بڑے گناہ کی بات ہے اس عذاب میں اپنے کو نہ ڈالو۔ وہ سیّد تھے آل رسول تھے۔ اللہ سے ڈرو تم لوگ‘‘

’’اچھا اچھا - تم کرو اُن کی پوجا‘‘ عیدو تنک بولا ’’ہم اُن کی لاش گیدڑوں سے نچوائیں گے، بس جان لو‘‘

’’میں پوچھتا ہوں تمہاری ان سے کیا عداوت ہے‘‘ کرامت نے کہا ’’کون سی دشمنی ہے؟‘‘

’’دشمنی کی بات پوچھتے ہو چچا‘‘ عیدو نے کہا ’’تو سنو - میں تو اس ٹیم پانچ برس کا تھا مگر تمہارے سامنے کی بات ہے کہ اس جہنّمی ہادی نے میرے بپّا کی داڑھی جڑ سے اکھاڑی تھی کا ہے سے کہ ہمارے بپّا نے ان کے ابّا جان الطاف میاں کو ووٹ نہیں دیا تھا۔ تم ہی بولو چچا میں اس بات کو بھول سکتا ہوں‘‘

’’اور دس روپلّی لگان نہ دینے پر الطاف میاں نمبردار نے ہمرے بپّا کے پیٹ میں ریواں بندھائے دیا تھا‘‘ شبّو نے بتایا

’’ہم تو اس کی بوٹی بوٹی چیل کوؤں کو کھلا کے رہیں گے‘‘ عیدو دانت پیس کر بولا

’’مگر اس کا بدلہ تو تم لے چکے ہو‘‘ کرامت نے کہا ’’اور اب تو وہ اس دنیا میں بھی نہیں رہے تو

ایک مرے ہوئے انسان سے بدلہ لینا کیسا۔تم لوگ سمجھداری سے کام لو پیش خدا گنہگار نہ بنو"
"تم اپنی بات سوچو چچا" عیدو بولا "اگر اپنے پکڑے جانے کا یا اللہ کے آگے گنہگار ہونے کا
ڈر ہے تو رات والی گاڑی سے بھاگ لو ہم تو آج اس کا مُردہ قبر سے نکال کر رہیں گے" "نہیں تو ماں کی گالی
پڑ جائے گی ہم پر" اور دو گھنٹے بعد اس کا کفن نوچ کر یہاں لائیں گے اور تمہارے سامنے اس میں آگ
لگائیں گے" "پھر تم کرنا زوردار ماتم"
کرامت نے کوئی جواب نہیں دیا وہ دونوں اُٹھ کر چلے گئے۔ اور کرامت دیکھتا رہ گیا
چپ چاپ۔

★★★

عیدو اور شبّو قبرستان پہونچ گئے جس وقت یہ دونوں وہاں پہونچے تھے اس وقت رات
کے گیارہ بج چکے تھے آسمان پر پورا چاند چمک رہا تھا اور نیچے لکرہیّا تالاب کے ساکت پانی میں اس کا
عکس پڑ رہا تھا۔ ہادی کی قبر پر جلایا گیا چراغ بجھا تھا مگر آم اور مہوے کے گھنے درختوں سے چھن چھن کر
چاندنی قبروں پر آرہی تھی۔ ہادی کی تازہ قبر دوسری قبروں سے اونچی تھی۔ پھاوڑا کدال لئے یہ دونوں
ایک پختہ قبر پر بیٹھ کر بیڑی پینے لگے۔ شبّو نے پوچھا
"عیدو۔تم نے کبھی بھوت دیکھا ہے پیارے؟"
"نہیں بے" عیدو بولا "اب اس ٹیم بھوت پریت کی بات نہ کرو شبّو"
"کاہے؟" شبّو نے ہنس کر پوچھا "ڈر لگتا ہے کیا؟"
"ڈر ور نہیں لگتا مجھے" عیدو نے کہا "میں اس ٹیم یہ سوچ رہا ہوں کہ اگر چچّا کی بات مان لی
جائے تو کیا حرج ہے قبر کو الٹ ڈالنے میں گناہ تو ضرور ہی پڑے گا۔ ہے کہ نہیں؟"
"سالے دن بھر گناہ کی باتیں کرتے رہتے ہو اور اس وقت گناہ سے ڈر رہے ہو۔ بیٹا بہت
ثواب ہوگا اس میں"
مہوے کر ایک درخت پر کوئی پرندہ اپنے پروں کو پھڑ پھڑا کر اُڑا اور تالاب کی طرف "چائیں
چائیں" کرتا چلا گیا۔
"ابے یہ نیل کنٹھ تھا جو اُڑ کر گیا ہے" عیدو بولا "جانتے ہو شبّو اس کا مطلب کیا ہے"
"نہیں" شبّو نے کہا "تم جانتے ہو مطلب؟"
"ہاں۔ مطلب یہ ہے کہ خطرہ ہے بھیّا"

پھر چھن چھن کر نیچے آتی ہوئی چاندنی کی مدّھم روشنی میں اُنھوں نے سچ مچ خطرہ دیکھا۔
ہادی کی قبر کے پائینتی مُردہ ننگا دھڑنگا بیٹھا ہوا تھا اور اس کے سامنے قبر کے اوپر سفید کفن گٹھری کی طرح
رکھا تھا "دیکھا شبّو تم نے؟" عیدو دھیرے سے بولا
"ابے عیدوا۔ ابے ہم بہت مُردے دیکھ چکے ہیں۔ چل اب آگے چل" شبّو کھڑا ہوگیا
"ارے یہ تو سچ مچ بھوت بن گیا" عیدو نے کہا "دیکھ شبّو بھوتوں سے جھگڑنا ٹھیک نہیں ہے،
میری مان لو چلو لوٹ چلیں"
"چل چل۔ آگے چل۔ ابے ڈرنے کی کوئی بات نہیں میں ساتھ میں ہوں"
"کیوں نہ ہم لوگ اس کو یہیں سے للکاریں بھوت ہوگا تو قبر میں گھس جائے گا" عیدو نے کہا
"ابے قبر میں گھس گیا تو ہم اس کی لاش کو پیڑ میں اُلٹا کیسے لٹکائیں گے" شبّو بولا "اور بیٹا ابھی
سے تمہاری پل پلی کانپنے لگی سالے پھر یہاں آئے کیوں تھے۔ خود بھی ٹکے مارتے ہو اور مجھے بھی
ڈرا رہے ہو"
"تم تو جھگڑا کر رہے ہو میں جاتا ہوں" عیدو بولا
"اگر پلٹ کر بھاگے تو سمجھ لو بھوت تمہیں چھپٹ لے گا۔ اور نہیں تو میں خود تم کو بھوت سے
نچوا ڈالوں گا"
"اچھا تو تم آگے چلو" عیدو نے کہا "تمہیں بہادر بن جاؤ"
"چلو۔ میں کیا ڈرتا ہوں" شبّو اپنے ہاتھ میں کدال کو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے بولا
دو قدم آگے بڑھتے ہی اُنھوں نے دیکھا کہ مردے میں کچھ حرکت ہوئی پھر وہ اُچھل کر جھم
سے قبر کے اوپر بیٹھ گیا اور "ہاؤ" کر کے زور سے چلاّیا
"اب کیا کیا جائے شبّو؟" وہ کانپنے لگا "دیکھو بھوت ہماری طرف دیکھ رہا ہے وہ حملہ کرنے ہی والا ہے"
شبّو رک کر کچھ سوچنے لگا "اچھا میں اُس کو یہیں سے آواز دے کر پوچھتا ہوں۔ عیدو تو
میرے پیچھے آ جا"
"کیا پوچھو گے؟۔ نہیں نہیں اس کو چھیڑنا ٹھیک نہیں شبّو۔ میں تیرے ہاتھ جوڑتا ہوں بھیّا"
مردہ جو ابھی تک قبر پر بیٹھا تھا یک بیک پاؤں پھیلا کر لیٹ گیا
"ہادی میاں!" شبّو نے بڑے نرم لہجہ میں آواز دی "اے ہادی میاں"
مردہ منمنا کر ناک سے بولا "آؤ آؤ حرام الدہرو۔ حرام زادو۔ کمینوں۔ سالو۔ مجھے آگ میں
ڈھکیل کر اور میری جان لے کر تم دونوں کو چین نہیں آیا حرامیو اب آئے ہو میرا کفن کھسوٹنے۔ پاپیو اگر
ہمّت ہے تو آؤ اور لے جاؤ یہ کفن میں نے پہلے ہی اتار کر رکھ دیا ہے"

”لیکن میاں“ عیدو ڈرتے ڈرتے بولا ”آپ تو لنگڑے تھے چل پھر نہیں سکتے تھے تو پھر قبر سے باہر نکل کر کیوں بیٹھے ہیں؟“

”اس لئے کہ تمہیں قبر کھودنا نہ پڑے“ مردہ بولا

”مگر آپ نے یہ کیسے سمجھا کہ ہم آپ کی قبر کھودنے کے لئے آئے ہیں“ شبّو نے پوچھا

”پھر اتنی رات میں یہاں کیا کرنے آئے ہو حرامزادو۔ اٹھا گیروں۔ لڈّو کھانے آئے ہو؟“

”ہم لوگ تو مہوہ بننے آئے ہیں میر صاحب“ عیدو نے بڑی نرمی سے کہا

”چپ۔ مہوہ بننے آئے ہیں“ مردے نے ڈانٹا ”مکّارو کیا ہمیں معلوم نہیں کہ تم لوگ گورکنی بھی کرتے ہو، یہ پھاوڑا کدال لے کر آئے ہو تو کیا اپنی قبر کھودو گے“

”ہاں ہاں۔ ہمیں یہاں ایک نئی قبر کھودنی ہے میر صاحب“

”کون مرا؟“

”کرامت علی“ عیدو نے بتایا ”میاں وہ بھی آگ سے جل کر مرا ہے“

”مر گیا۔ بہت اچھا ہوا مر گیا“ مردے نے کہا ”مگر اس کی قبر یہاں کیوں بنے گی۔ یہ تو ہمارے مورثوں کا قبرستان ہے“

”اس نے وصیّت کی تھی کہ ہمیں میر صاحب کے قبرستان میں دفن کرنا“ شبّو بولا

یہ سُن کر مُردے نے قبر پر رکھا ہوا اپنا کفن سمیٹا اور پیڑوں کے پیچھے جاتا ہوا بولا

”اب تم لوگ قبر کھود سکتے ہو۔ میں کرامت کے پاس جا رہا ہوں کیونکہ مجھے اس کی میّت میں حلول کرنا ہے۔ وقت بہت کم ہے اگر بارہ بجنے سے پہلے پہلے میں اُس کے بدن میں نہ گھس پایا تو پھر اگلی دیوالی تک یوں ہی بھٹکتا رہوں گا اور ہو سکتا ہے کہ تمہاری کھوپڑی پر مسلّط ہو جاؤں“

مردہ پیڑوں کے اندھیرے میں غائب ہو گیا تو عیدو بولا

”ابے شبّو۔ ابے تم نے اُسے جانے کیوں دیا؟“

”اور کیا کرتا“ شبّو نے کہا ”ابے تو تو بالکل اوندھی کھوپڑی کا ہے، سالے پتہ ہے یہ چچا تھا جو بھیس بدل کر ہمیں ڈرانے آیا تھا، ہادی ہوتا تو پیروں سے چل پاتا؟“

”ایسی بات؟“ عیدو نے بڑی حیرت سے پوچھا

”اب سمجھ میں آئی ہے“ شبّو نے کہا ”چل اب گیا وہ۔ ہم لوگ اپنا کام کریں“

”اب کون سا کام ہے؟“

”اتنی جلدی بھول گئے بیٹا“ شبّو نے کہا ”ابھی ہادی کی قبر کھودنا ہے۔ چل پھاوڑا اُٹھا“

عید نے با دلِ ناخواستہ پھاوڑا اُٹھایا اور مری مری آواز میں بولا

”شبّو۔ ابے لگتا ہے اگلے سال بقرعید میں مجھے مخدوم صاحب بابا کی درگاہ میں ڈنالیوں کے آگے جھوم جھوم کر اپنے سر سے بھوت اُتروانا پڑے گا۔ چل بھائی تیرا ہی کہا سہی“

دونوں ہادی کی قبر کھودنے پہونچ گئے

★★★

وہ چلتا پھرتا مُردہ ہادی کے قبرستان سے کرامت علی کی تلاش میں نکلا اور اس کی کوٹھری کے دروازے پر پہونچ کر رک گیا چاروں طرف سنّاٹا تھا مگر کوٹھری کے اندر ایک چھوٹی سی دستی لالٹین جل رہی تھی جس کی ہلکی ہلکی روشنی دروازے کے درازوں سے چھن چھن کر باہر آ رہی تھی، چھپّر کے نیچے ایک کتّا سو رہا تھا جو آہٹ پا کر اُٹھا اور اِدھر اُدھر دیکھ کر دم ہلاتا باہر سڑک پر بدّھن کے خالی کھڑے تانگے کے نیچے لیٹ گیا۔ ”مُردے نے کوٹھری کے دروازے پر ہاتھ رکھ کر ہلکا سا دھکّا دیا تو پتہ چلا کہ دروازہ میں اندر سے کُنڈی لگی ہے مگر اس ہلکے سے دھکّے نے دروازے میں جو ”کھڑ کھڑ“ کی آواز پیدا کی اس کی وجہ سے کوٹھری کے اندر چارپائی پر سے کسی کے اُٹھنے کے ساتھ کسی مرد کی آواز آئی

”باہر کوئی آیا ہے“

”ٹھہر جا میں دیکھتی ہوں“ کسی عورت کی آواز آئی

دروازہ کھلا تو باہر والے مُردے نے اپنے سامنے ایک ایسی عورت کی بدروح کو کھڑی دیکھا جو اس کے علم میں کئی مہینے پہلے اس دنیا سے کوچ کر چکی تھی وہ لالٹین کو ہاتھ میں اونچا کر کے باہر والے کا چہرہ دیکھنے لگی۔ وہ جو ابھی کچھ دیر پہلے تک ایک مردے کی بھٹکتی ہوئی روح کی ایکٹنگ کر رہا تھا اب اپنے سامنے سچ مچ ایک بھوتنی کو دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔ بے ہوش ہونے سے پہلے کانوں میں آواز آئی

”آ گئے تم؟۔ آ وَ آ وَ۔ اندر آ جاؤ“ وہ بولی

وہ حواس باختہ ساکت کھڑا رہا۔ لالٹین کی ہلکی روشنی میں اس ”بھوتنی“ کا چہرہ دیکھنے اور پھر اس کی آواز سننے کے بعد اُسے ایسا لگا جیسے پیروں میں بھاگنے کی سکت نہیں رہ گئی اور زمین بھی پیروں تلے سے کھسک رہی ہے، اس کی آنکھوں پر بے ہوشی طاری ہونے لگی۔

”ارے۔ تم بولتے کیوں نہیں کیا ہو گیا تمہیں؟“ وہ پھر بولی ”ارے میں ہوں۔ میں۔ چندا۔ تمہاری گھر والی“

”چندا!“ بمشکل اس کے لب ہلے مگر کوئی آواز نہ نکلی۔ اُسے اپنی بیداری پر شک ہونے لگا

”کون! چندا؟“

''ارے میں-تمہاری چندا- مجھے دیکھوتو''

''چندا! تو تو میلے میں کچل کر مرگئی تھی نا'' وہ بولا ''تو وہی چندا ہے؟'' پھر جب چندا نے لالٹین کو دیوار میں لگی ہوئی کیل میں لٹکانے کے لئے ہاتھ اوپر اُٹھایا تو اس کے ہاتھ کی کلائی کے اوپری حصّے میں عورت کا نام اور سورج کے نشان کا جانا پہچانا گودنا دکھائی دیا۔ چندا اُس کے کندھے کو چھو کر بولی

''مجھ پر تیرے بچھڑنے کے بعد مصیبتوں کے جو پہاڑ ٹوٹے وہ بھی تو پوچھوگے- میں پوری کہانی سناؤں گی'' پھر اس نے چار پائی پر بیٹھے ہوئے ایک مرد کی طرف اشارہ کیا

''اسے پہچانو- یہ میرا چھوٹا بھائی مُکٹ ہے، تم اسے جانتے ہوگے۔ اس نے میری جان بچائی ہے۔ یہ میلے میں مجھے نہ ملتا تو میں مرکھپ چکی ہوتی''

وہ آدمی چار پائی سے اُٹھ کر کرامت کے پاس آیا تو اُسے دیکھتے ہی پہچان گیا۔ یہ وہی مکٹ جیب کترا تھا جو اُسے بھدری کے میلے میں ملا تھا اور جو الٰہ آباد کے ماگھ میلے میں بھگدڑ سے زخمی ہونے والی چندا کو اس کے پاس چھوڑ کر بیٹی روشن کو ڈھونڈھنے چلا گیا تھا پھر لوٹ کر اس جگہ واپس آیا تو چندا اور مکٹ دونوں اُسے نہیں ملے۔ کرامت نے اس سے پوچھا

''مکٹ کیا چندا تیری بہن ہے؟''

گنہگار شرمسار مکٹ نے کچھ بولے بغیر اثبات میں سر ہلایا

''مجھے پوری بات بتا- یہ کیسے ہوا''

مکٹ نے بتایا- چار مہینے ہوئے جس اکیلی اور بے سہارا عورت کو اس نے الٰہ آباد اسٹیشن پر دھوکہ دے کر لوٹ لیا تھا اُسی کو میلے کی بھگدڑ میں بری طرح زخمی پا کر اور یہ جاننے کے بعد کہ وہ کرامت کی گھر والی ہے اُس کے دل و دماغ میں شیطان نے یہ بات ڈالی کہ بھید کھلنے سے پہلے وہ خود اپنے ہاتھوں سے اس نیم جاں عورت کا گلا گھونٹ کر خاتمہ کردے یہ سوچ کر وہ چندا کو حادثہ والی جگہ سے ہٹا لے گیا پھر اچانک اس عورت کے بائیں ہاتھ کی کلائی کے اوپری حصّہ پر اس کا نام ''بلبیسا'' اور ''سورج'' کے نشان کا گودنا دیکھ کر وہ چھنکا۔ سورج کے نشان کا گودنا اُس کے کُٹم کی عورتیں اپنے بائیں ہاتھ پر اپنے نام کے ساتھ گوداتی ہیں۔ ''بلبیسا'' نام پڑھ کر اُسے یاد آیا کہ جب وہ چار پانچ سال کا تھا تو اس کی ایک جوان بہن جس کا نام بلبیسا تھا وہ الٰہ آباد ہی کے ماگھ میلے میں لاپتہ ہوگئی تھی۔ وہ زخمی چندا کو کریلی کے اُجاڑ اور جھاڑ جھنکار سے گھرے ہوئے سیکڑوں جُھگّی جھونپڑیوں کے بیچ اپنی جھونپڑی میں اُٹھا لے گیا اور بڑی محنت اور لگن سے اس کا علاج کراتا رہا۔ چندا اچھی ہوگئی۔

مکٹ سے چندا کی سرگذشت سننے کے بعد کرامت بولا

''مُکٹ اگر تو نے میری چندا کی جان نہ بچائی ہوتی تو میں سچ مچ تجھے زندہ نہ چھوڑتا''

''میں بھیّا تم سے چھما مانگنے کے لئے آیا ہوں اگر مجھے چھما کردو تو میں اسی رات کی گاڑی سے واپس لوٹ جاؤں''

''میں نے معاف کیا- اللہ بھی تمہیں معاف کردے- جا اب تو اسی وقت یہاں سے چلا جا''

مکٹ رات ہی کو اپنے گھر لٹ گیا- کرامت چار پائی پر لیٹا تھا اور چندا اس کے پیر دباتی رہی۔ اس بیچ کرامت نے اسے بتایا کہ شبّو اور عیدو لکرہیّا کے قبرستان میں ہادی میر صاحب کی قبر کھود کر لاش نکالنے گئے ہیں

☆☆☆

ڈیڑھ گھنٹے کی محنت مشقّت کے بعد شبّو اور عیدو ہادی کی قبر کھود ڈالنے میں کامیاب ہوگئے جب وہ لکڑی کے پڑوں تک پہونچ گئے تو عیدو تھکاوٹ بھرے لہجے میں بولا

''میں بہت تھک گیا ہوں شبّو -تھوڑی دیر آرام کرلینے دے''

''اچھا ٹھیک ہے۔ تھوڑا استا لے'' شبّو نے کہا ''اب صرف لکڑی کے ہنگے ہٹانے ہیں''

''مگر یار لاش کو پیڑ میں کیسے لٹکائیں گے؟'' عیدو نے پوچھا

''یہ تو بہت آسان ہے'' شبّو بولا ''ادھر دیکھ- یہ رسّا ہے- اسے آم کی نچلی ڈال سے نیچے لٹکا دیں گے رسّے کا ایک سرا تم پکڑے رہنا دوسرا میں لاش کے دونوں پیروں میں کس کر باندھ دوں گا تم گھسیٹ لینا۔ بس''

''سالے تم بڑے حرامی ہو'' عیدو بولا

ابھی یہ دونوں ٹھیک سے ستانے نہ پائے تھے کہ ایک پچھل پائی چڑیل اندھیری رات کے سنّاٹے میں اُن کے سروں پر آدھمکی اور ناک سے منمناتے ہوئے بولی

''تم دونوں میں بڑا حرامی ہے کون ہے؟- بتاؤ''

''یہ ہے یہ- شبّو'' عیدو ڈر سے کانپتا ہوا شبّو کی طرف اشارہ کیا

''نہیں'' چڑیل پھر ناک میں بولی ''میں نے شبّو کی بھینس کا دودھ بہت دنوں پیا ہے میں اس کو نہیں چبا سکتی۔ عیدو کے بچّے- میں پہلے تجھے کھاؤں گی- چل آگے آ- مجھے بھوک لگی ہے''

شبّو اور عیدو دونوں اس بھوتنی کو نہ صرف شکل وصورت بلکہ اس کی آواز سے بھی پہچان گئے کہ یہ چندا کی بدروح ہے۔ چندا جو چار مہینے پہلے الٰہ آباد کے ماگھ میلے میں کچل کر مرگئی تھی اور اب بھوت بن کر یہاں پہونچ گئی ہے۔ دونوں کو اس بات کا یقین ہوگیا۔

''بھاگ شبّو-جلدی کر سالے نہیں تو''-عیدو ڈر کے مارے کانپنے لگا

''بھاگنا مت عیدو''شبّو نے سمجھایا پھر چلاّ کر بھوتنی سے بولا

''اے چندا چڑیل-دیکھ ہم تجھے پہچان گئے ہیں تو چپ چاپ یہاں سے پھوٹ لے''

''پھوٹ لوں یا تجھی کو پھاڑ ڈالوں''وہ بولی''تو نہیں جانتا میں کتنی ظالم چڑیل ہوگئی ہوں''

''میں جانتا ہوں-''شبّو بولا''مگر کچھ بتانے سے پہلے تو اس کھودی ہوئی قبر میں کود جا تب ہی میں جانوں گا کہ تو واقعی خطرناک چڑیل ہے-چل کود-حرامن''

''رک جا آتی ہوں تجھے نگلنے-ہلنا مت اپنی جگہ سے''

پھر ایک لمبی چھلانگ لگا کر وہ بھوتنی ان دونوں کے سروں پر ایک بھیانک آواز کے ساتھ آ پہونچی شبّو مقابلہ کے لئے پہلے سے تیار ہو چکا تھا اس کی کدال ایک چیخ کے ساتھ ہوا میں لہرائی اور پھر چڑیل کے سر پر گری- بھوتنی خون میں نہا گئی اور ایک کربناک چیخ کے ساتھ گری اور دیکھتے ہی دیکھتے تڑپ کر ٹھنڈی ہوگئی

''ارے یہ کیا ہوگیا شبّو ؟''عیدو بولا یہ چندا تھی کہ اس کا بھوت-اب کیا ہوگا''

''عیدو اب تو اپنی زبان بند رکھے گا-تو چندا کے بارے میں کچھ نہیں جانتا-سن لیا؟''

چندا کھلی آنکھوں کے ساتھ خون میں نہائی پڑی تھی ان دونوں نے جلدی جلدی اُسے اُٹھا کر ہادی کی ادھ کھلی قبر میں لکڑی کے پٹروں پر ڈھکیل دیا آس پاس کا خون سمیٹ کر صاف کیا اور قبر کو مٹی سے پاٹ کر پہلی جیسی بنا دیا بالکل نئی قبر کی طرح گھر لوٹے تو رات ختم ہو رہی تھی-مرغوں کے بانگ دینے کی آوازیں چاروں طرف سے آرہی تھیں اور کرامت علی اپنی کوٹھری کے دروازے پر چپ چاپ بیٹھا تھا- ان دونوں کو کدال پھاوڑا لئے آتا دیکھ کر کرامت علی کھڑا ہوگیا۔شبّو ذرا دیر رک کر بولا''چچا-نہیں کھودی قبر، ہم نے تمہارا خیال کر کے جانے دیا۔اب تو خوش ہونا ہم سے؟''

کرامت علی بڑی خوشی میں دانت نکال کر بولا''بہت اچھا کیا تم نے''پھر ذرا دیر رک کر بولا

''سنا شبّو-میری چندا آ گئی-وہ زندہ ہے''

عیدو اور شبّو نے جیسے اس بات کو سنا ہی نہیں۔چپ چاپ اپنے اپنے گھروں کی طرف جانے لگے تو کرامت علی سے ضبط نہ ہو سکا اونچی آواز میں بولا

''ارے عیدو اور شبّو-سنتے ہو۔میری چندا واپس آ گئی''

''کون چندا؟''شبّو نے پوچھا

''ارے تم لوگ میری چندا کو نہیں جانتے؟''کرامت نے پوچھا''کیا وہ تم لوگوں کو نہیں ملی؟''

''چندا؟چچّا تم نیند میں ہو کیا؟ارے تمہاری چندا اب اس دنیا میں کہاں ہے۔وہ تو اوپر گئی''

''پتہ نہیں تم کیا بکتے ہو''عیدو نے کہا''کون سی چندا-ہمیں تو کوئی چندا نہیں ملی بھائی''

صبح ہوئی تو کرامت باؤلوں کی طرح پورے قصبہ میں چندا کو تلاش کرتا رہا لیکن وہ کہیں نہ ملی۔پتہ نہیں اُسے زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا دو تین دن وہ دردر کی ٹھوکریں کھاتا اور چندا کو ڈھونڈھتا رہا لیکن چندا نہ ملی۔تھک ہار کر وہ اپنی کوٹھری میں لیٹ گیا

رات میں زرّیں اس کی کوٹھری میں ملنے اور دریافت حال کے لئے آئی۔اُس نے بتایا کہ وہ کل مدنی پور اپنے بیٹے کے پاس جارہی ہے۔اب اس کی زندگی میں رہ کیا گیا ہے۔کیوں زندہ رہے وہ۔

''زرّو-تم سچ مچ چلی جاؤ گی؟''

''ہاں۔اب مجھے یہاں سے چلا جانا چاہئے''زرّیں نے کہا''جو میرا دکھ ہے اس میں کسی دوسرے کو کیوں شریک کروں۔چار مہینے کے لئے آپ میری زندگی میں خوشیاں بکھیرنے اور مسرتوں کے چراغ روشن کرنے آئے تھے۔شکر ہے کہ میرے پیروں میں لغزش نہیں ہوئی-میں پاک و پاکیزہ اپنے گاؤں کو واپس جارہی ہوں-میری زندگی کے دن کٹ ہی جائیں گے''

کرامت پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا''مجھے معاف کردے زرّو۔میں تیرا قصوروار ہوں، میں نے تیرے دل میں پیار کی سوتی ہوئی چنگاری کو ہوا دی اور سلگتی ہوئی بے قراری میں تجھے ڈال دیا میں تیرا گنہگار ہوں۔مجھے معاف کردے۔زرّو مجھے معاف کردے''

زرّیں چلی گئی-جس طرح بہار کی ہوا کا تیز جھونکا باغ کے پھولوں کو چھوتا ہوا نکل جاتا ہے اسی طرح زرّیں بھی کرامت کی اجڑی ہوئی زندگی کو ایک تڑپن اور بے تابی دے کر چپ چاپ چلی گئی۔ اور کرامت اسی سوزش میں جلتا سلگتا رہا۔

☆☆☆

آخر ایک روز کرامت علی مر گیا-اپنی کوٹھری میں نہیں، میر فدا حسین کی کوٹھی میں بھی نہیں- یہ بھی کوئی نہیں جانتا کہ وہ مرا کیسے-مہینوں تک وہ ایک نیم وحشی مجذوب کی طرح جائس کی بے چراغ گلیوں میں بھٹکتا رہا پھر ایک روز بھدری کے میلہ والے میدان میں لوگوں کو بارش میں بھیگی اور گدڑیوں میں لپٹی ہوئی اس کی لاش ملی جسے لاوارث جان کر اسی میدان کے ایک گوشے میں دفنا دیا گیا۔سال بھر بعد لوگوں نے اس کو ایک عارف باللہ اور خدا رسیدہ بزرگ کی قبر کا درجہ دے کر قبر کو پختہ کر کے ایک مزار بنا دیا۔شاہ کرامت علی بابا کا مزار۔کچھ عرصہ بعد مزار پر سالانہ عرس بھی ہونے لگا-کارتکی پورن ماشی کے موقع پر جب یہاں ایک ہفتہ کا بڑا میلہ لگتا تھا-

نومبر ۱۹۸۵ء کی تیرہ تاریخ کو جب بھدری کا میلہ اپنے شباب پر تھا اس رات میں بریلی سے الٰہ آباد جانے والی پسینجر ٹرین اپنے مقررہ وقت سے دو گھنٹہ لیٹ تقریباً ایک بجے رات میں میلہ کے بیچوں بیچ پہونچ کر آپ سے آپ رک گئی۔

ٹرین کے ایک ڈبّہ سے تین مسافر اُترے ایک مرد، ایک جوان عورت اور برقع پوش خاتون۔

یہ تینوں آہستہ آہستہ اس مزار کی جانب بڑھے جہاں بجلی کی روشنی سجاوٹ اور دھوم دھڑ کے کے ساتھ عقیدت مندوں کی بڑی بھیڑ جمع تھی دلّی سے آئے ہوئے قوّال جھوم جھوم کر قوالیاں گا رہے تھے۔ وہ تینوں نووارد مسافر محفل سماع کے ایک گوشے میں جا کر چپ چاپ بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ برقع پوش خاتون اپنی جگہ سے اُٹھیں اور شاہ کرامت علی بابا کے پھولوں اور ریشمی چادروں سے ڈھکی عطر و عنبر کی خوشبو سے معمور و معطّر مزار کے پاس پہونچ کر اس سے بے تحاشہ لپٹ گئیں۔ قوّال گاتے رہے

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا - اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

محفلِ سماع چلتی رہی۔ لوگ جھومتے رہے۔ عارفوں کو فیضان غیب بھی ہوتا رہا۔ مگر وجد و حال کی حالت میں معرفتِ خدا اور منزلِ عرفان تک پہونچنے والا ایک بھی صاحبِ طریقت اس محفل میں نہیں نکلا مگر وہ۔ جو وصالِ حقیقی کے لئے اپنے آپ کو فنا کر چکی تھی۔ شاہ کرامت علی کے مزار سے لپٹی تو پھر نہ اُٹھ سکی۔

(ختم شد)

۹/مئی ۲۰۰۵ء

علی گڈھ